قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2017 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

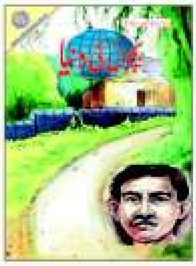

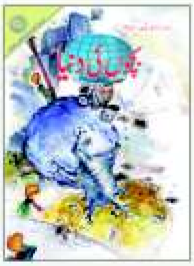

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

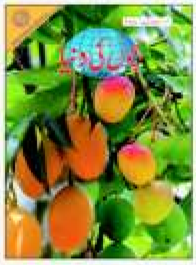

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
URDU DUNIYA

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:09، ستمبر 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 چتر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

انگریزی اور اردو کے معتبر قلمکار محمد عرفان نگینوی مرحوم کا آخری انٹرویو شیخ نگینوی 8

زبان و تعلیم

اصطلاحات فہمی عابد معز 10

یادِ رفتگاں

پروین کمار اشک اور غزل کی شعریات قدوس جاوید 14

غزل زمیں کا آسماں: پروین کمار اشک پریمی رومانی 17

جادوئی حقیقتوں کا قصہ گو: نیر مسعود قمر صدیقی 19

یادیں: خواجہ احمد عباس شیخ رحمن اکولوی 21

نقد و نگاہ

اردو شاعری میں سائنس کی جلوہ نمائیاں متین اچل پوری 23

تدوین کے اصول و مباحث ظہیر حسن ظہیر 27

اسالیب رجب علی بیگ سرور سعود عالم 30

اخترالایمان کے یہاں ماضی کی بازیافت اور مراجعت انجم پروین 34

لسانی رشتے

تمل زبان میں اردو تخلیقات کے تراجم امان اللہ ایم بی 37

ہم نے جنھیں بھلا دیا

عطیہ حسین مظفر حسین سید 42

یادیں باتیں

معین احسن جذبی: یادوں کے دریچے سے جمال اختر 45

چراغِ دل

کلام نانک میں وحدانیت محمد جمیل 49

نیا آسماں نئے ستارے

تذکرہ گلزار ابرار روبینہ اختر 51

خواجہ حسن ثانی نظامی کی اردو خدمات عبدالرحمن جمال الدین 54

دوسری زبانوں سے

پاگل خانہ (پشتو کہانی) مترجم: محمد حیات الدین 56

صحت

ٹماٹر: ایک دوائی غذا شمیم احمد صدیقی 59

سمت نما

'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ ارشاد قمر 61

کمپیوٹر

پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟ 65

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 68

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 83

ہماری بات

کسی بھی ملک کی تعمیر اور ترقی میں زبان و ادب کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ ادب ہی کے ذریعے سماج کو ایک صحیح سمت ملتی ہے اور ادب ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے سماج کو وحشی بننے سے روکا جاسکتا ہے۔ ماضی میں ادب نے نہ صرف ملک کی تعمیر کے نئے نقشے ذہنوں کو عطا کیے بلکہ ادب نے ہی ملک اور سماج کو مختلف سطحوں پر مہمیز کیا اور ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ مرکوز کی جو انسانی ارتقا اور ملک کی ترقی کے لیے ضروری تھے۔ فرد یا قوم کی سیاسی سماجی زندگی میں جتنی بھی ترقی پسندانہ تبدیلیاں آئی ہیں ان میں ادب کے اہم کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم ہو، سیاست ہو، معاشرت ہو، ہر ایک محاذ پر ادیبوں اور دانشوروں نے جو سوچ عطا کی ہے اس سے ملک کو ترقی ملی ہے۔ ادب نے لوگوں کو نہ صرف جوڑنے کا کام کیا بلکہ اپنی مٹی سے محبت کے جذبے کو بھی بیدار کیا۔ ذات پات، مذہبی اور طبقاتی عصبیت اور منافرت کے اندھیروں سے نکالا، اخوت، امن اور آشتی کے احساس کو عام کیا۔ سماجی اور سیاسی شعور کی بیداری میں بھی ماضی میں ادب نے بہت مثبت کردار ادا کیا ہے۔ جب ہندوستان استعماریت کے شکنجے میں تھا تو اس وقت ادب ہی تھا جس نے استعماریت کے خلاف آواز بلند کی۔ اردو اخبارات اور رسائل نے جنگ آزادی کے دوران لوگوں میں انقلابی جوش اور جذبہ پیدا کیا اور ملک کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے قومی اور سیاسی شعور کو بیدار کیا، ہندو مسلم اتحاد کے لیے انھوں نے 'الہلال' میں نہ صرف مضامین لکھے بلکہ عملی طور پر بھی انھوں نے اس اتحاد کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اپنے اخبارات کے ذریعے ملک کی تعمیر اور ترقی کے لیے جو ضروری چیزیں تھیں اس پر زور دیا۔ تعلیم پر بھی ان کی نگاہ رہی ہے۔ اقتصادی بدحالی پر بھی ان کی نظر تھی۔ ملک کی تعمیر کے لیے انھوں نے جو قربانیاں دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اسی طرح دوسرے اخبارات اور رسائل نے بھی ملک کی تعمیر اور ترقی کو مرکزیت عطا کی اور

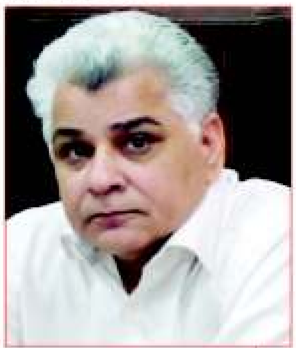

ہندوستان کو برطانوی استعمار کے پنجۂ استبداد سے نکالنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور انہی کی کوششوں سے ہمارا ملک آزاد ہوا اور ہمیں ایک نئی صبح ملی۔ نئے خواب ملے۔ اگر ان لوگوں نے کوششیں نہ کی ہوتیں تو ہندوستان بہت سارے مسائل سے دوچار رہتا۔ ادب نے اس زمانے میں ہمارے ملک اور سماج کو نئے افکار اور اقدار بھی دیے۔ زندگی کی نئی سمتوں کا تعین بھی کیا۔

آزادی سے پہلے کے ادب پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ اندازہ لگانا آسان ہوگا کہ ادب کا ارتکاز ان بنیادی مسائل پر زیادہ رہا ہے جن سے ملک کی تعمیر اور ترقی کا سروکار ہے۔ اسی زمانے میں پریم چند نے ذات پات کے نظام کے خلاف لکھا اور اپنے افسانوں میں انسانی اقدار کو مرکزیت عطا کی۔ ان کے فکشن کے جو موضوعات ہیں ان پر گہری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آج ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے ان پر پریم چند نے بہت پہلے لکھ دیا ہے اور پریم چند کے دبستان سے وابستہ فنکاروں نے بھی ہندوستان کے سیاسی و سماجی اور اقتصادی مسائل کے حوالے سے اپنے خیالات افسانوں اور ناولوں کے ذریعے پیش کیے۔ ہندوستان کا کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو شاعری یا افسانوں کا محور یا مرکز نہ بنا ہو۔ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہو یا صنفی تفریق کا یہ بھی ہمارے افسانوں اور ناولوں کا ایک اہم نقطہ رہا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس میں عورتوں کی تعلیم اور کردار سازی پر روشنی ڈالی، تو الطاف حسین حالی نے 'چپ کی داد' اور 'مناجاتِ بیوہ' کے ذریعے عورتوں کے بنیادی مسائل سے معاشرے کو روشناس کرایا۔ آج کے زمانے میں جو بھی مسائل ہمارے ملک کو درپیش ہیں ان پر ہمارے ادیب اور دانشور نہ صرف سنجیدگی سے غور کرتے ہیں بلکہ ان مسائل کو اپنی تخلیق کے ذریعے پیش کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں بہت سے ناولوں میں ہندوستان کے سیاسی سماجی اور اقتصادی مسائل پر بہت مربوط گفتگو کی گئی ہے۔ فن کار بنیادی طور پر انسانی قدروں سے جڑا ہوتا ہے اسی لیے وہ کسی خاص نظریے میں قید ہوئے بغیر مسائل کی جڑوں تک پہنچتا ہے اور اس کے حل کی صورت نکالتا ہے۔ اس طرح ادب سے سماج کو ایک نئی روشنی ملتی ہے۔ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں نے ان تعصبات اور تحفظات کے خلاف بھی جنگ لڑی ہے جس سے ملک کی سالمیت مجروح ہوتی ہے۔ اردو میں بہت سے ایسے شعراء ہیں جنھوں نے ہر طرح کے تعصبات اور ذہنی تحفظات کے خلاف لکھا۔ آج جب نئے ہندوستان کی تعمیر کی بات ہو رہی ہے تو ایسے میں ادیبوں اور دانشوروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے ملک کے ادیب اور دانشور نئے ہندوستان کی تعمیر کے خواب کو نہ صرف شرمندۂ تعبیر کرسکتے ہیں بلکہ اپنی تحریروں سے ملک کو دہشت گردی، ذات پات اور طبقاتی تفریق سے نجات بھی دلا سکتے ہیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

✍ زیر نظر شمارے کے اداریے میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ہماری بات کا آغاز کرتے ہوئے زبان اردو کی شناخت سیاست میں الجھا دینے والی بات کہی ہے جو برحق ہے اور یہ بھی موصوف نے سچ کہا ہے کہ اسے ایک تہذیبی تشخص کے شکنجے میں کس کے دیکھا جارہا ہے جبکہ اس کی لسانی ساخت ہندوستانی زبانوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہمہ فن ہے اس کی جڑیں مدارس، مکاتب، مشاعروں اور مظاہروں سے مبرا عوام کی علاقائی بول چال سے ہر طرح سے جڑی ہوئی ہیں۔ کشمیر سے ملیبار تک جہاں کہیں بھی مسلم علاقے ہیں اپنی اپنی علاقائی آب و ہوا کے ساتھ معاشرے میں گھل مل کر مختلف صورتوں میں زندہ ہیں اور ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ حیرت انگیز طور پر (Social Media) سے بھی جڑ چکی ہے بھلے ہی قرطاس وقلم کا عہد مفقود و معدوم ہوجائے اس کے باوجود مسدود پہاڑیوں سے اپنی راہ بناتی ندیوں کی طرح اردو ہندی کے ساتھ ساتھ جیے جارہی ہے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ہم بیانگ دہل کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا مستقبل وہی ہے جو ہندی اور ہندوستان کا مستقبل ہے اور اردو کی گردش لیل ونہار میں قومی اردو کونسل جو تاریخ ساز خدمات انجام دے رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

تازہ شمارہ اس بار آنکھوں کی بصیرت افروز ٹھنڈک اور دل کا سرور ثابت ہوا وہ اس لیے کہ آپ نے اس شمارے میں دنیائے اردو ادب کے رخشندہ ستاروں کو جو ان کی وفات کے بعد اپنی تابانی کو قائم ودائم رکھے ہوئے ہیں جیسے سعادت حسن منٹو،شوکت تھانوی،عصمت چغتائی،قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ مضمون نگاروں میں محمد اقبال لون، رؤف خیر، قیام نیر، فیروز عالم، تصنیف عزیز، ناصرہ سلطانہ اور غلام نبی خیال کی نگارشات معیاری ہیں۔

❖ **علیم صبا نویدی:** رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

✍ جولائی کا شمارہ صحافت کے چند قلمی نسخوں کے نمونوں سے مزین ظہور پذیر ہوا۔ اس شمارے میں بالخصوص، محترمہ ڈاکٹر شیو یہ ترپاٹھی کا مضمون قابل غور ہے۔ ہندی کے نقادوں میں شری رام چندر جی شکل نے ریتی کال کے عہد یا دور کا اعلان سنہ 1700 سے لے کر تقریباً سنہ 1900

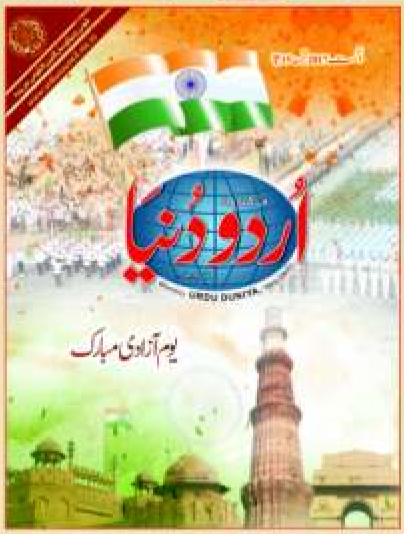

تک ہی کیا تھا، نہ کہ اس میں درج کردہ معیاد کے بموجب۔

علامہ سیماب اکبرآبادی کی اعلی تنقیدی کتاب 'دستور الاصلاح' پرمبنی جناب مقیم احمد کا مضمون لائق صد ستائش ہے۔

رحمان اختر صاحب کا مقالہ پنجاب کے ایک گمنام، لیکن بلند پایہ و مایہ ناز شاعر جناب رام رتن مضطر کی شاعری سے بخوبی متعارف کراتا ہے۔ پنجاب ریاست کے ہی کرپال سنگھ بیدار، راجیند رکرشن رہبر ('جن کی متعدد غزلیں جگجیت سنگھ نے گائی تھیں۔ ان کا سب سے زیادہ مقبول عام گیت 'تیرے خط آج میں گنگا میں بہا آیا ہوں، آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں۔)، ستنام سنگھ خمار، پروفیسر آزاد گلاٹی، اودے سنگھ شائق، سردار پنچھی، ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد، پورن سنگھ ہنر، ڈاکٹر وزیر آغا، نوبہار صابر، (انگریز سرکار کے ذریعے ان کی ضبط شدہ نظموں کی اشاعت آزادی ملنے کے بعد ہوئی تھی) عرش صہبائی، سریند پنڈت سوز، سدرشن فاکر ('یہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی' اس مشہور نغمے کے خالق، جسے جگجیت سنگھ کی آواز ملی تھی)، مہیش پٹیالوی، جوہر بھارتی، امرت پال سنگھ شیدا، پرویندر شوخ کے فن وشخصیت پرمبنی تنقیدی مضامین دور عصر کی از حد مانگ ہیں۔

مدثر رشید افروز نے اپنے مقالے میں کشمیر کے تناظر میں اردو افسانوں میں کشمیر، کشمیریت اور کشمیر کے مکینوں کے درد وکرب، معاشی وسیاسی بدحالی، کسمپرسی، مفلسی، تہذیبی و تمدنی مسائل ومصائب، ذہنی وجسمانی اذیتوں کی سیاہ تاریکیوں کے بیچ کرشن چندر کی مانند رومانیت کے اجالوں کی بھی دلچسپ عکاسی چنداں کم ہی کی ہے۔

❖ **کرشن بھاوک:** کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

✍ 'اردو دنیا' جولائی 2017 نظر نواز ہوا۔ اداریے میں آپ نے کہا ''اردو دنیا کو خوب سے خوب تر بنایا جائے مگر یہاں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قلمکاروں کی طرح قاری کا بھی قحط ہے۔ ایسے میں اب یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ یہ پتہ چلایا جائے کہ اردو رسالوں کا بازار کہاں ہے یا کن علاقوں میں اردو رسائل کی زیادہ رسائی ہے۔'' یقیناً آپ نے سچ لکھا۔ میں نے اردو رسالوں کی 10-10 کاپیاں منگوائی جس میں آج کل، ایوان اردو، فروغ ادب، اردو دنیا، فکر وتحقیق، بچوں کی دنیا، اخبارات کے ذریعہ اطلاع دی کہ فلاں جگہ سے خریدا جاسکتا ہے مگر افسوس کہ ایک دو پرچے فروخت ہوئے اور آٹھ ویسے ہی رہ جاتے ہیں ایک کالج، صدر شعبہ اردو اسکول کا صدر مدرس ہوں اردو اسکول میں 10 روپے کا پرچہ لیتے اساتذہ تذبذب میں پڑجاتے ہیں جبکہ ان کی تنخواہیں 6 تا 7 ہندسوں میں ہیں۔ پھر ہم کیسے بتائیں کہ رسائل کہاں پڑھے جاتے ہیں مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کوئی ایجنسی اردو پرچے نہیں منگواتی میں خود بچوں کی دنیا 100، اردو دنیا 10، فکر وتحقیق 10، خواتین دنیا 10 کے لیے تیار ہوں اور اردو کی خدمت کررہا ہوں مگر کوئی ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ خاص طور پر اردو مدارس، اردو کا مجلس تمام شعبہ جات کے اساتذہ کو اس بات کا پابند بنائیں کہ وہ ہر ماہ ایک اردو کے رسالے کی سالانہ خریداری لیں جو ان کے لیے آٹے میں نمک کے برابر ہے یا پھر اپنی آمدنی کا کم از کم 2% حصہ اردو کی ترقی وترویج کے لیے لگائیں۔

نورالحسنین صاحب نے بڑی اچھی بات کہی آج افسانہ کے نام پر انشائیے لکھے جارہے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک محفل میں عصمت چغتائی نے کہا تھا ''ہم جس کو پڑھ کر یہ ادب تخلیق کررہے ہیں اب ہمیں پڑھ کر کیا خاک ادب تخلیق ہوگا۔ ادب روبہ زوال ہے۔ اچھے لکھنے والوں کی کمی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ عالمی اردو کانفرنس کی

روداد ہر ماہ پڑھنے کو مل رہی ہے اس وقت اردو دنیا اردو رسالوں میں بین الاقوامی معیار کا رسالہ ہے جس میں سبھی موضوعات ہیں۔

ڈاکٹر م ق سلیم: صدر شعبۂ اردو شاداں کالج
'سائبان' 469-2-19، بیرون فتح دروازہ، حیدرآباد، تلنگانہ

'اردو دنیا' جولائی 2017 زیر نظر ہے۔ قربان جاؤں... محترم پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) کے اسلوب نگارش پر۔ ہماری بات کی شروعات میں اور درمیان میں کچھ ایسے جملے جڑ دیے ہیں، جیسے کسی کے شاہکار ناول کے ایک ایک لفظ کے انمول موتیوں کا مجموعہ۔

یہ الفاظ بھی کیا خوب ہیں ''ان رسائل ہی کا فیض ہے کہ بہت سے اچھے شاہکار قارئین کو پڑھنے کے لیے ملے۔''

ملاحظہ فرمائیں ''نامور ادیبوں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ نوآموز قلم کاروں کو بھی اپنے قیمتی صفحات میں جگہ دی۔ قلم کاروں کو روشناس کرانے کی یہ روایت آج بھی قائم ہے۔''

پروفیسر صاحب مزید فرماتے ہیں ''ماہنامہ 'اردو دنیا' قارئین کے خطوط بہت ہی اہتمام کے ساتھ شائع کرتا رہا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اب 'اردو دنیا' کے معتبر قلم کار کسی بھی مقالے یا موضوع کے متعلق اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتے جبکہ 'اردو دنیا' کی اعزازی کاپی بہت سے اہم اور معتبر قلم کاروں کی خدمت میں بھیجی جاتی ہیں، اور ان سے ہمیشہ توقع رہی ہے کہ ان کی تجاویز اور مشوروں کی روشنی میں 'اردو دنیا' کو خوب سے خوب تر بنایا جائے، مگر یہاں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قلم کاروں کی طرح قاری کا بھی قحط ہے۔

علاوہ ازیں شمارہ ہذا میں درج ذیل نکات بھی مطالعے میں آئے ہیں: (1) افسانے کے نام پر انشائیے لکھے جارہے ہیں، (2) سیماب اکبرآبادی اور اصلاح سخن، (3) اردو افسانہ اور کشمیر (4) فکشن تنقید اور وہاب اشرفی (5) اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں، (6) پنجاب کا ایک گمنام شاعر رام رتن مضطر۔

افسانے کے نام پر انشائیے لکھے جارہے ہیں، نورالحسنین صاحب اپنے انٹرویو کے جوابات چند مثالوں کے ذریعے اپنے بیان کی وضاحت کرتے تو مکمل طور پر مناسب ہوتا۔

سیماب اکبرآباد اور اصلاح سخن بے حد معلوماتی مقالہ ہے۔ سیماب کی شخصیت کے پہلو اس مقالے کی روشنی میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ عیاں ہوتے ہیں۔

صفحہ 24 پر محترم مقیم احمد کی ایک عبارت درج ہے۔ 'اصلاح سخن کوئی آسان کام نہیں۔ ایک غزل یا ایک نظم کی اصلاح میں اتنی قوت اور صلاحیت صرف ہوتی ہے جتنی ایک غزل یا نظم کہنے میں۔

مکمل سچ تو یہ ہے کہ ایک نظم اور غزل کی تخلیق کرنا مشکل امر ہے، اس سے مشکل ترین امر غیر اصلاح شدہ نظم یا غزل کی اصلاح کرنا ہے، کیونکہ خوبصورت تصویر بنا کر اس میں رنگ بھرنا اتنا مشکل نہیں ہے، جتنا مشکل ادھورے مصور کی بنائی ہوئی بگڑی ہوئی تصویر کو سدھارنا یا درست کرنا، اور اس میں بھرے گئے بے ترتیب اور بدنما رنگوں کو خوبصورت اور خوشنما بنانا۔ ہاجرہ خاتون کا مقالہ فکشن تنقید اور وہاب اشرفی بہت خوب ہے۔

چند مثالیں جو ناول نگاری کے عنوان پر دہرائی جاتی ہیں، اس میں بھی وہی عمل ہوا ہے جیسے: (1) قرۃ العین حیدر کا مشہور زمانہ ناول 'آگ کا دریا' (2) الیاس احمد گدی کا فائر ایریا، (3) قرۃ العین حیدر کا 'میرے بھی صنم خانے'، (4) اقبال مجید کا ناول 'نمک'

اشفاق کارنجوری: جی این آزاد اردو ہائی اسکول، بالاپور، اکولہ

جولائی 2017 کا اردو دنیا بفضل تعالیٰ مطالعے میں آیا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی ہماری بات کی قرأت پہلے کی۔ عام طور پر مدیران چھوٹی چھوٹی باتوں کو اداریہ کرنے میں ہتکی محسوس کرتے ہیں انہی باتوں کو مدیر اردو دنیا نے انتہائی موثر طریقے سے بیان کردیا جو مبنی بر حقیقت اور لائق تائید ہے۔ نورالحسنین صاحب تخلیقی اور تجرباتی دونوں سطح پر ایک مخلص انسان ہیں ان کے اطوار میں تکبر نام کی کوئی چیز بالکل نظر نہیں آتی۔ محترم کا انٹرویو حال اور مستقبل دونوں زمانوں کے قلم کاروں کے لیے بہترین نسخہ ہدایت ہے۔ موصوف کا یہ کہنا کہ ان دنوں افسانوں کے نام پر انشائیے لکھے جارہے ہیں حق بجانب قول ہے۔ معین عثمانی صاحب کے سوالات شخصیت کے عین مطابق ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ نابغہ روزگار غالب کو غربال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ غالب بذات خود غربال نما تھے۔ کمال انجم صاحب نے معیاری شخصیت کو معیاری طریقے سے متعارف کرایا ہے۔ صفحہ نمبر 26-25 پر چند اصلاح شدہ اشعار نے ذہن کو باغ باغ کردیا۔ ذرا سی ترمیم سے شعر کا معیار کیا سے کیا ہوجاتا ہے۔ اصلاح اسے کہتے ہیں مقیم احمد صاحب کی یہ پیش کش عمدہ ہے۔

مرحوم شاہد احمد شعیب صاحب کے تعلق سے اصح ظفر صاحب کا مضمون حاصل شمارہ ہے۔ خراج عقیدت کے طور پر کلام کا انتخاب بھی خوب ہے۔ نوشین حسن کی محنت قابل قدر ہے۔ صفحہ 41 پر مرحوم اشرفی صاحب کو دیکھتے ہی دل مچل گیا۔ ہاجرہ کی کاوش لائق مطالعہ ہے۔۔ کنول جعفری صاحب کا مضمون اداریہ کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔ اسرارالحق صاحب کی تحقیق مبارکباد کی مستحق ہے۔

شکیل سہسرامی: بہار قانون ساز کونسل پٹنہ بہار

ماہ جون کا رسالہ اردو دنیا پوری آب و تاب کے ساتھ دستیاب ہوا۔ پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ آج اردو ادب میں اس قدر قحط سالی کے دور میں بھی آپ اتنا دلکش رسالہ ہم تک پہنچا رہے ہیں۔

شہزاد اختر انصاری: مومن پورہ، برہان پور (مدھیہ پردیش)

نورالحسنین عصری ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ آپ حقیقتاً ایک فن کار ہیں۔ نور بھائی جتنے بڑے فن کار ہیں، اللہ نے اُن میں اتنی ہی انکساری بھری ہے۔ اگر اُن کو کوئی بڑا ادیب بڑا فن کار کہہ دے تو وہ اترا کر اس کا شکریہ ادا نہیں کرتے بلکہ شرمسار ہوجاتے ہیں۔ کبھی نہیں مانتے کہ وہ بڑے ادیب ہیں۔ یہ انٹرویو ہی اس بات کا ثبوت ہے۔ وہ خود کو سینئر یا بڑا نہیں بلکہ خود کو اپنے معاصرین کے ساتھ ہی محسوس کرتے ہیں۔

نور بھائی نے درست فرمایا کہ یہ زمانہ خود کو پروجیکٹ کرنے کا ہے۔ یہ خودستائی، یہ پی آر او کی وبا عصری ادب کا ایک ناسور بن کر رہ گئی ہے۔ آج کے اکثر ادبا خود پرستی میں اس قدر غرق ہیں کہ وہ تخلیقی عمل کو بھول گئے۔ ان کو بہتر ادب تخلیق کرنے کی فکر نہیں۔ فکر ہے تو اپنی شان میں تعریفی مضامین لکھوانے کی۔ پھر ان تعریفی مضامین کو ایک ضخیم کتاب میں شائع کروانے کی فکر ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پارہے کہ آنے والے دور میں ان کو ان کی معیاری تخلیق، اُن کا فن زندہ رکھے گا نہ کہ لوگوں کی جھوٹی تعریفیں۔

نورالحسنین بھائی کا انٹرویو بہت ہی پرمغز اور معلوماتی ہے۔ تھوڑا اور طویل ہوتا تو شاید وہ کوئی سبق نئی نسل کو دے جاتے۔ مبارکباد کے حقدار جناب معین الدین عثمانی بھی ہیں جنھوں نے انٹرویو کے سوالات مرتب کیے۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی: دہلی گیٹ، مالیر کوٹلہ، پنجاب

'اردو دنیا' کا شمارہ دیکھا۔ نند کشور وکرم کے متعلق عارف اقبال کی تحریر بے حد پسند آئی۔ وکرم صاحب اردو زبان کی جو خدمت کررہے ہیں وہ ناقابل فراموش ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں کردار سازی بھی اچھی تھی۔ ادبی جائزہ بے حد معلوماتی ہے۔ جموں وکشمیر میں اردو صحافت، اختر شیرانی سے متعلق جانکاری بھی پسند آئی۔ نامور شاعر سرے کابری پر اچھی معلومات ہیں۔ بچوں کی دھن بھی ٹھیک ہے۔ راج کپور، ف س اعجاز کی کاوش قابل ستائش ہے۔ کتابوں پر تبصرے پسند آئے۔ اردو تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں اردو کی سرگرمیوں سے واقف کراتی ہیں۔ سلمیٰ صدیقی کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔

بلراج بهل: رائے پور،

قومی کونسل کا شاہکار علمی و ادبی ماہنامہ اردو دنیا، جولائی 2017 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریے میں زیر بحث لائے گئے موضوعات اور رسالے کے دیگر مشمولات لائق توجہ ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار کا شمارہ بھی پر مغز اور معلومات افزا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت اشاعت پذیر مضامین اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔

رسالے میں شامل ایک خاص مضمون جس کا سروکار میری ذاتی دلچسپی سے ہے، اور جس پر بات کرنا میں اپنے تئیں ضروری سمجھتا ہوں، وہ جناب ارشاد قمر صاحب کا مضمون 'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ ہے۔ موصوف کا موضوعاتی انتخاب قابل ستائش ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے موضوعات کو اکثر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اہل ادب میں اس بے اعتنائی کا سبب چاہے جو ہو، لیکن اس تعلق سے صورت حال اطمینان بخش نہیں۔ جبکہ رسائل و جرائد کی علمی و ادبی معنویت اپنی جگہ مسلم ہے۔

مضمون مذکور کے تعلق سے عرض یہ کرنا تھا کہ وضاحتی اشاریہ میں متعلقہ مضمون پر ہم کوئی ناقدانہ رائے دینے سے احتراز برتیں۔ مضمون میں زیر بحث لائی گئی اہم اور قابل ذکر باتوں کو واضح کریں یا اس پر ایک مختصر تبصرہ کر دیں، بجائے اس کے کہ اپنے ذاتی تخیل اور آرا کو زحمت دی جائے۔ ارشاد صاحب نے 'فکر و تحقیق' کے مسلسل پانچ شماروں پر توضیحی اشاریہ لکھ کر 'اردو دنیا' میں شائع کرایا ہے، جو چار قسطوں میں ہے۔ نیا شمارہ برائے ماہ اگست 2017 میں ایک ہی مضمون میں دو شماروں (جن کی میعاد سہ ماہی ہے) کا وضاحتی اشاریہ شامل ہے۔

اردو دنیا کے جولائی 2017 کے شمارے میں ارشاد صاحب نے 'فکر و تحقیق' کے جس شمارے کا توضیحی اشاریہ پیش کیا ہے، بالاتفاق وہ شمارہ میرے پاس موجود ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس موضوع میں بذات خود میری دلچسپی ہے، اس لیے میں نے بھی اس شمارے کے مشمولات پر وضاحت کی ادنیٰ کوشش کی ہے اور اسے قمر صاحب کی ایک وضاحت کے روبرو رکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

(مضمون) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی تلاش:
جناب سہیل احمد فاروقی

جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں ہندوستان میں عرب، ترک اور افغان نسلوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان نوواردوں اور یہاں پہلے سے آباد غیر مسلموں کے درمیان اختلاط اور ہم آہنگی کی ایک مشترکہ تہذیب دکھائی دیتی تھی اور یہ تہذیب تھی ایک آفاقی ضابطۂ اخلاق کی۔ اسی آفاقیت سے روبرو کرایا گیا ہے۔ (وضاحت، ارشاد قمر)

(مضمون) اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی تلاش: جناب سہیل احمد فاروقی

سہیل احمد فاروقی کے اس مختصر مضمون میں اردو زبان کے ذریعے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات انجام دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں صوفیائے کرام نے اپنے احکامات جاری کیے۔ بقول فاروقی اردو نے حصول آزادی میں مخصوص رول ادا کیا۔ اسے ہندوستانی عوام نے ملک کی مشترکہ زبان سمجھ کر گلے سے لگایا۔ مضمون نگار نے انگریزوں کی چال بازیوں سے اردو کو ہونے والے نقصانات پر بھی قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ اگر ہم اردو ادب میں ہندوستان کی تہذیبی روایات کی تلاش میں اردو کی غیر ادبی یعنی علمی و فکری تحریروں کو بھی شامل کر لیں تو اردو کی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہو جائے گا۔ (وضاحت، محمد کلام)

اس تحریر کا مقصد اتنا ہے کہ منتخب موضوع کے ساتھ انصاف کیا جائے، اتنا ہی مقصود محض ہے۔

❖ **محمد کلام**: شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

ماہ نامہ 'اردو دنیا' جون 2017 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہماری بات میں مدیر صاحب نے تحریکات کی بات کہی۔ اردو کے فروغ میں تحریکات کا اہم رول رہا ہے۔ زبان اور ادب کے فروغ میں تحریکات اپنا کام کرتی رہی ہیں۔ محمد اقبال لون نے نور شاہ سے جو انٹرویو لیا ہے وہ ادبی معلومات سے پُر ہے۔ زبان و ادب سے متعلق کچھ حقائق سامنے آئے خاص کر کشمیر میں کیا صورت حال ہے۔ عالمی اردو کانفرنس مندوبین کے تاثرات اہم ہیں لیکن اب کہ نئی نسل کو کم موقع دیا گیا ہے۔ عالمی کانفرنس میں نئی نسل کو مدعو کریں تاکہ ان کی تربیت اور اصلاح ہو جائے۔ فن خاکہ نگاری اور سعادت حسن کا خاکہ منٹو بہت خوب ہے۔ نسیم احمد نسیم نے اردو میں طنز و مزاح کے نمونے کی ابتدا جعفر زٹلی بتایا ہے۔ ان کے علاوہ سودا، انشا اور شیفتہ کے یہاں شعری نثری نمونوں میں طنز و مزاح ملتا ہے۔ یہ باتیں نئی ہیں اس پر ریسرچ کی ضرورت ہے کیونکہ باقاعدہ شعوری ڈھنگ سے طنز و مزاح کب شروع ہوتا ہے کس کے پاس باقاعدہ طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں نثر و نظم میں پہلا طنز و مزاح نگار کون ہے اس پر روشنی ڈالنی چاہیے۔ رؤف خیر نے آندھرا و تلنگانہ میں اردو صحافت مضمون لکھا۔ رسالوں کا مختصر تعارف کروایا اور انھوں نے پہلا شمارہ کب نکلا اس کی تاریخ بھی بتلائی۔ کچھ رسالے چھوٹ گئے ہیں انھوں نے روزناموں کا ذکر بھی کر دیا۔

جولائی 2017 کا ماہنامہ اردو دنیا وقت پر موصول ہوا پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اس کے مشمولات میں تنوع ہے، ہمہ گیری ہے۔ معین الدین عثمانی نے نور الحسنین سے جو انٹرویو لیا وہ ادبیت اور تاریخ لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے افسانے، ناول، دیگر اصناف پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے کہا کہ افسانے کے نام پر انشائیے لکھے جا رہے ہیں۔ ایسا ہو رہا ہے کیونکہ افسانے میں انشائیے والے جملے مل جاتے ہیں لیکن ایسا چند لوگ کر رہے ہیں۔ بڑے افسانہ نگار تو کہانی پن پلاٹ و کردار کو فنی لحاظ سے پیش کر رہے ہیں۔ مقیم احمد نے سیماب اکبرآبادی پر مضمون میں اصلاح سخن پر بہت اہم باتوں کا احاطہ کیا ہے۔ پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن سیماب اکبرآبادی کے تعارف میں کہیں بھی رسالہ تسنیم کا ذکر نہیں کیا۔ سیماب اکبرآبادی رسالہ تسنیم کے مدیر تھے اور اس رسالے میں آل احمد سرور کے افسانے شائع ہوئے۔

❖ **محمد ناظم علی**: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج تلنگانہ یونیورسٹی

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ ضرور فراہم کریں۔ معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

'اردو دنیا' کے لیے تمام مضامین/مکتوبات اردو دنیا کی ای میل آئی ڈی کے علاوہ درج ذیل آئی ڈی پر بھی ضرور ارسال کریں: director@ncpul.in

انگریزی اور اردو کے معتبر قلمکار

محمد عرفان نگینوی مرحوم کا آخری انٹرویو

شیخ نگینوی

مشہور شاعر وادیب محمد عرفان کا انتقال 7 جولائی 2016 کو دہلی میں تغلق آباد ایکسٹینشن میں ان کے بھائی محمد برہان صدیقی کی رہائش گاہ پر ہوگیا۔ محمد عرفان گذشتہ کئی ماہ سے دہلی میں قیام پذیر تھے اور بلڈ کینسر ہوجانے کی وجہ سے زیر علاج تھے۔ 8 جولائی کو دہلی نظام الدین کے پنج پیران قبرستان میں بعد نماز جمعہ تدفین کی گئی۔ انتقال سے تقریباً تین ماہ قبل انھوں نے میڈیا پوسٹ دہلی کے ایڈیٹر ڈاکٹر شیخ نگینوی کو یہ انٹرویو دیا تھا جو کہ ان کا آخری انٹرویو ثابت ہوا۔

شیخ نگینوی: سب سے پہلے آپ اپنی زندگی اور تعلیم کے بارے میں ہمیں بتائیں؟

محمد عرفان : میری پیدائش 28 جون 1938 کو اتر پردیش کے اردو ادب کی زرخیز بستی نگینہ ضلع بجنور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ کے مدارس سے پائی۔ میرے والد محترم مولانا اسحاق عربی فارسی کے جید عالم تھے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی حقیقی ماموں تھے، چچا مشہور مجاہد آزادی اور مرکزی کابینہ وزیر حافظ محمد ابراہیم گورنر پنجاب تھے انھیں کے یہاں دہلی میں پرورش ہوئی، دہلی یونیورسٹی سے بی اے آنرز کے بعد انگریزی میں ایم اے ادبیات کیا اور دوسال اشوکا ہوٹل دہلی میں ملازمت کرنے کے بعد 1963 میں اسلامیہ کالج بریلی میں انگریزی لکچرار کے عہدے پر فائز ہوا اور اسی کالج سے وائس پرنسپل کی حیثیت سے 1998 تک وابستہ رہا۔

ش ن : ادبی زندگی کا ذکر آپ نے نہیں کیا برائے کرم اس کے بارے میں بتائیں؟

محمد عرفان: میری ادبی زندگی، مصروفیت کے لحاظ سے، کافی طویل ہے اگر چہ میرا ذخیرۂ ادبیات اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ زندگی کی اصطلاح مسائل ومصائب کو محیط ہے۔ اس لیے ادبی کاموں کے لیے تقاضے زیادہ اور وقت کم مہیا ہوتا ہے، احباب کی روایات کے مطابق میں شاعر ادیب اور ناقد بھی ہوں اگر چہ ان میں سے کسی صنف کے ساتھ انصاف نہیں کر پایا لیکن میری اشاعتی زندگی کا آغاز نقد ونظر سے ہوتا ہے، ادب کے میدان میں نثر ونظم، غزل اور منظوم مضامین کے لحاظ سے تھوڑی بہت خدمت میرے قلم نے بھی کی ہے، میرے بیشتر ادبی مضامین رسالوں اور ماہناموں میں شائع ہو چکے ہیں، مستقل تصنیف کی صورت میں کتابوں کی فہرست اس طرح ہے: (1) طرز غالب (2) دسترس (3) احتساب (4) مطالعۂ جوش ملیح آبادی (5) صدائے جبرئیل (6) میر انقطۂ نظر (7) اغثنی یا رسول اللہ (نعت وحمد کا مجموعہ) (8) مجموعہ انگریزی منظومات گیدرنگ فرام اے چیلڈ شور (9) آئی وِش آئی ورائے برڈ۔

ش ن: جدید ادبی لہجے کو آپ نے کہاں تک اپنایا ہے؟

محمد عرفان: میں فطری طور پر کلاسکی معیار کا ادیب وشاعر ہوں تاہم میں نے ادب کی صحت مند اقدار سے روگردانی نہیں کی؛ بلکہ میرے یہاں کلاسکیت اور جدیدیت کا ایک متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ میں نے استعاریت اور اشاریت کے ساتھ ساتھ علامات کے استعمال پر بہت زور دیا ہے۔

ش ن : نقد ونظر کے میدان میں بے شمار اہل قلم حضرات نے اپنے خیالات سے عظیم خدمات ادا کی ہیں۔ آپ مختصراً یہ بتائیں کہ آپ کا تنقیدی نظریہ کیا ہے؟

محمد عرفان: آپ کا سوال بڑا بنیادی سوال ہے، ایسا سوال کہ اس کا اختصار یا تفصیل سے کوئی مکمل جواب دیا ہی نہیں جا سکتا لیکن پھر بھی صاحبان تنقید کی نظر میں کوئی ایسی مشعل راہ ضرور ہوتی ہے جس کی روشنی میں وہ تھوڑا بہت سفر طے کر لیتے ہیں۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہر وہ تخلیق جس پر میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں مجھ میں نہ جانے کیسے ایک ایسی روشنی عطا کر دیتی ہے جس کی چمک میں مجھے اس تخلیق کے کچھ پہلو نظر آنے لگتے ہیں اور حتی الامکان میں اس کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ش ن : ہر علیحدہ تخلیق اپنا الگ مقام رکھتی ہے تو آپ علیحدہ علیحدہ کس طرح انصاف کر سکتے ہیں۔

محمد عرفان: آپ میرے یا کسی کے ساتھ انصاف کرنے کو مکمل نہ سمجھیں کیونکہ کوئی شخص مکمل انصاف کر ہی نہیں سکتا اب میں یہ طریقہ اختیار کرتا ہوں کہ سب سے پہلے ایک آئیڈیل قاری بننے کی کوشش کرتا ہوں اور زیر نظر تخلیق کو از اول تا آخر سمجھنے بوجھنے کی کوشش کرتا ہوں یہاں تک کہ نہایت عام لفظوں کے معنی کے لیے بھی مجھے بہت گہرائی تک جانا پڑتا ہے۔ اب میں قاری نہیں بلکہ خود کو اس مصنف کے پیکر میں ڈھال لیتا ہوں جس نے وہ تخلیق انجام دی ہے اور اپنے آپ کو اس مقام پر لے جانے کی کوشش کرتا ہوں کہ جس زاویہ نظر سے کسی مصنف نے اپنی تخلیق کو جسم عطا کیا ہے۔ یہ دو اقدام ہوئے پہلا قاری کا دوسرا خود اس مصنف کے نظریہ سے دیکھنے کی کوشش کرنے کا۔

اب تیسرا مقام یہ ہے کہ میں تجزیہ اور تقابل کی روشنی میں اس تخلیق کو اور زیادہ پر لطف طریقے سے مزے لے لے کر اپنے تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر لے آتا ہوں۔

ش ن : لیکن آپ کے یہاں ایک عجیب قسم کا تصور ملتا ہے کہ آپ عموماً زیر نظر تخلیق کار کے مثبت پہلوؤں اور محاسن تک ہی خود کو محدود رکھتے ہیں ایسا کیوں ہے؟

محمد عرفان: میری نگاہ میں محاسن کلام غالب کے خالق ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری میرے آئیڈیل ہیں انھوں نے غالب کا جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے سیاق وسباق میں مطالعہ کیا اور میں انگریزی کا طالب علم ہونے کی بنا پر زیادہ تر اپنی تخلیقات کا مغربی ادبیات کے سیاق وسباق میں مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ش ن : آپ یہ بتائیے کہ غیر مشرقی زبانوں سے مشرقی ادبیات کا کیا تعلق ہے؟

محمد عرفان: آپ تو میرے اندر سے سب ہی کچھ نکلوانا چاہتے ہیں، میں نے اپنی پہلی کتاب طرز غالب میں ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ تمام عالمی ادب ایک

غیر منقسم اکائی ہے جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ Greatmen think alike یعنی عظیم شخصیات اکثر ایک جیسا سوچتی ہیں۔ اب دیکھیے غالب کے یہاں صوتیات اور انگریزی کے ایک شاعر Spenser اور Kets کے جیسی صوتیات (Sounds effects) طرز غالب میں تجزیتاً پیش کی گئی ہیں (تفصیل کے لیے طرز غالب ملاحظہ کر سکتے ہیں) صوتیات کو انگریزی زبان میں Phonetics کہتے ہیں اور یہ تو ٹیکنیکل ہوئی تمام دنیا کی ادبیات میں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے یہ تو میں نے مثال کے طور پر ایک پہلو کو پیش کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عالمی ادبیات ایک عالمگیر منقسم اکائی ہے۔

ش ن: کیا آپ اپنے تنقیدی نظریے کو کسی شعری ہیئت میں بھی پیش کر سکتے ہیں؟

محمد عرفان: جی ملاحظہ فرمائیں!

ہے کاروانِ ادب کا یہ انتخاب بھی خوب
کوئی ہے مشرق ومغرب کوئی شمال وجنوب
یہ اپنی اپنی طبیعت کا فرق بھی ہے مگر
کسی کو شوقِ محاسن، کسی کو فکرِ عیوب

ش ن: آپ پر مضامین لکھنے والوں نے آپ کو ایک مقرر بھی لکھا ہے اس سلسلے میں آپ کچھ فرمائیں۔

محمد عرفان: میں پیشے سے ایک مدرس رہ چکا ہوں اور طالب علموں کو خطاب کرنا میرا شغل رہ چکا ہے، میں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں سامعین کرام سے خطاب کیا ہے، جن کی اشاعت مختلف اخبارات ورسائل میں ہوئی، جس میں سیرت النبیؐ کے عنوان پر انگریزی زبان میں میری ایک تقریر خاص طور پر پسند کی گئی ہے۔

ش ن: آپ نے اپنے لیے کتنے قسم کے میڈیا کا استعمال کیا ہے؟

جواب: تحریر وتقریر کا تو ذکر آہی چکا ہے آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل اودھ پنچ میں اکثر سامنے آیا ہوں جس میں سے افسانہ نگاری پر میری گفتگو بہت زیادہ مقبول ہو چکی ہے۔

ش ن: کیا آپ افسانہ نگاری کے عنوان پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔

محمد عرفان: افسانہ نگاری ادبیات کے دوسرے شعبوں کی طرح مختلف ارتقائی مراحل سے گزر چکی ہے، جنگ آزادی کے دوران جنگ آزادی کے عنوان سے زبردست افسانے سامنے آچکے ہیں پھر تقسیم وطن افسانوں کا مستقل عنوان بن گیا اور اس کے بعد جو قتل وغارت کا حشر بپا ہوا اس کے بیشمار پہلو افسانہ نگاروں نے پیش کیے ہیں کسی میں حیوانیت اور درندگی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور انسانیت کی سرفرازی پر متعدد افسانے قلم بند ہوئے۔ افسانہ نگاری میں ناول نگاری بھی شامل ہے غزل کی طرح افسانہ نگاری ہیئت واسالیب کے متعدد ارتقائی مدارج سے گزر چکی ہے کبھی کردار غائب، کبھی کہانی پن غیر موجود، کبھی تجرید نگاری کا اثر اور آج کردار اور کہانی پن دونوں کی واپسی ہو چکی ہے۔

ش ن: ایک بار یہ ذکر ہوا کہ کیا ادب میں جمود ہے؟ اس پر آپ کا کیا خیال ہے؟

محمد عرفان: زندگی کی طرح ادب بھی کوئی جامد وساکت چیز نہیں ہے بلکہ ادب میں زندگی کی متحرک حیثیتوں کو نظم ونثر، افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا گیا ہے اسی کو زندہ ادب کہتے ہیں اور زندہ ادب کبھی مر نہیں سکتا ہے۔

ش ن: کیا آپ کے خیال میں انسان کو اس کا آئیڈیل اس دنیا میں مل جاتا ہے؟

محمد عرفان: یہ دنیا ایک ناقص دنیا ہے یہاں پر انسان کا آئیڈیل دنیا کے محدود حالات سے مجسم ہو کر ہی سامنے آتا ہے، جس کی طرف دوڑنا تو ممکن ہے مگر جس کو مکمل طور پر حاصل کرنا آسان نہیں لیکن کامیابی اس پر منحصر ہے کہ کسی آئیڈیل کو لے کر کون کہاں تک دوڑ پاتا ہے۔

ش ن: ادب کا تعلق سیدھے طور معاشیات سے نہیں ہے پھر بھی ادیب کسی نہ کسی طور سے ملک کی معاشیات کی مخالفت یا حمایت تو کرتا ہی ہے اس سلسلے میں آپ کا کیا رخ ہے؟

محمد عرفان: میں کمیونسٹ تو ہوں نہیں لیکن ترقی پسند جیسا ضرور ہوں اور نہرو کے سماج واد سے اتفاق کرتا ہوں، اس لیے میں نے وطن کے مزدوروں کی بدحالی پر اس طرح سے افسوس کیا ہے۔

بستیوں کو جو بساتا ہے وہی برباد ہے
اے خدائے دوجہاں فریاد ہے فریاد ہے

میرا خیال ہے کہ ابھی دنیا کو کئی معاشی انقلابات کی ضرورت ہے اس لیے میں نے پورے اعلان کے ساتھ یہ کہہ دیا ہے کہ

دہر کے سارے مسائل کا ہے تنہا اک جواب
انقلاب و انقلاب و انقلاب

ش ن: جاسوسی ادب کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

محمد عرفان: جاسوسی ادب جرم وسزا کے عنوان پر ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے اس میں بیان کیے ہوئے اقسام جرائم بڑے دلچسپ ہیں جن میں اجتماعی ملکی، بین الاقوامی وانفرادی بھی طرح کے جرائم کی تحقیق وتفتیش پیش کی گئی ہے۔ جاسوسی ادب ایک عجیب وغریب ادب ہے جس کے نقطۂ اختلاط پر سماجیات نفسیات، جنسیات، سائنس، قانون اور قانون شکنی کے تمام شعبے اکٹھا ہو جاتے ہیں جاسوسی ادب اگرچہ اپنے آپ میں ایک مکمل ادب ہے لیکن پھر بھی اس سے ایک نظریہ حیات بھی اخذ کیا جاسکتا ہے مثلاً 'یہ کہ دنیا صحیح اور غلط اور گناہ وثواب کے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے جاسوسی ادب کا مستقبل اب پہلے سے زیادہ تابناک معلوم ہوتا ہے کیونکہ جاسوسی ادب کتابی کاغذ سے اتر کر سنیما اسکرین اور ٹیلی ویژن اسکرین تک پہنچ چکا ہے۔

ش ن: اردو کے زندانی ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

محمد عرفان: زندانی ادب اپنی تاریخ کے لحاظ سے ایک قدیم ادب ہے، زندانی ادب اپنے مخصوص معانی میں ان تخلیقات سے متعلق ہے جن کو مصنفین نے اپنی مدت زندانیت میں تصنیف کیا ہے زندانی ادب میں وہ تحریر بھی شامل ہو سکتی ہیں جو قید وبند کے مصائب برداشت کرنے والے رہنماؤں کے ارد گرد بطور حالات وسوانح مرتب ومنضبط ہوئی، زندانی ادب میں غزل کے واسطے سے وہ تخلیقات وتصورات بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جو قفس وزنداں کے استعاراتی رمز وایماء کا ذائقہ رکھتے ہیں چنانچہ ایک زندہ وپائندہ زبان کی حیثیت سے اردو میں زندانی ادب کا بہت ذخیرہ موجود ملتا ہے۔

ش ن: لفظ 'محبت' کے سلسلے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

محمد عرفان: محبت انسانیت کا حسن اور روح کی پاکیزگی ہے، زندگی کے تمام مصائب ومسائل کا واحد علاج محبت ہے، محبت وہ پھول ہے جس کی خوشبو تمام باغ عالم کو معطر کر سکتی ہے، محبت دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو عزیز تر بنا دیتی ہے، محبت ہی سب سے بڑا طلسم ہے کیونکہ اس کی گرمی سے انسان کی سرد مہری موم کی طرح پگھل جاتی ہے اور یہ پست انسان کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتی ہے، محبت دنیا کی جنت ہے اور جنت کی ضمانت بھی، کیونکہ یہ برائیوں کو روکتی اور نیکیوں کو فروغ دیتی ہے اور دوسروں کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔

ش ن: کیا آپ نئی نسل کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں؟

محمد عرفان: میں نئی نسل سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ان کے سامنے متعدد راہیں کھلی ہوئی ہیں، سیاہ سفید کا ایک پرفریب جال بچھا ہوا ہے غلط اور صحیح کے دوراہے ان کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اس کی بقا اور سلامتی اب صرف صحیح دو ٹوک اور سچا راستہ اختیار کرنے میں ہے اور صحیح راستے کا فیصلہ کرنا زندگی کے تجربات کی روشنی میں خود ان کا اپنا کام ہے میں تو ان سے صرف اتنا کہوں گا کہ۔

یہ ساحل ہے یہ طوفاں ہے، یہ دریا، یہ کنارا ہے
ہمیں اب دیکھنا یہ ہے تمھیں کس نے پکارا ہے

■

Dr. Shaikh Naginvi
Editor, Media Post, Chhanga Wala Chowk
Nagina - 246762 (UP)
Mob.:9412326875

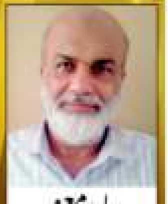

عابد معز

اصطلاحات فہمی

سائنس حقائق، اصولوں، تصورات اور اختراعی خیالات کا علم ہے جنھیں پیش کرنے کے لیے اصطلاحات وضع کی جاتی ہیں۔ سائنس میں ہردم نئے حقائق، اصول، تصورات اور خیالات پیش اور دریافت ہوتے رہتے ہیں جس کے سبب نئی نئی اصطلاحات وضع ہوتی رہتی ہیں۔ سائنس میں اصطلاحات وضع ہونا ایک مستقل اور مسلسل عمل ہے۔

اصطلاح کو انگریزی میں Term کہتے ہیں اور اصطلاحات کے متعلقات جیسے اصطلاحات بنانے کے اصول، اصطلاحات سازی کا فن، اصطلاحوں کی زبان، سابقے اور لاحقے اور اصطلاحات کے استعمال وغیرہ کے مطالعے کو Terminology کہتے ہیں جسے ہم علم الاصطلاح، فن اصطلاحیات کا نام دے سکتے ہیں۔ خود ٹرمنالوجی دو الفاظ Terminus (لاطینی لفظ بمعنی Word، لفظ) اور یونانی لفظ logia- بمعنی گفتگو سے مل کر بنا ہے۔

اصطلاح یعنی Term مختصر فقرہ، کوئی لفظ، مرکب الفاظ یا کثیر لفظی نام ہوتا ہے جس کے کسی خاص مضمون یا متن میں مخصوص معنی اور مفہوم ہوتے ہیں۔ اصطلاح کا مفہوم کسی دوسرے حوالے سے یا عام معنوں سے مختلف ہوتا ہے۔

اصطلاح یا ٹرم طویل جملوں کی جگہ لیتا ہے اور علمی اظہار میں نہایت مفید مختصر بیانی پیدا کرتا ہے۔ خون گلوکوز (Blood Glucose) کی مثال دی جاسکتی ہے۔ خون (Blood) اور گلوکوز (Glucose) دو مختلف الفاظ کو ساتھ ملا کر ایک مرکب لفظ Blood Glucose بنایا گیا ہے۔ خون میں پائی جانے والے گلوکوز کو خون گلوکوز کہا جاتا ہے۔ جسم کے خلیے خون میں موجود گلوکوز کو توانائی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس توانائی سے مختلف کام انجام دیے جاتے ہیں۔ خون گلوکوز کی حد سے بڑھی ہوئی مقدار مرض ذیابیطس کا سبب ہوتی ہے۔ خون گلوکوز کی کمی نقصان پہنچا سکتی ہے... اس اصطلاح کی جامعیت ملاحظہ کیجیے کہ ایک ٹرم یا اصطلاح میں خون میں پائے جانے والے گلوکوز کے متعلق ضروری معلومات فراہم کردی گئی ہیں۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ خون گلوکوز کی جگہ خون شکر یعنی Blood Sugar کی اصطلاح بھی اسی معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ چوں کہ گلوکوز ایک شکر ہے، خون شکر کو خون گلوکوز کے بدل اور ہم معنوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اصطلاحوں کی اہمیت

کسی بھی زبان میں اصطلاحات کے ذریعے سائنس کی درس وتدریس اور عام لوگوں میں سائنس کی تفہیم آسان ہوتی ہے۔ اصطلاحات نہ ہونے یا اصطلاحات کے مسائل کے سبب سائنس کی تعلیم اور سائنس فہمی مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے کسی بھی زبان میں سائنس کی تعلیم اور اس کے بولنے والوں میں سائنس فہمی کے لیے اصطلاحات وضع کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اصطلاحیں صرف علوم سمجھنے اور علوم حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ موجودہ سائنس اور تیکنالوجی کے دور میں اخباروں اور ٹیلی ویژن پر، میڈیا میں، ماہرین سے ملاقات ہونے پر اور عام گفتگو اور بات چیت کے دوران بھی اصطلاحوں کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے بھی عوام کو اصطلاحوں کی شد بد سے واقفیت ضروری ہوگئی ہے۔

جس کسی زبان میں جتنی آسان اور عام فہم اصطلاحات ہوں گی اس زبان میں سائنس اور جدید علوم کی ترسیل بھی آسان ہوتی ہے۔ اسی طرح جس زبان میں جتنی زیادہ اصطلاحیں ہوں گی اس زبان میں سائنس اور دیگر علوم کا ذخیرہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان میں علم کی Vocabulary یعنی اصطلاحوں (مخصوص الفاظ) کا ذخیرہ ہونا ضروری ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ موجودہ دور میں سائنسی اصطلاحات کا ذخیرہ یا سائنس سے متعلق Vocabulary میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق انگریزی زبان میں سائنسی اور تیکنیکی لغت اور فرہنگ میں موجود الفاظ کی تعداد عام انگریزی لغت کے الفاظ سے زیادہ ہے۔ انگریزی زبان میں سب سے زیادہ اصطلاحوں کا ذخیرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے بیشتر علاقوں میں سائنس مادری زبان میں پڑھنے کی بجائے انگریزی زبان میں سیکھی جارہی ہے۔ اس لیے عالمی سطح پر انگریزی سائنس اور تیکنالوجی کی زبان بن گئی ہے۔

انگریزی زبان کی اصطلاحات فہمی:

سائنس کی بہتر سمجھ اور انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے لیے انگریزی میں اصطلاح سازی کے متعلق اساسی معلومات حاصل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس عمل سے اردو زبان میں اصطلاحات وضع کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ میں اس میدان یعنی اصطلاح سازی (Terminology) کا ماہر نہیں ہوں لیکن بحیثیت سائنس کے طالب علم جو میں مختلف مضامین پڑھ کر سمجھ پایا وہ پیش کررہا ہوں۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں اپنی زیادہ تر بات علم طب اور تغذیہ کے حوالے سے کروں گا کہ یہی میرا اختصاص ہے۔

دیکھنے اور پہلی مرتبہ پڑھنے سے اصطلاحیں مشکل اور طویل لگتی ہیں لیکن جب ہم ان کے بننے اور وضع ہونے کے عمل اور طریقوں پر غور کرتے ہیں تو ان اصطلاحوں کے معنی اور مفہوم سمجھ میں آنے لگتے ہیں اور ان الفاظ کا اظہار بھی آسان لگتا ہے۔ یوں اصطلاحات فہمی سے اصطلاحات صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔

پرانا لفظ لیکن نئے معنی: اصطلاح کے لیے اگر پہلے سے کوئی لفظ موجود ہے تو اسے اپنا لیا جاتا ہے لیکن سائنس میں اس لفظ کے معنی مختلف ہوتے اور مختص بھی کردیے جاتے ہیں۔ یوں یہ عام لفظ جسے اب اصطلاح کے طور قبول کرلیا گیا ہے کی الگ سے تعریف اور تشریح کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانی یعنی Water کی مثال دی جاسکتی ہے۔ پانی کے عام معنی ایک بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ مائع ہے جو تمام حیات کے لیے نہایت اہم ہے۔ جبکہ علم تغذیہ میں پانی کی یوں تعریف کی جاتی ہے کہ پانی ایک اہم مقوی ہے۔ زندگی کے لیے ہوا کے بعد پانی کی حاجت ہوتی ہے۔ غذا کے بغیر چند ہفتے زندگی گزر سکتی ہے لیکن پانی کے بنا دو چار دن بھی زندہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔ انسانی جسم کا تقریباً دو تہائی حصہ پانی ہوتا ہے۔ علم تغذیہ میں پانی کی اس مختصر تعریف کے سوا بھی پانی کی مزید تشریح بھی ممکن ہوتی ہے۔

مصدر (Root) کی مدد سے نئی اصطلاحیں:

جب کوئی نئی تحقیق ہوتی ہے یا کوئی نیا نکتہ سامنے آتا ہے تو اسے بیان کرنے کے لیے اصطلاح بنانا پڑتا ہے۔ معلومات اور مختلف خصوصیات کا خیال کرتے ہوئے ماہرین نیا لفظ وضع کرتے ہیں۔ نئی اصطلاح یا ٹرم بنانے میں Root یعنی مصدر اہم رول ادا کرتا ہے۔ روٹ یا مصدر اصطلاح یا اصطلاحوں کی بنیاد بنتا ہے اور وہ عموماً اصطلاح کا مرکزی حصہ ہوتا ہے جس سے دوسرے الفاظ اور فقرے بشمول سابقے اور لاحقے جڑتے ہیں۔

مثال کے طور پر Glyco بمعنی شکر کے مصدر کی حیثیت سے بننے والی اصطلاحات Glyco/gen, Glyco/lipid, Glyco/genesis, Glycogenolysis وغیرہ ہیں۔ گلائیکوجن گلوکوز شکر کا ذخیرہ ہوتا ہے جو عضلات اور جگر میں پایا جاتا ہے۔ گلائیکولپڈس، شکر اور لپڈس (چکنائی) کے مرکبات ہوتے ہیں۔ گلائیکوجینی سس گلوکوز شکر سے گلائیکوجن بننے کا عمل ہوتا ہے اور گلائیکوجینولائی سس تیار شدہ گلائیکوجن کو توڑ کر گلوکوز حاصل کرنے کا طریقہ یا عمل ہوتا ہے۔

گلوکوز شکر کے لیے ایک دوسرے مصدر Gluco سے بھی چند اصطلاحات جیسے Gluco/meter, Gluco/neogenesis, Gluco/cerebroside, Gluco/hydrolase بنائی جاتی ہیں۔ مثال کے لیے علم تغذیہ اور طب کے چند مصادر (Roots) کو جدول میں پیش کیا گیا ہے۔

انگریزی ٹرمس کے روٹس (مصدر)

مصدر / Root	معنی	مثال
carb(o)	کاربن	carbo/hydrate, carbo/nate, carbo/nic,
cardi(o)	دل، قلب	cardio/logy, cardio/vascular, card/itis,
therm(o)	حرارت، گرمی	thermo/meter, thermo/s, therm/al,
lip(o)	چکنائی	lipo/protein, lip/oma, lip/id,
hydr(o)	پانی	hydro/lysis, de/hydra/tion, hydr/ant
amyl(o)	نشاستہ	amyl/ase, amylo/pectin, amyl/oid,
hema, hemo	خون	hema/tinic, hemato/logy, hemo/globin
carcin(o)	کینسر	carcino/gen, carcin/oma,
nutrire	پرورش	nutri/tion, nutri/ent, nutri/tious,
phot(o)	روشنی	photo/synthesis, photo/graphy,

مرکب الفاظ:

بعض اصطلاحیں دو یا زیادہ الفاظ/مصادر کو ملا کر بنائی جاتی ہیں۔ انھیں مرکب الفاظ (Compound / Combined Words) کا نام دیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو ملا کر یا الگ الگ لکھا جاتا ہے لیکن ان سے نکلنے والا مطلب ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔

خون یعنی Blood کے ساتھ مختلف الفاظ مل کر کئی اصطلاحیں جیسے Blood Sugar, Blood Cholesterol, Blood Proteins, Blood Urea وغیرہ بنتی ہیں۔ اسی طرح ایسڈ (Acid) کے ساتھ بھی چند اصطلاحیں جیسے Aminoacids, Fatty Acids, Hydrchloric Acid, Acid/osis وغیرہ بنائی گئی ہیں۔

دو یا زیادہ مصادر سے بنے مرکب الفاظ کی مثال calori/metry, cardio/myo/pathy, mono/unsaturated fattty acids وغیرہ ہیں۔

سابقہ (Prefix) کا استعمال:

انگریزی اصطلاحوں میں Prefixes (سابقے) اور Suffixes (لاحقے) کا استعمال ہوتا ہے۔ Prefix چند حروف یا فقرہ ہوتا ہے جو کسی مصدر سے پہلے لگایا جاتا ہے جس سے اس لفظ یا مصدر کو نئے معنی ملتے ہیں۔ سابقے عموماً تعداد (Number)، مقام (Place) یا وقت (Time) کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر -tri سابقہ عدد کو ظاہر کرتا ہے، -hyper نارمل سے اوپر کے مقام کو پیش کرتا ہے۔

تعداد ظاہر کرنے والے سابقے اور ان کی مثالیں

عدد Number	یونانی سابقہ Gr Prefix	لاطینی سابقہ La Prefix	مثال
1۔ ایک، یک	mono-	uni-	mono/unsaturated fat, uni/for
2۔ دو	di-	bi-	di/saccharide, bi/sexual,
3۔ تین	tri-	ter-	tri/glyceride,
4۔ چار	tetra-	quadri-	tetra/pod, quadri/valent,
5۔ پانچ	penta-	quinaque-	pent/ose, penta/gon,
6۔ چھ	hexa-	sexa-	hex/ose, sexa/valent,

7۔ سات	hepta-	septa-	septa/peptide,
8۔ آٹھ	octa-	octa-	octa/ne, octa/nol,
9۔ نو	ennea-	nona-	nona/chloride,
10۔ دس	deca-	decem-	deca/peptide, decim/al,

انگریزی ٹرمس میں استعمال ہونے والے سابقے

سابقہ Prefix/	معنی	مثال
ab-	دور، فاصلے پر	Ab/normal
anti-	خلاف، ضد، مانع	Anti/body, Anti/oxidant
hemi-	نصف، آدھا	Hemi/cellulose
hyper-	نارمل سے زیادہ	Hyper/glycemia, Hyperlipidemia
hypo-	نارمل سے کم	Hypo/glycemia, Hypo/tension
kilo-	ہزار کی تعداد	Kilo/gram, Kilo/calorie
macro-	بڑا، کلاں	Macro/-nutrients
mal-	برا، ناقص	Mal/nutrition
micro-	چھوٹا، خرد	Micro/-nutrients
poly-	زیادہ، اکثریت	Poly/saccharide, Poly/unsaturated
pre-	ماقبل، پہلے	Pre/diabetes

مثال کے لیے An/emia کو پیش کیا جاسکتا ہے، a یا an سابقہ ہے جو نہیں کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور emia- خون یا دم کا مصدر ہے۔ یوں Anemia (انیمیا) کی اصطلاح خون کی کمی کے لیے بنائی گئی ہے۔ چند سابقوں کے استعمال کو مثال کے لیے جدول میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک سے دس تک تعداد کو ظاہر کرنے والے سابقوں کی ایک الگ فہرست بھی دی گئی ہے۔

لاحقہ (Suffix) کا استعمال:

لاحقہ یعنی Suffix چند حروف یا فقرہ ہوتا ہے جو کسی لفظ یا مصدر کے آخر میں لگا کر نئے معنی دیے جاتے ہیں جس سے نئی اصطلاح یعنی ٹرم وجود میں آتی ہے۔ لاحقہ، اصطلاح کا آخری جز ہوتا ہے جو عموماً کسی عمل، طریقہ، حالت یا مرض کا اظہار ہوتا ہے۔

مثال کے لیے ose- اور ase- کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ حیاتی کیمیا (Bio/chemistry) میں لاحقہ ose- شکر کے نام میں استعمال ہوتا ہے۔ سکروز (Sucr/ose)، گلوکوز (Gluc/ose)، فرکٹوز (Fruct/ose) لیکٹوز (Lact/ose) مختلف شکروں کے نام ہیں۔ اسی طرح خامروں کے آخر میں ase- کا اضافہ کرنے سے نیا لفظ یا اصطلاح تیار ہوتی ہے جس کے مخصوص معنی ہوتے ہیں۔ Lact/ase وہ خامرہ ہے جو لیکٹوز شکر پر اثر کرتا ہے جبکہ Sucr/ase نامی خامرہ شکر یا چینی کو گلوکوز اور فرکٹوز میں توڑنے کا کام کرتا ہے۔

انگریزی ٹرمس میں استعمال ہونے والے لاحقے

لاحقہ Suffix/	معنی	مثال
-ase	خامرہ، انزئم	lact/ase, sucr/ase, hydrol/ase,
-ate	کیمیائی مرکب کا ماخوذ	sulph/ate, phosph/ate, carbo/nate,
-cide	قاتل، مارنے والا	bacteri/cide, germi/cide,
-cyte	خلیہ	erythro/cyte, leuco/cyte,
-emesis	الٹی کرنا، قے کرنا	haemato/emesis, anti/emesis,
-lysis	توڑنا	hydro/lysis, glyco/geno/lysis,
-megaly	بڑا ہونا، وسیع ہونا	hepato/megaly, cardio/megaly
-malacia	نرم پڑنا، ملائم ہونا	osteo/malacia,
-ose	شکر	lact/ose, sucr/ose, gluc/ose,
-logy	مطالعہ، گفتگو	bio/logy, socio/logy, hemato/logy,
-logist	ماہر، عمل کرنے والا	bio/logist, radio/logist,

ایک دوسرا لاحقہ itis- التہاب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لاحقہ سے پہلے جو بھی عضو لگایا جائے گا اس نئی اصطلاح میں اس عضو کے التہاب یعنی Inflammation کو ظاہر کرے گا، جیسے Tonsill/itis, Sinus/itis, Pharyng/itis, Gastr/itis, Appendic/itis وغیرہ۔ مثال کے لیے چند لاحقوں اور ان کے استعمال کو جدول میں پیش کیا گیا ہے۔ سائنسی علوم کی کتابوں اور انٹرنیٹ پر مصدروں، سابقوں اور لاحقوں کی فہرست مل جاتی ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے سابقوں، لاحقوں اور مصدروں کے معنی اور استعمال کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

بعض الفاظ اور فقرے ضرورت کے لحاظ سے سابقے اور لاحقے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایسی کوئی سختی یا اصول نہیں ہے کہ کوئی سابقہ لاحقہ کے طور پر یا کوئی لاحقہ سابقہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اس ضمن میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں ایک فقرہ سابقہ اور لاحقہ دونوں طرح سے استعمال ہوا ہے۔

پیتھ (Path) کے معنی بیماری ہے، سابقہ کے طور پر اس کا استعمال Path/o/logy (پیتھولوجی) یعنی امراض کا مطالعہ ہے اور لاحقہ کی مثال Neuro/pathy (نیوروپیتھی) یعنی اعصاب کا عارضہ ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا لفظ megal ہے جس کے معنی بڑا یا وسیع ہونا ہے۔ اس لفظ کا سابقہ بننے کی مثال Megal/o/mania ہے تو Hepat/o/megaly میں لاحقہ بننے کا ثبوت ہے۔

کسی سابقہ یا لاحقہ میں دو ایک حروف کے معمولی ردّوبدل سے معنوں میں فرق پڑتا ہے اور ایک نیا لفظ یا اصطلاح تیار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر meter- ایک لاحقہ ہے جس کے معنی پیائش ہے۔ اس لاحقہ سے Calori/meter بنتا ہے جس کے معنی وہ آلہ جس سے توانائی کی پیائش کی جاتی ہے۔ اب اس" لاحقہ میں حرف y کا اضافہ کرکے Calorimetry لفظ بنایا جاتا ہے جس کے معنی غذائی اشیا سے ملنے والی توانائی ناپنے کا عمل یا طریقہ ہے۔ اس طرز کی Gluco/meter اور Gluco/metry بھی مثال ہے۔ فوٹوگراف (Photo/graph) اور فوٹوگرافی (Photo/graphy) بھی ایک ایسی ہی مثال ہے۔

اوپر دی گئی مثالوں کے مدنظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس لفظوں کی بازی گری بھی ہے۔ لفظوں سے صرف ادب ہی میں نہیں کھیلا جاتا بلکہ ادب سے زیادہ سائنس اور تیکنالوجی میں لفظوں کی ایرا پھیری سے معنی اور مفہوم بدلے جاتے ہیں۔

حروف علت (Vowels) کا استعمال: اصطلاحیں دو یا دو سے زائد اجزا (سابقے، لاحقے) اور الفاظ (مصدر) سے مل کر بنتی ہیں۔ کولیسٹرال کی مثال پیش کی جاسکتی ہے، Chol/ester/ol تین اجزا Chol, steros اور ol سے مل کر بنا ہے۔ کولیسٹرال کا پہلا جز Chole کے معنی Bile یعنی صفرا ہے، دوسرے جز stereos کے معنی solid یعنی ٹھوس ہے اور الکحل (Alcohol) کا کیمیائی لاحقہ (suffix) ol- کے استعمال سے لفظ

Cholesterol بنا ہے۔ کولیسٹرال ایک موم جیسا چکنائی کا احساس دینے والا مادّہ ہے جو ہمارے بدن کے خلیوں، بافتوں اور حیاتیاتی چربی میں پایا جاتا ہے۔

خون میں کولیسٹرال کی مقدار جب زیادہ ہوتی ہے تو ایک نیا لفظ یا نئی اصطلاح hyper/chole/ster/ol/emia وجود میں آتی ہے۔ یہ اصطلاح پانچ اجزا پر مشتمل ہے۔

اصطلاح کے مختلف اجزا کو جوڑنے کے لیے Vowels (حروف علت a, e, i, o, u) کا استعمال ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ حرف o کا استعمال ہوتا ہے۔ مصدر کے آخر میں حرف اُو کا اضافہ کرنے سے لفظ کی ادائیگی میں سہولت رہتی ہے۔ ہیموگلوبن (Haem/o/globin) کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ہیم (Haem) کے معنی لوہا رکھنے والا مرکب ہے جبکہ گلوبن (Globin) ایک پروٹین ہے۔ ان دو الفاظ کو ملانے کے لیے حرف علت o کا استعمال ہوا ہے۔ ہیموگلوبن اصطلاح کی تعریف یوں کی جائے گی کہ لال خلیوں میں پایا جانے والا لوہا شامل ایک مرکب جو آکسیجن کی منتقلی کے لیے ضروری ہے۔

انگریزی اصطلاحیں اور لاطینی اور یونانی زبانیں:

انگریزی زبان کی اصطلاحوں میں استعمال ہونے والے مصدر، سابقے اور لاحقے اکثر و بیشتر یونانی اور لاطینی زبانوں سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ ایک اصطلاح میں ان دونوں زبانوں سے ماخوذ اجزا ہوسکتے ہیں۔ اصطلاحوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہوتے ہیں۔

کاربوہائیڈریٹ (Carbo/hydrate) اصطلاح کی مثال دی جاسکتی ہے۔ کاربو (carb(o)) لاطینی زبان کا لفظ ہے جو hydr (یونانی لفظ بمعنی پانی) سے مل کر کاربوہائیڈریٹ اصطلاح بنی ہے۔ کاربوہائیڈریٹ کے معنی وہ کاربن مرکب جس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کا تناسب پانی میں پائے جانے والے تناسب سے مطابقت یعنی 2:1 رکھتا ہے۔

لاطینی زبان:

ماضی بعید میں لاطینی زبان (Latin Language) اطالوی لوگوں کی زبان تھی جو سلطنت روم میں چھٹی صدی قبل مسیح بولی جاتی تھی۔ اب یہ زبان کہیں استعمال نہیں ہوتی ہے۔ لاطینی زبان آریائی زبانوں کی ایک شاخ ہے۔ موجودہ دور کی Romance Languages (فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، رومانوی، پرتگالی) لاطینی زبان سے ماخوذ ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 20 سے 33 فیصد انگریزی الفاظ کا ذخیرہ لاطینی زبان سے حاصل کیا ہوا ہے۔

یونانی زبان:

دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں یونانی زبان (Greek Language) ایک اہم زبان ہے۔ تیرہویں صدی قبل مسیح سے آج تک اس زبان کی تاریخ ہے۔ یونانی زبان دو حصوں قدیم اور جدید یونانی زبان میں تقسیم ہوتی ہے۔ قدیم یونانی زبان (Ancient Greek) اب بولی نہیں جاتی ہے لیکن قدیم یونانی زبان جدید یونانی زبان (Modern Greek) میں ارتقا پائی جو Republic of Cyprus کی سرکاری اور قومی زبان ہے۔ کہتے ہیں کہ انگریزی زبان کے الفاظ بالخصوص سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کا تقریباً 30 فیصد ذخیرہ کلاسیک یا قدیم یونانی زبان سے مستعار لیا ہوا ہے۔

یونانی حروف تہجی کا استعمال کیمیا، ریاضی، حیاتی کیمیا اور دیگر علوم میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لبلبہ یعنی Pancreas میں دو قسم کے خلیے الفا اور بی ٹا پائے جاتے ہیں۔ بی ٹا خلیے انسولین تیار کرتے ہیں۔ الفا اور بی ٹا یونانی حروف تہجی ہیں۔ اومیگا چکنائی سے مراد دوہرا بند رکھنے والے کاربن سے ہوتی ہے، اومیگا بھی یونانی حرف ہے۔ سہولت کے لیے یونانی حروف تہجی کی فہرست اور ان کا تلفظ پیش کیا گیا ہے۔

اصطلاحوں کی فہرست، Glossary:

کسی مضمون، علم یا فن سے متعلق اصطلاحات یا Terms کی تعریف اور مختصر تشریح کے ساتھ حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی ہوئی فہرست کو Glossary کہتے ہیں۔ لاطینی لفظ glossarium سے گلاسری ماخوذ ہے جس کا اصل منبع gloss بمعنی زبان ہے۔ گلاسری کو Vocabulary یا Clavis بھی کہا جاتا ہے۔

یونانی حروف تہجی

Α α	alpha	الفا	Ν ν	nu	نو
Β β	beta	بی ٹا	Ξ ξ	ksi	زی
Γ γ	gamma	گاما	Ο ο	omicron	اومیکرون
Δ δ	delta	ڈیل ٹا	Π π	pi	پئی
Ε ε	epsilon	اپسیلون	Ρ ρ	rho	رہو
Ζ ζ	zeta	زی ٹا	Σ σς	sigma	سگ ما
Η η	eta	ای ٹا	Τ τ	tau	ٹاؤ
Θ θ	theta	تی ٹا	Υ υ	upsilon	اُپسیلون
Ι ι	iota	یوٹا	Φ φ	phi	فئی
Κ κ	kappa	کاپا	Χ χ	chi	خئی
Λ λ	lambda	لامبڈا	Ψ ψ	psi	سَئی
Μ μ	mu	میو	Ω ω	omega	اُومیگا

گلاسری عموماً مضمون یا کتاب کے آخر میں دی جاتی ہے جس میں استعمال ہونے والے نئے، مشکل اور مخصوص الفاظ کی تعریف اور تشریح کو شامل کیا جاتا ہے۔ گلاسری کے علاوہ Terminology یعنی اصطلاحات سے متعلق کتابیں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔

گلاسری کو اردو میں فرہنگ، شرح، کتاب لغت وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ دیگر زبانوں بشمول اردو زبان کی کتابوں میں انگریزی ٹرمس یعنی اصطلاحات اور ان کا اس زبان میں متبادل فراہم کرنا مضمون، علم یا فن کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

اصطلاح کو سمجھنے کا طریقہ:

بعض ماہرین نے انگریزی اصطلاحوں کو آسانی سے سمجھنے کا طریقہ بتایا ہے۔ ان کے مطابق سب سے پہلے اصطلاح کے اجزا واضح کرلیے جائیں۔ پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ اصطلاح کتنے اجزا سے بنی ہے۔ کسی اصطلاح کے اجزا کو مصدر، سابقہ، لاحقہ، ملانے والے حروف علت میں تقسیم کرکے دیکھا جاتا ہے۔

اصطلاح فہمی کے دوسرے مرحلے میں آخری جز یعنی لاحقہ (Suffix) کے معنی معلوم کریں۔ لاحقہ کے معنی پتہ کرلینے کے بعد سابقہ کے مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔ سب سے آخر میں مصدر کو دیکھنا چاہیے۔ لاحقہ اور سابقہ کے تناظر میں اصطلاح کے معنی اور مفہوم واضح ہوتے ہیں۔ ان اجزا کو ملانے والے حروف کا بھی نوٹ لینا چاہیے۔

اس طریقے پر عمل پیرا ہونے کے باوجود مشکل اور نئے الفاظ کے معنی اور مفہوم جاننے کے لیے لغت یا فرہنگ کی مدد ضروری ہوتی ہے بلکہ بقول شخصے لغت وہ کتاب ہوتی جس کو ہمیں بار بار پڑھنا چاہیے۔

■

Abid Moiz
Consultant, Center for Promotion of Knowledge
MANUU, Hyderbad -500032 (Telangana)

قدوس جاوید

پروین کمار اشک اور غزل کی شعریات

پروین کمار اشک کی شاعری، غزل کی شعریات کی تشکیل جدید سے عبارت ہے۔ غیر مشروط، سادہ اور لطیف روحانیت اور پُر آشوب عصری سماجی وثقافتی صورتِ حال کی زائیدہ پروین کمار اشک کی شاعری، انسان کو وجودی بحران، سیاسی انتشار اور تنظیمی مذاہب کے جبر سے نبرد آزما ہونے کی آگہی بخشتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تہذیبی تکثیریت کے تمام ترتب وتاب کے ساتھ 'جزو' کے 'کل' سے نادیدہ رشتوں سے منور اشک کی غزلیہ شاعری، شعور جسم کی نہیں شعور روح (Soul consciousness) کی ترجمانی کرتی ہے ہزار ہا سال قبل جب آدم اور حوا کا 'شعور جسم' بیدار ہوا تھا تو اس کا نتیجہ ہبوط آدم کا آسمانوں سے آدم اور حوا کے اخراج کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ تب سے انسان 'زمین' پر اپنے کھوئے ہوئے مقام و مرتبے کے حصول کی 'دعا' کر رہا ہے لیکن کوئی اُمید بر نہیں آتی اس لیے بھی کہ 'زمین' مٹی کی یا کا غذی، آج بھی انسان جسم کے اُن تقاضوں سے بلند نہیں ہو پا رہا جن تقاضوں سے آگے روح کے معاملات شروع ہوتے ہیں اور پروین کمار اشک کی شاعری، انسان، انسانی معاشرہ اور ثقافت کے بنیادی وظیفوں کے ساتھ جسم کی بلوغت بالغتگی سے بے نیاز شعور روح کے دروازے پر دستک دیتی شاعری ہے۔ اشک کی غزلیہ شاعری میں زمین اور زمانہ، بندہ اور خدا ایک وحدت میں ڈھل کر مادی اور روحانی بصیرتوں کا چراغاں کرتے ہیں۔ پروین کمار اشک کی شاعری کی یہ ایک ایسی منفرد قوت ہے جو غزل کی مروجہ شعریات کی تشکیل جدید کرتی ہے اور شعر و رشعر غزل سے متعلق عامیانہ فتووں اور مفروضوں کو رد کرتی ہوئی غزل کے معنی ومفہوم، رسومیات اور لسانی، فکری اور شعری امکانات کے نئے دروازے بھی وا کرتی ہے۔

یہ مری روح میں کیسی اذان روشن ہے
زمین چمکتی ہے، کل آسمان روشن ہے

خدا کے فضل سے روشن مری دُعا کا گھر
مری دُعا سے خُدا کا مکان روشن ہے

یا خُدا ! ایسی آنکھ دے ہم کو
کچھ نہ آوے نظر خُدا کے بغیر

سمندر میں کھڑے ہو رو رہے ہو
یہ کیسی میلی چادر دھو رہے ہو
نہ مسجدوں کی طرف ہیں نہ مندروں کی طرف
مری دعائیں ہیں جلتے ہوئے گھروں کی طرف

میں بھی مٹی تو بھی مٹی
جسم سے لے کر روح تلک
میں روز فون پر اس کو صدائیں دیتا ہوں
خدا کے ساتھ مرا رابطہ نہیں ہوتا

پروین کمار اشک نے زبان، زندگی، زمانہ، ذات اور ذہن کی تعمیر وتعبیر میں معاشرہ اور ثقافت کے کردار کو سمجھا اور شعر و ادب میں مابعد جدید فکر کے زائیدہ فلسفہ معنی کی اثر پزیری اور انسان اور انسانیت کے وظیفوں کے ساتھ تخلیق فن کی گہرائیوں کا بھی شعور حاصل کیا اس کے بعد پروین کمار اشک نے جو غزلیں کہیں وہ یقیناً لسانی، فکری اور جمالیاتی ہر اعتبار سے چونکانے والی غزلیں تھیں دُعا زمین میں شامل پروین کمار اشک کی غزلیں عصری اُردو غزل کی شعریات کی تشکیل جدید کی جانب ایک خوش آئند پیش رفت کا حکم رکھتی ہیں۔ پروین کمار اشک کی غزلوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ غزل مخصوص معاشرتی وثقافتی نظام کے اندر منفرد لسانی وشعری رویوں کے ساتھ آزاد اور خود رو افکار و خیالات کو متحد تعبیراتی رشتوں میں پرونے کا فن ہے، غزل کا ہر شعر خود اپنے وجود کا آزاد جواز ضرور رکھتا ہے لیکن غزل کے ہئیتی وفنی لوازمات ورسومیات، نیز زبان، ابہام، اجمال، شعریت اور غنائیت جیسے جمالیاتی محاسن کے حوالے سے، غزل کا ہر شعر دوسرے اشعار کے وجود کی حمایت بھی کرتا ہے، تصدیق بھی، اور توسیع بھی، اور ان سب کے بیچ جو چیز شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے وہ ثقافت ہی ہے۔ پروین کمار اشک نے غزل کو اپنے معاشرہ اور ثقافت کی غیر معمولی بصیرت کی مدد سے ہی برتا ہے۔ اشک نے اپنی غزل گوئی سے متعلق کسی خودستائی یا تعلی کا اظہار تو نہیں کیا ہے لیکن اشک کی نظر میں غزل کا مقام ومرتبہ کیا ہے اس کا اندازہ ان کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

غزل مایوس ہوکر ہر جگہ سے
کھڑی ہے میرے در پہ رو رہی ہے

یا غزل مت اُتارو کاغذ پر
یا کلیجہ نکال رکھا کرو

میں آنسوؤں سے اُگاتا تھا پیڑ خوشبو کے
غزل کے دشت میں مجھ کو بسا دیا اس نے

اشک غزل تحریر ہے دل پر
چاند کا آنسو گرا ہوا ہے

غزل کی چاندنی دروازے کھول دیتی ہے
وہ بند کمرے میں ملبوس جب بدلتا ہے

پروین کمار اشک کو معلوم ہے کہ غزل کی شعریات کی جدید کاری کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غزل کی سابقہ شعریات کو یکسر رد کر دیا جائے کیونکہ سابقہ بنیادوں پر ہی نئے معیار کی تعمیر ہوتی ہے۔ اسی لیے پروین کمار اشک کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں کلاسیکی غزل کی شعریات کی حرارت موجود ہے مثلاً:

کل وہ دریا یہاں تو بہتا تھا
جس میں ہنسوں کا جوڑا رہتا تھا

—

رات کی سسکیاں نہ تھمتی تھیں
چاند کچھ چاندنی سے کہتا تھا

—

ہوا سے عشق کا یہ کیسا کاروبار ہوا
میں پہلے پھول تھا پھر خاک پھر غبار ہوا

—

جو داغ دیکھا جدائی کا چاند میں میں نے
تمام عمر نہ پھر چاندنی سے پیار ہوا

—

لیکن پروین کمار اشک کے اس طرح کے اشعار کلاسیکی غزل کی شعریات کی توسیع تو کرتے ہیں اور تشکیل جدید کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ پروین کمار اشک یہ ذمے داری ایسے اشعار میں نبھاتے ہیں۔

جو سراپا دُعا نہیں ہوتا
ہاں وہ بوڑھا بڑا نہیں ہوتا
جا پڑوسی کے گھر کی آگ بجھا
آگ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا

—

وہ غم کھا کر بھی کیوں روتا نہیں ہے
کسی نے آج تک سوچا نہیں ہے
خُدا کے بندو آؤ مِل کے سوچیں
خُدا بندوں کو کیوں ملتا نہیں ہے
جو دانہ ڈھونڈنے نکلا تھا گھر سے
وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے

—

خُدا کی بے رُخی پر رو رہی ہے
دُعا مجھ سے لپٹ کر رو رہی ہے

—

ہجر زدہ شب جھیل میں میں نے دیکھا اشک
چاند بھی درد کے میلے کپڑے دھوتا ہے

—

جب بھی خالی مکاں میں گھر کرنا
ہو سکے تو مجھے خبر کرنا

—

اب لوگ زمینوں میں محبت نہیں بوتے
اس جنس کا کہتے ہیں خریدار نہیں ہے

—

راہ میں پہلے سمندر آئے گا
میرے بچے پھر تیرا گھر آئے گا

—

جہاں پر سکھوں کے سجدوں کے نشان ہیں
وہ گلیاں خون سے کیوں دھو رہے ہو

—

مسجدِ دل میں تنہا بیٹھے روتے ہیں
ہمیں نماز پڑھانے والا کوئی نہیں
جب سے فوت ہوا ہے بوڑھوں کا کردار
بچوں کو سمجھانے والا کوئی نہیں

—

یہ غم کا بچہ مری اُنگلی چھوڑتا ہی نہیں
کہیں بھی جاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

یہ محض اشعار نہیں نئی ثقافت سے حاصل کردہ نادر و نایاب تجربات ہیں جنھیں پروین کمار اشک نے بڑے خلوص بڑی سچائی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پروین کمار اشک کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں غزل کی زبان کے جامع نظام Langue سے باہر کے روزمرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً:

سفر ریل گاڑی کا طے ہو چکا
دعا والا شہر اشک آیا نہیں
مجھے ٹیکسی والا بلاتا ہے روز
مرے پاس گھر کا کرایا نہیں

—

اس کا گھر بھی ہے نیک بیوی بھی
جانے کیوں ہوٹلوں میں رہتا ہے

پروین کمار اشک نے غزل کی شعریات کی تشکیل جدید کے حوالے سے نئی ثقافت صورتِ حال کی ترجمانی بڑے ہی سادہ، سہل اور معصوم انداز میں کی ہے۔ سیاست، سماجیت اور ثقافت کے بدلتے چہروں کو پروین کمار اشک نے اس طرح پیش کیا ہے۔

کتاب لے کے محبت کی گھر سے نکلا تھا
سیاستوں کا سبق کیسے پڑھ لیا اس نے

—

مرا کردار بھی کر قتل یا رب
مجھے بھی شہر میں جینا سکھا دے

—

آنسو، بادل، دریا سبھی سیاسی ہیں
جلتا شہر بچانے والا کوئی نہیں

—

کئی برسوں سے عرضی زندگی کی گم ہے دفتر میں
کبھی افسر نہیں ہوتا کبھی بابو نہیں آتا

—

کتنے بھاری ہیں بستے بچوں کے
ان میں کچھ پھول ڈال رکھا کرو

—

جسے پیار کیجیے جسے یار کہیے
نگر میں کوئی ایسا چہرا نہیں
مروت کی تجوری بند رکھنا
یہ سکہ شہر میں چلتا نہیں ہے

—

بھیڑ کو چیرنا ہی پڑتا ہے
بھیڑ میں راستہ نہیں ہوتا

ژولیا کرسٹیوا (Juliakristeva) کے مطابق شاعری کے اندر باہر اور آس پاس جو کچھ ہے وہ 'زبان ہی ہے' زبان کا لسانی برتاؤ بھی شاعری کا مقام، مرتبہ اور مزاج متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اسی لیے رولاں بارتھ (Roland Barth) بھی مانتا ہے کہ کسی بھی ادبی متن کے طلسم خانے میں داخل ہونے کا سب سے اہم دروازہ زبان ہے، اور زبان کے لسانی برتاؤ کے معاملے میں پروین کمار اشک نہ تو کسی کی تقلید کرتے ہیں نہ پیروی پھر بھی چونکہ حالیہ شاعری زبان کے حوالے سے ہی سابقہ شاعری سے رشتہ قائم کرتی ہے اور شاعری کے سفرِ مسلسل کا حصہ بنتی ہے البتہ تغیر پذیری اور لچکداری کا حق ہر دور کا شاعر محفوظ رکھتا ہے لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ پروین کمار اشک کی غزلوں کی زبان سادہ بیانی کے حوالے سے میر تقی میر کی غزلوں کی زبان سے قربت رکھتی ہے۔ میر غالباً اُردو کا پہلا شاعر ہے جس نے برصغیر ہند کی معاشرت اور ثقافت اور اُردو زبان کی قواعد اور مزاج کے پیش نظر آتا ہے دوسری جانب ضرورت اور موقع محل کے اعتبار سے فارسی اور عربی تہذیب کی آواز کو بھی اپنے اظہار میں سموتے ہیں۔ مثلاً

مقدور تک شراب سے رکھ انکھڑیوں میں رنگ
یہ چشمک پیالہ ہے ساقی ہوائے گل

—

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

—

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

—

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

عہد میر کی طرح اشک کا رشتہ بھی ایک ایسے دور سے ہی ہے جہاں چہار سو تضاد، فساد، خود غرضی اور عیاری کا دور دورہ ہے معاشرہ اور ثقافت کا پورا نظام رو بہ زوال ہے۔ ایسے میں اشک میر صاحب کے ہی انداز میں کہتے ہیں۔

مرے صحرائے شب میں ایک بھی جگنو نہیں آتا
شعاعِ ماہ کیونکر آئے گی جب تو نہیں آتا

تماشا گاہ میں کس کا تماشا ہوتا ہے
تماش بینوں کو اس کا پتہ نہیں ہوتا

اس نے بھی آنکھوں میں آنسو روک لیے
میں بھی اپنے زخم چھپانے والا تھا

دبائے رکھتا ہوں سینے میں یہ جو شعلہ عشق
اسی سے اشک مرا خاکدان روشن ہے

قبر میں گھر بنا لیا میں نے
ہاں زمیں دار ہو گیا ہوں میں

پروین کمار اشک کا عہد، میر کے عہد سے زیادہ پر آشوب ہے۔ اسی لیے اشک کے یہاں اپنے عہد کا شکوہ کہیں زیادہ شدت کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے کہیں جھنجھلاہٹ، کہیں دُعا اور کہیں نصیحت کے پیرائے میں بے چہرہ کرداروں کے جنگل، اقداری نظام کے زوال، فرقہ وارانہ فسادات، سیاست کی سیاہ کاری، بزرگوں کی بے حسی، نئی نسل کی گمراہی، گاؤں کی گم شدگی، شہروں کا جبر، اور عشق و محبت کے جذبات کی بے حرمتی، کے ساتھ ساتھ انسان دوستی، رواداری، وسیع القلبی اور دور اندیشی کی معنویت جیسے موضوعات کو پروین کمار اشک نے جس انداز میں پیش کیا ہے وہ خالصتاً اشک کا اپنا منفرد اور مخصوص انداز ہے اور ایسے ہی اشعار پروین کمار اشک کے شاعرانہ انفرادو امتیاز کو مستحکم کرتے ہیں۔

زمیں کو اے خدا، وہ زلزلہ دے
نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے
محبت میں بدل جائے سیاست
خدا لاہور دلی سے ملا دے

بس ایک زخم ہے جس کیا چراغ جلتا رہتا ہے
ہمارے شہر میں سورج کہاں نکلتا ہے

آنسو، بادل، دریا سبھی سیاسی ہیں
جلتا شہر بچانے والا کوئی نہیں

دل ملاؤں گا کیا منافق سے
ہاتھ تک بھی نہیں ملاتا ہوں

پھولوں کی آنکھوں میں آنسو رہ گیا
باغ میں بس داغ خوشبو رہ گیا

بہت رویا میں دیواروں سے مل کر
مکاں خالی ہوا جب ساتھ والا

ندی تیرا پانی ہے کیوں بے وفا
شجر بول کیوں تجھ میں سایا نہیں

یوں اگر دیکھیں تو پروین کمار اشک کی شاعری سہل ممتنع کی شاعری ہے اس سادہ سہل زبان کے برتاؤ سے غزل کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ غزل کی شعریات کو بھی بعض ناقدین نے 'تخلیقی زبان' سے مشروط کیا ہے اور تخلیقی زبان کیا ہے؟ اس کی توضیح میں کہا گیا کہ اگر تشبیہ، استعارہ، علامت اور پیکر میں سے کم سے کم دو چیزیں ہوں تو زبان تخلیقی زبان کہلانے کی سزاوار ہو سکتی ہے (فاروقی) لیکن اسے شرط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ولی، سراج، میر، مصحفی سے لے کر محمد علوی، ظفر اقبال، ندا فاضلی کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں ان چاروں میں سے کسی ایک کا بھی گذر نہیں پھر بھی وہ عمدہ اشعار ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ غزل (شاعری) کے ظاہری اجزا زبان، بحر و وزن اور ردیف و قافیہ کے ساتھ ساتھ تشبیہ و استعارہ، علامت اور پیکر وغیرہ بھی ہوتے ہیں جو غزل (شعر) میں موزونیت، مناسبت، صوتی آہنگ، توازن و تناسب، ہم آہنگی اور وحدت پیدا کرتے ہیں۔ یہ عین ممکن کہ کسی نے بحر و وزن، ردیف و قافیہ وغیرہ کو تو نہایت فنی مہارت اور تازہ کاری کی ساتھ برتا ہو لیکن تشبیہ و استعارہ کے استعمال پر زیادہ توجہ نہ دی ہو ایسی حالت میں شعر بحیثیت مجموعی صوری یا ظاہری ساخت کے اعتبار سے بہت زیادہ حسین اور پُر کشش نہ ہو لیکن شعر (شعری فن پارہ) محض اپنے صوری حسن کی وجہ سے ہی حسین اور بیش قیمت نہیں ہوتا (اگر چہ اس کی بھی بڑی اہمیت ہے) بلکہ شعر کے حسین اور بیش قیمت ہونے کے لیے اس کے باطنی اجزا کا حسن ہونا بھی ضروری ہے یہ باطنی اجزا نادر و نایاب فکر و معنی، جذبہ و احساس اور تخیل و تصور وغیرہ ہیں۔ ویسے کلاسیکی غزل (شاعری) کے حوالے سے کہا جاتا رہا ہے کہ تخلیق حسین اسی وقت ہوتی ہے جب اس میں صوری حسن اور معنوی حسن باہم شیر و شکر ہو کر ایک وحدت میں ڈھل کر سامنے آئیں۔ لیکن بعضوں نے جہاں اظہار و بیان کو ہی اہمیت دی ہے وہیں حامدی کاشمیری جیسے ناقدین شعر میں معنی کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ ہیگل کے خیال میں شاعری کے لیے صرف وجدان کافی نہیں۔ وہیں آرنلڈ نے شاعری کے لیے لازمی قرار دیا ہے، ایلیٹ نے شاعری کی بنیاد جذبہ و احساس کو مانا ہے لیکن وہ شاعری میں معنی آفرینی پر بھی زور دیتا ہے۔ والٹر پیٹر نے ادب کی دو اقسام بتائی ہیں۔ اچھا ادب (Good Literature) اور اعلیٰ ادب (Great Literature) اس کے مطابق ''اچھا ادب وہ ہے جو صرف حسن معنی رکھتا ہو مگر اعلیٰ ادب وہی ہو سکتا ہے جس میں حسن صورت کے ساتھ حسن معنی بھی ہو۔ مولانا عبدالرحمٰن دہلوی نے بھی 'مراۃ الشعر' میں لکھا ہے کہ ''شعر میں حسن سے مراد لفظ اور معنی دونوں کا حسن ہے چونکہ شعر الفاظ و معنی کے ''حسن مجسم کا نام ہے اس لیے دونوں کی خوبی سے شعر کا حسن کامل ہوگا۔ اُدھر شکلووسکی (Victor Shklovsk) مکاروسکی اور بورس توماشیوسکی جیسے روسی ہئیت پسندوں نے ادب کی ادبیت (Literareness of Literature) اور اجنبیانے کے عمل Defamiliarisation کے حوالے سے کہا ہے کہ ''شعری زبان اگر چہ لفظ کو قائم بالذات کرتی ہے لیکن اس کو معنی سے جدا نہیں کرتی بلکہ اس کے مختلف مفاہیم امکانات کو اُبھارتی ہے یعنی معنیاتی قوس قزح پیدا کرتی ہے۔ اس طرح عام زبان عام زبان نہیں رہ جاتی'' اس ساری بحث کے تناظر میں پروین کمار اشک کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی غزل بحیثیت مجموعی سادہ اور سہل زبان میں غزل کی ایک نئی داخلی ساخت کی تشکیل کرتی ہے جس میں حسن بیان سے زیادہ حسن معنی شعر کو عظمت و علویت عطا کرتا ہے۔ لیکن پروین کمار اشک کے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں تشبیہ و استعارہ اور علامت و پیکر کا استعمال کمال فنی مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے اشک کی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کا برتاؤ عموماً عالم مادی کے دائروں سے ماورا نظر آتا ہے۔ اشک کے یہاں پھول، مسجد، مندر، پیڑ، سمندر، چڑیا، اذان، صحیفہ، دریا، مٹی، ہوا، شاخ، شجر، خوشبو وغیرہ کلیدی الفاظ ایک مخصوص استعاراتی نظام کو سامنے لاتے ہیں۔ پروین کمار اشک اب ہمارے درمیان نہیں لیکن اُن کی شاعری زندہ رہے گی۔

خالی شاخ پہ کیوں بیٹھا ہے
ایک پرندہ سوچ رہا ہے

■

Prof. A.Q. Jawaid
Baitul-Zehra, 27, Green Hills Colony
Near Govt. Higher
Secondary School, Bhatindi
Jammu - 181152 (J&K)

غزل زمیں کا آسماں
پروین کمار اشک

پریمی رومانی

قبر میں گھر بنا لیا میں نے
ہاں زمیں دار ہوگیا ہوں میں

پروین کمار اشک گذشتہ دنوں مختصر علالت کے بعد انتقال کرگئے۔ وہ نرم اور ملائم لہجے کے شاعر تھے اور اپنے مخصوص انداز سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عشق و محبت کے نغمے بھی گائے اور انسانی قدروں کی پاسداری بھی کی۔ حب الوطنی کے راگ بھی الاپے اور اس عہد کے انسانی کرب کو بھی اپنے اشعار میں زندہ رکھا۔ وہ دور جدید کے اُن شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو اپنے خوبصورت جذبات و احساسات سے مزین کرکے ایک نئی سمت عطا کی۔ اشک نے اپنے متصوفانہ خیالات سے اپنے فن میں تنوع پیدا کیا اور اردو غزل کو ایک نیا وقار عطا کیا۔ ان کے اب تک چار شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جن میں دربدر (1980)، چاندنی کے خطوط (1992)، غزل- تیرے شہر میں اور دعا زمین شامل ہے۔ ان تمام شعری مجموعوں میں اُن کے متنوع رنگ و آہنگ کے شعری تجربے ملتے ہیں۔

پروین کمار اشک پنجاب کے ایک شریف اور معزز پڑھے لکھے خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد بزرگوار کندن ہوشیارپوری اپنے زمانے کے ایک معتبر شاعر تصور کیے جاتے تھے۔ وہ صحافت سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے اور 'جنم بھومی' کے نام سے پٹھان کوٹ سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالتے تھے۔ ان کے معاصرین میں پنڈت ہری چند اختر اور کیف عرفانی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے گھر میں اردو اور فارسی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جہاں ادب نواز لوگ استفادہ کرنے کے لیے آتے تھے۔ کبھی کبھی محفلیں بھی لگتی تھیں۔ ان محفلوں کے اثرات ننھے پروین کمار کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے۔ لیکن 1971 میں جب ان کے والد بزرگوار اچانک انتقال کرگئے تو یہ محفلیں بھی اجڑ گئیں۔ اس وقت اشک کی عمر صرف 20 سال کی تھی۔ اس حادثے نے اُن کے دل کا چین چھین لیا۔ وہ ان جانی ڈگر پر ڈولنے لگے۔ جہاں لاچاری، بے بسی، مایوسی محرومی اور بے چارگی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہوگئے اور گھنٹوں روتے۔ والد بزرگوار چونکہ اپنا ادبی کام نامکمل چھوڑ کر چلے گئے تھے لہٰذا اس کام کی شیرازہ بندی کرنے کے لیے انھیں اردو سیکھنی پڑی۔ وہ مختلف کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کرنے لگے۔ غالب، میر، ذوق، ولی، داغ، اقبال، فراق اور فیض کے ساتھ ساتھ جدید دور کے شعرا کا بھی دلجمعی سے مطالعہ کرنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ شعر بھی کہنے لگے۔

رفتہ رفتہ ان کی شاعری میں پختگی آنے لگی اور وہ بڑی بلیغ باتوں کا اظہار کرنے لگے۔ میرے استفسار پر انھوں نے کہا: ''میرے والد بزرگوار کا جب انتقال ہوگیا تو اس وقت میں طفل مکتب تھا۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے نہ جانے کن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ اس طرح سے مجھے خوداعتمادی کا جذبہ پیدا ہوگیا، جو میرے اشعار میں ڈھل کر تجربات کی شکل میں سامنے آیا۔''

پروین کمار اشک اُن شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی بے پناہ محنت، ریاضت اور صلاحیت سے اردو کے نئے شعرا میں اپنا ایک الگ اور منفرد مقام پیدا کیا۔ ان کی غزل کا مطالعہ کرنے سے قبل ان کے الفاظ، ان کی تراکیب و علائم و استعارات پر غور کرنا لازمی ہے کیونکہ انھوں نے نہ تو فرسودہ خیالات کو اپنی غزل میں جگہ دی اور نہ سنگلاخ زمینوں کا استعمال کیا ہے۔ وہ کبھی تصنع سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنے خیالات صاف اور شیریں الفاظ میں شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ان کی غزل کا جائزہ ایک نئے اور مخصوص انداز میں لیتے ہیں۔ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''اردو غزل کی نئی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی دعوت دینے والے شاعروں میں پروین کمار اشک ممتاز مقام کے حقدار ہیں۔ اُن کی غزل سے معنوی طور پر جو تثلیث ابھری ہے وہ گھر، ماں، اور بچے کی ہے۔ اس تثلیث سے پروین کمار اشک نے اپنا تشخص اور اپنی پہچان قائم کی ہے اور اسی تثلیث سے لاشعوری طور پر اس نے غزل کو نئی زمین دی ہے۔''

اشک جذبے کے شاعر ہیں۔ اُن کے ہاں کوئی بناوٹ نہیں بلکہ وہ نہایت ہی احتیاط سے اپنے خیالات کاغذ پر انڈیلتے ہیں اور اپنی بات خوبصورت انداز میں قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری ایک پہاڑی ندی کی طرح مدھر سنگیت سناتی ہوئی رواں دواں میدانوں میں آکر عجیب قسم کا راگ الاپتی ہے اور سننے والوں کو مسحور کرتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اپنے فکر و فن سے اس صنف سخن کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے جن میں معنی آفرینی بھی ہے اور حسن بھی، تغزل بھی اور درد و کسک بھی، مثلاً:

وہ پیش رو ہے مگر راستا نہیں دیتا
بزرگ ہو کے بھی دیکھو دعا نہیں دیتا
مجھے یہ کیسا سمندر صدائیں دیتا ہے
جو مجھ کو ڈوبنے کا حوصلا نہیں دیتا
کسی کسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی
خدا ہر ایک کو اپنا پتا نہیں دیتا

اُن کی ایک اور غزل ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ کس طرح سے وہ انسان کے درد و کرب کا اظہار کرتے ہیں اور اس کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ اپنی اس غزل میں وہ نہ صرف ایک فرد کی بات کرتے ہیں بلکہ پورے معاشرے اور زندگی کے تلخ حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں، مثلاً:

قبر میں گھر بنا لیا میں نے
ہاں! زمیں دار ہوگیا ہوں میں
سوکھے کھیتوں سے کہہ دو پانی لے لیں
میری آنکھ سے دریا بہتا جاتا ہے
جہاں پرکھوں کے سجدوں کے نشاں ہیں
وہ گلیاں خون سے کیوں رہے ہیں

پروین کمار اشک ایک نئے لہجے کے شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں نئی غزل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ نرم و نازک لہجے میں بات کرنے کے قائل ہیں۔ وہ جہاں چاند، پھول، کھیت، زمین، ساون، برق، آنسو، دریا اور موسم جیسے علائم سے کام لیتے ہیں وہیں روایتی الفاظ اور بندشوں کو بھی خاطر میں لاتے ہیں۔ اسی لیے ان کی غزل میں

معنی آفرینی اور لہجے کا عمق پیدا ہوگیا ہے۔ ناصر شہزاد نے ان کے شعری مجموعے دعاز میں کے سرنامے میں ان باتوں کا اظہار نہایت ہی موثر انداز میں کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''پروین کمار اشک ہندوستان کے اُن چند شعراء میں سے ایک ہے جنھوں نے ادھر اُردو غزل کے جمال کو رو بہ زوال نہیں ہونے دیا۔ پروین کی غزل میں جدید انداز کی نئی نئی جہتیں ہیں۔ غزل میں وہ اپنی بات کی بڑی آسانی اور بڑی کامرانی سے کہہ دیتے ہیں۔''

پروین کمار اشک ایک درویش صفت شاعر ہیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے دور ایک نئی ڈگر پر رواں دواں ہیں جہاں ایک طرف اُن کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ ملتا ہے تو دوسری طرف انھوں نے نئے رجحانات کو بھی خاطر میں لانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی شاعری اپنے نرم اور دھیمے لہجے سے پہچانی جاتی ہے۔ اُن کی مقبولیت کا راز اپنے اسی لہجے میں مضمر ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں گیرائی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ مثلاً کہتے ہیں:

تو نے میری گاگر ریت سے بھر دی میرا دوش تھا کیا
میں تو پانی میں اُترا تھا دریا تیرے کہنے پر
سوکھے باغوں پر ساون کے بادل چھا جاتے تھے اشک
جب ہم روتے تھے سر دکھ کر اک دوجے کے شانے پر

پروین کمار اشک نے اردو غزل کو نئے مزاج سے آشنا کیا ہے اور اپنے الفاظ کے برتاؤ سے اس میں معنی آفرینی کی ہے۔ اس طرح سے انھوں نے اُس روایت کو آگے بڑھایا جس کی بنیاد خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، بشیر بدر، ندا فاضلی، زبیر رضوی، بمل کشن اشک جیسے بڑے قد کے شعرا نے رکھی تھی اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ اشک نے ان تمام شعرا کا مطالعہ دلجمعی کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں گیت کی لوچ پائی جاتی ہے ان کی غزلوں میں احساس کی شدت بھی ہے اور نغمگی بھی، درد و کرب بھی ہے اور عصری آگہی بھی کیونکہ ان میں ہندی اور اردو کا سنگم ملتا ہے۔ ان خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس عہد کے معروف شاعر ساقی فاروقی نے اپنے ایک خط میں اس بات کا اعتراف کیا کہ ''وہ ان کی تازہ کاری اور زبان پر کنٹرول سے بے حد متاثر ہیں۔'' حقیقت تو یہ ہے کہ اشک نے زبان و بیان کی پختگی اور منفرد لہجے سے بطور غزل گو اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اشک کے مطابق غزل جتنی لطیف اور ملائم صنفِ سخن ہے، اتنی ہی یہ سخت جان بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غزل کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اس کو کاغذ پر اتارنے کے لیے شاعر کے پاس تیسری آنکھ ہونی لازمی ہے۔ تب ہی وہ اس فن کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے، کہتے ہیں:

یا غزل مت اُتارو کاغذ پر
یا کلیجہ نکال رکھا کرو

پروین کمار اشک کو اس بات کا علم ہے کہ موجودہ دور کور ذوقی کا دور ہے۔ اس دور میں نہ تو فن کی قدر و قیمت ہے اور نہ فنکار کی۔ غزل کے بارے میں وہ اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ اس نازک صنفِ سخن کے ساتھ اس دور میں کافی ناانصافی ہو رہی ہے بعض شعرا اس فن سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اسی لیے کوئی ایسا بڑا غزل گو شاعر پیدا نہیں ہوتا ہے جو تاریخ شعر و ادب میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کرے۔ دیکھیے وہ اس خیال کو اپنے مخصوص لہجے میں علائم کے ذریعے سے کیسے بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں:

میرے دل کے سفید کاغذ پر
ایک آنسو ہے تو غزل کی طرح
غزل مایوس ہوکر ہر جگہ سے
کھڑی ہے میرے در پر رو رہی ہے

پروین کمار اشک کے موضوعات انسان دوستی، عالمی برادری، حب الوطنی، اور امن و آشتی ہیں۔ وہ خلوص دل سے انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں انسانیت، خلوص و محبت، اور جذبۂ ایثار کے ان گنت رنگ ملتے ہیں جنھیں وہ آسان عام فہم اور سادہ اسلوب بیان سے اپنی شاعری کے توسط سے قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خاص طور پر سرحد ایک ایسا استعارہ ہے جس کے ذریعے سے وہ عالمی برادری اور امن دوستی کا پیغام دیتے ہیں۔ موجودہ دور سیاسی بحران کا دور ہے۔ دنیا میں تناؤ کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ انسان، انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ اس طرح سے عالمی امن میں خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ آئے دن انسانیت سوز حالات رونما ہوتے جا رہے ہیں۔ بے گناہوں کی نہ جانے کتنی جانیں گولیوں کا شکار ہو رہی ہیں اور اس طرح سے عالم انسانیت کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ اشک نے ان تمام واقعات کی عکاسی بڑے دلنشیں انداز سے کی ہے۔ وہ کہیں کہیں ہلکے پھلکے اشاروں کنایوں سے اور کہیں کہیں کھل کر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ آپسی برادری، اخوت اور بھائی چارہ ہی ملکوں کی خوش حالی کی علامت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

زمیں کو اے خدا وہ زلزلہ دے
نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے
محبت میں بدل جائے سیاست
خدا لاہور دلی سے ملا دے
باغ انگور کے چھوڑ آیا تھا سرحد پار جوانی میں
پاگل بوڑھا پل پل کشمکش کرتا رہتا ہے

مہاجر کا مکاں خالی ہے لیکن
میں در کھولوں تو کوئی بددعا دے

اشک کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں گیت نگاری کا رس ٹپکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملائم اور نرم ہندی کے الفاظ اور تراکیب استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ ان گیت نما غزلوں میں احساس کی دقت بھی ہے اور نغمگی بھی، درد و کرب بھی ہے اور عصری آگہی بھی۔ ان کی غزلوں میں ندی، پانی، مانجھی، آنسو، پنچھی، ساجن بادل، دھرتی تتلیاں، سرگم، ریت، ساگر، کنکر، آکاش، ندی، پائل، ڈھولک وغیرہ جیسے ہندی آمیز الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور اردو زبان کے سلیس الفاظ بھی۔ اس طرح سے نئے پیکر وجود پاتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

دل کو پھول بنایا کر پھر درگاہ میں جایا کر
کوئی دعا کا پیڑ لگا ننگے سروں پر سایا کر
تیری خیر اسی میں ہے سب کی خیر منایا کر

تتلی ہاتھ نہ آئے گی بچوں کو سمجھایا کر

ساون میں گھبرا جاتا ہے دل میرا صحرا جاتا ہے
برف کا اک اک آنسو پی کر دریا وجد میں آجاتا ہے
اصل سفر ہے وہاں سے آگے جہاں تلک رستا جاتا ہے

ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پروین کمار اشک ایک پرگو شاعر ہیں۔ ان کے ہاں نئے نئے علامت و پیکر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ زبان سلیس اور رواں استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ انھوں نے پرانی تشبیہات و استعارات کو نئی زبان دے کر اپنی غزل کو تازگی اور توانائی بخشی ہے۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختصر بحور کا انتخاب کر کے بڑے سلیقے سے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا گر جانتے ہیں۔

پروین کمار اشک اخلاق و مروت کے پیکر تھے۔ وہ جس کسی سے بھی ملتے تھے بڑے پیار سے ملتے تھے۔ وہ یاروں کے یار اور دشمنوں کے دوست تھے۔ اکثر صاف اور سلیس اردو زبان میں بات کرنے کے قائل تھے۔ ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اردو زبان کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مشاعروں میں اکثر اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھتے تھے اور قارئین سے خوب داد حاصل کرتے تھے۔ ان کے چلے جانے سے ایک نہ پُر ہونے والا خلا پیدا ہوگیا ہے۔

■

Dr. Premi Roomani
1806-D, Asawari
Nanded City Singhed Road
Pune - 411068 (Maharashtra)
Mob.:09419192978

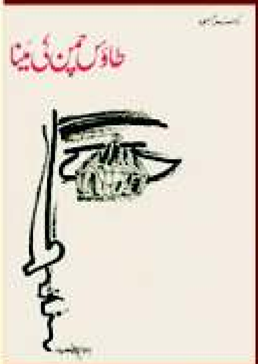

نیر مسعود: جادوئی حقیقتوں کا قصہ گو

قمر صدیقی

جادوئی حقیقتوں کے قصہ گو نیر مسعود 24/ جولائی 1917 کو ہمیشہ ہمیش کے لیے خاموش ہوگئے۔ 1936 میں مرکزِ زبان و ادب لکھنؤ میں پیدا ہونے والے نیر مسعود نے ایک بھری پری زندگی گذاری۔ ادب میں ان کا گھرانہ والد مسعود حسن رضوی ادیب کے حوالے سے ویسے بھی ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس روایت کو نیر مسعود نے بہ حسن خوبی آگے بڑھایا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ تحقیق وتشریح کے میدان میں بھی انھوں نے اپنی فتوحات درج کیں۔ میر انیس کی سوانح، مرثیہ خوانی کا فن، شفاء الدولہ کی سرگزشت، یگانہ احوال و آثار اور تعبیر غالب ان کی تحقیق وتشریح کا ایسا کارنامہ ہیں جو انھیں اس شعبے کا مردِ میداں ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تاہم نیر مسعود کو اصل شہرت افسانہ نگاری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ عطرِ کافور، سیمیا، گنجفہ اور طاؤس چمن کی مینا اُن کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان میں سے طاؤس چمن کی مینا کے لیے انھیں 2001 میں ساہتیہ اکادمی اور 2007 میں سرسوتی سمان سے سرفراز کیا گیا۔

نیر مسعود چونکہ لکھنؤ کے پرانے باشندے تھے اور اپنے عادات واطوار سے کچھ کچھ روایتی بھی لگتے تھے لہٰذا اس بات کی خوب دھوم مچی کہ وہ لکھنؤ کے زوال کا افسانہ لکھتے ہیں۔ ہماری تنقید کی مشکل بھی یہی ہے کہ اپنی تن آسانی کے بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔ وگرنہ نیر مسعود کے افسانوں کی ہمہ گیریت کو محض لکھنؤ تک محدود نہ کیا جاتا بلکہ اُس میں موجود سرّیت اور مابعد الطبیعاتی فضا پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا جاتا۔ نیر مسعود شاید ہمارے پہلے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں ریئلزم اور میجک ریئلزم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ 'شیشہ گھاٹ'، 'عطرِ کافور' اور 'نصرت' جیسے افسانے بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں خواب ناک علامتوں والا یہ اسلوب اپنے پورے شباب پر ہے۔ اُن کی کہانیوں میں سرّیت اور تجریدیت کی فضا کے بین بین علامتوں کے سہارے حقیقت اور معنویت کی فضا بھی برقرار رہتی ہے جو افسانے کے آہنگ کو ذاتی یا مابعد الطبیعاتی ہونے سے بچا کر اس کو ایک کائناتی یا آفاقی احساس میں بدل دیتی ہے۔ مثلاً 'طاؤس چمن کی مینا' میں لکھنؤ بھی ہے، لکھنؤ کا زوال بھی ہے اور زوال کے بعد کا ڈپریشن بھی۔ افسانہ پڑھتے ہوئے قاری ایک غم انگیز تاثر سے ضرور

گذرتا ہے لیکن اس اضمحلال کی کیفیت میں بھی زندگی جینے کا حوصلہ برقرار رہتا ہے۔ نیر مسعود نے اس افسانے کا آخری پیراگراف اس چابکدستی سے لکھا ہے کہ گویا یہ افسانہ ختم ہوکر بھی قاری کے ذہن میں جاری رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"لکھنؤ میں میرا دل نہ لگتا اور ایک مہینے کے اندر بنارس میں آ رہنا، شاون کی لڑائی، سلطان عالم کا کلکتے میں قید ہونا، چھوٹے میاں کا انگریز سے ٹکرانا، لکھنؤ کا تباہ ہونا، قیصر باغ پر گوروں کا دھاوا کرنا، کٹہروں میں بند شاہی جانوروں کا شکار کھیلنا، ایک شیرنی کا اپنے گورے شکاری کو گھائل کرکے بھاگ نکلنا، گوروں کا طیش میں آکر داروغہ نبی بخش کو گولی مارنا، یہ سب دوسرے قصے ہیں اور ان قصوں کے اندر بھی قصے ہیں۔ لیکن طاؤس چمن کی مینا کا قصہ وہیں پر ختم ہوجاتا ہے جہاں ننھی فلک آرا میری گود میں بیٹھ کر اس کے نئے نئے قصے سنانا شروع کرتی ہے۔"

(طاؤس چمن کی مینا۔ از: نیر مسعود، ص 205، عرشیہ پبلی کیشن، نئی دہلی 2013)

اس افسانے میں قصے کے ساتھ تاریخی وتہذیبی عناصر بالکل چپک کر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ افسانے کا راوی یعنی کالے خان تاریخ کی کتابوں میں کہیں موجود نہیں ہے لیکن سلطان عالم یعنی واجد علی شاہ ایک تاریخی فرد ہیں۔ اس کے علاوہ بھی افسانے میں تہذیبی طور پر بہت سے عناصر سلطان عالم کی تاریخیت کو مستحکم کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً حسین آباد کا امام باڑہ، لکھنؤ کی معاشرت میں اس کی اہمیت، نواب نصیر الدین حیدر کا انگریزی دوا خانہ، لکھی دروازہ، قیصر باغ، درشن سنگھ باؤلی وغیرہ تو بالکل سامنے کے وسائل ہیں۔

زندگی کو افسانے میں ڈھالنے کی صلاحیت شاید اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب فن کار زندگی کی تمام تر دشواریوں، تکلیفوں، بوالعجبیوں اور نیرنگیوں سے خود کو ہم آہنگ کرلیتا ہے۔ اُس کا ظاہر و باطن زندگی کے تمام رَسوں سے شرابور ہوجاتا ہے۔ ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ انسان کا ذہنی سفر اس کی عملی زندگی سے زیادہ تیز ہے۔ اس عہد کی تلخ سچائی یہ بھی ہے کہ انسان ایک طرف انسانیت کو خاک وخون سے آلودہ کررہا ہے تو دوسری طرف تہذیب وتمدن اور انسانیت نوازی کے نام پر اپنے انھیں مظالم کا جواز بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے والے فن کار کے لیے یہ صورت حال کسی اگنی پرکشا سے کم نہیں ہوتی۔ ایک ایسی اگنی پرکشا جہاں قدریں راکھ ہورہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں، سسک رہی ہیں۔ اقدار کی اس تشنجی کیفیت نے فن کار کو اس دم توڑتی تہذیب سے محبت کرنا سکھایا۔ لہٰذا نیر مسعود کے افسانوں میں اقدار اور تہذیب سے محبت کا پہلو سب سے روشن ہے۔

نیر مسعود کے افسانے علائم اور ابہام سے مزین ہیں۔ ان کے یہاں علائم کا استعمال برجستہ ہوتا ہے۔ علامتوں کے ذریعے ہی وہ ماضی و حال کے حادثات و واقعات کے درمیان تعلق پیدا کرتے ہیں۔ علامتوں کی اس فراوانی کے باعث ان کے افسانوں میں تخئیل انگیزی اور ماضی سے ارتسام کے نئے امکانات اجاگر ہوتے ہیں۔ وہ قدریں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہوتی جارہی ہیں ان کی بازیافت کے لیے نیر مسعود انسان کی مختلف جبلتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً ان کے افسانوں میں 'خوف' مختلف علائم اختیار کرتا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

"میں دونوں کو الگ نہیں کرسکا۔ وہاں خواہش خوف تھی اور خوف خواہش۔ (افسانہ اوجھل)

"میرا بستر خوف کے ٹھکانے کے عین اوپر ہے۔ خواہش کا ٹھکانہ مجھے اس مکان میں نہیں ملا۔ لیکن یہ ممکن

نہیں اور اب مجھے یقین ہے کہ یہاں خوف اور خواہش کا ایک ہی ٹھکانہ ہے جو میرے تصرف میں ہے۔'' (افسانہ 'اوجھل')

''میں یہ سب دیکھتا تھا اور خود کو خواب کی حالت میں تصور کر کے بیدار ہونے کی امیدیں باندھتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔'' (افسانہ 'نصرت')

''رات کے سناٹے میں جب یہ آواز گونجتی تو میری سمجھ میں کبھی نہ آتا تھا کہ پکارنے والا کون ہے۔ اس آواز میں موت کے خوف کی وہ لرزش ہوتی تھی جو پکارنے والے کی عمر اور جنس چھپائی رہتی تھی۔ (افسانہ 'مار گیر')

''کبھی کبھی اس ڈر کے ختم ہونے کا خیال کر کے مجھ پر کچھ مبہم سی افسردگی طاری ہو جاتی اور میں سوچنے لگتا تھا کہ شاید وہ وقت دور نہیں جب دلہن کی بے جان یاد اور اس یاد کا بے جان خوف دونوں میرے ذہن سے ہمیشہ کے لیے محو ہو جائیں گے۔'' (افسانہ 'بائی کے ماتم دار')

علامتوں سے انسان کا رشتہ خارجی و باطنی ہر دو سطح پر ہے۔ اس میں صرف فکری روہی نہیں بلکہ ایک نوع کی جذباتی حدت بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے انھیں انسانی تجربات و تاثرات کا خزینہ بھی کہا جاتا ہے۔ علائم لطافت و نزاکت اور نکتہ آفرینی کا ایسا منبع ہیں کہ جنھیں اگر سلیقے سے برتا جائے تو فن کی تہہ داری اور وسعت دو چند ہو جاتی ہے۔ نیّر مسعود اردو افسانے میں اس حیثیت سے ممتاز مرتبے کے حامل ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اردو افسانے میں علامتی بیانیے کا ایک نیا در کھولا بلکہ بیان کے ہنر پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے زبان کے تفاعل اور جملوں یا فقروں کی نثری ساخت کو بھی اہمیت دی۔ بیانیہ میں شعری برتاؤ سے شعوری انحراف کرتے ہوئے نیّر مسعود نے افسانوی بیانیہ کو نثری خصوصیات سے متصف کیا۔

ان کے افسانوں میں خواب، سرّیت، خواہش اور احساس کو واضح ترجیح حاصل ہے۔ جبکہ کئی افسانوں میں میجک ریلزم کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ نیّر مسعود کے فن کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی میجک ریلزم کی بنیاد سرّیت پر استوار ہے، جس کی وجہ سے افسانوں میں قاری کو پیچیدگی نظر آتی ہے۔ 'شیشہ گھاٹ'، 'عطرِ کافور'، 'نصرت' اور 'مراسلہ' جیسے افسانے اس کی مثال ہیں۔ ان افسانوں میں بلا کی مطالعہ پذیری (Readability) ہے اور ان کی فنی وقعت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے تاہم یہ افسانے تفہیم کی سطح پر ذرا مشکل ہی سے کھلتے ہیں۔ اس کے برعکس 'طاؤس چمن کی مینا' کی ترسیل عام قاری تک ہو جاتی ہے۔

نیّر مسعود کی اکثر کہانیوں پر تفہیم و تعبیر کی ناکامی کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ امام جعفر صادقؒ کا قول ہے کہ ''افلاطون کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ انسان کی طرف سے جس خیال کا اظہار ہو اس کا خود اس کے یا دوسرے کے لیے مادی طور پر نتیجہ خیز ہونا چاہیے۔ باوجود یہ کہ وہ ایک حکیم انسان تھا لیکن اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوا کہ بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں جو مادی حیثیت سے وقیع نہیں ہوتے لیکن باطنی اور معنوی قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔'' نیّر مسعود کے افسانوں پر تفہیم و تعبیر کے حوالے سے جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں اس کی بنیادی وجہ فن پارے کی تفہیم میں ہماری افلاطونی فکر سے رغبت ہے۔ وگرنہ امام جعفر صادقؒ کے مذکورہ قول کے علاوہ خود ہمارے روزمرہ کے مشاہدات بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ زندگی کے بہت سے محرکات، مذہب و مابعد الطبعیات کے بہت سے نکات اور سائنس کے کئی کرشمات انسانی فہم سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا فن پارہ ہو یا کائنات کا کوئی مظہر تفہیم و تشریح سے زیادہ اہم یہ ہے کہ فن کار چیزوں کو کس طرح دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور ان احساسات کو اپنی تخلیق میں کتنا منتقل کر پاتا ہے۔ اپنے خیالات کو پیش کرتے ہوئے زبان و بیان میں کس درجہ ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

نیّر مسعود پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ان کے افسانوں سے کوئی جواب برآمد نہیں ہوتا بلکہ افسانہ اپنے اختتام پر قاری کے ذہن میں کئی سوالات چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں ممتاز چیک ناول نگار میلان کنڈیرا کا یہ جملہ یاد آ رہا ہے: ''مجھے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ میرا کون سا کردار راستی پر ہے کون سا گمراہ، میں تو بس کہانیاں بُنتا ہوں، کرداروں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر کے سوال پوچھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لوگ بھی کتنے احمق ہیں ہر بات کے لیے ایک جواب چاہتے ہیں۔ ادب میں تو بصیرت سوال اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔''

پہلی نظر میں نیّر مسعود کے افسانے اپنے آپ سے بے پیچ در پیچ الجھے ہوئے شہر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس شہر میں بستے ہیں، وہاں رہنے لگتے ہیں تو اس کی بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح نیّر مسعود کے افسانوں میں بھی اگر ہم سطح سے نیچے اتریں تو کہانی کی بُنت اور واقعات کے تسلسل میں ایک ہنر کاری نظر آتی ہے۔ تجرید و ابہام کے پردوں کے پیچھے ایک بھری پُری کائنات ہے۔ علامت اور استعاروں کی مدد سے پیش کیے گئے زندگی کے پیچ، جبر اور رائیگانی کے احساس کو نیّر مسعود کی کہانیوں میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ 'مراسلہ'، 'گنجفہ'، 'اوجھل' اور 'سلطان مظفر کا واقعہ نویس' جیسے افسانوں میں نیّر مسعود کا یہ اسلوب نمایاں ہے۔ اس تعلق سے محمود ایاز نے لکھا تھا: what eyes see is not all one has to go a little beyonds یعنی اس طرح کے افسانوں میں قاری کے لیے اچھی خاصی پیچیدگی ہے۔ پہلی قرأت میں افسانہ اور قاری کے بیچ کچھ پردے حائل رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود تجسس برقرار رہتا ہے۔ نیّر مسعود کا یہ خاص اسٹائل ہے کہ اگر کہانی ہم پر پوری طرح کھل نہ رہی ہو تب بھی وہ ہمیں پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کافکا اور ایڈگر ایلن پو کی طرح۔

زندگی اور اس کے گھنے پن کا رشتہ نیّر مسعود کے افسانوں سے کچھ اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ہم علیحدہ علیحدہ اس کی تشریح نہیں کر سکتے۔ اول تو ان کی زبان کا طلسم ہے جو قاری کو دیر تک باندھے رکھتا ہے۔ جزئیات نگاری میں بھی انھیں کمال حاصل ہے۔ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں، اہم غیر اہم واقعات، آدھے ادھورے خواب الغرض ان کے افسانوں میں اتنی ہماہمی ہے، اتنا رنگ ہے کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کون سا رنگ پکڑیں، کس کو چھوڑیں؟ اور پھر..... کیا رنگوں کو بھی کوئی پکڑ سکا ہے؟ کیا دھنک کو بھی کسی نے چھو کر دیکھا ہے؟ 'غلام کا بیٹا'، 'جانشین' اور 'بادنما' وغیرہ کہانیاں اس کی مثال ہیں۔ خاص طور سے ''بادنما'' اور ''غلام کا بیٹا'' میں تو اتنا رنگ ہے کہ بعض دفعہ یہ گمان ہوتا ہے کہ پورا افسانہ رنگوں سے بھرا ایک کینوس ہے جس میں زندگی کی نیستی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے بھرے پُرے پن کی رونمائی بھی ہو رہی ہے۔

■

Dr. Qamar Siddiqui
Urdu Channel, 7/3121, Gajanan Colony
Govandi, Mumbai - 400043
Tel.: 09773402060

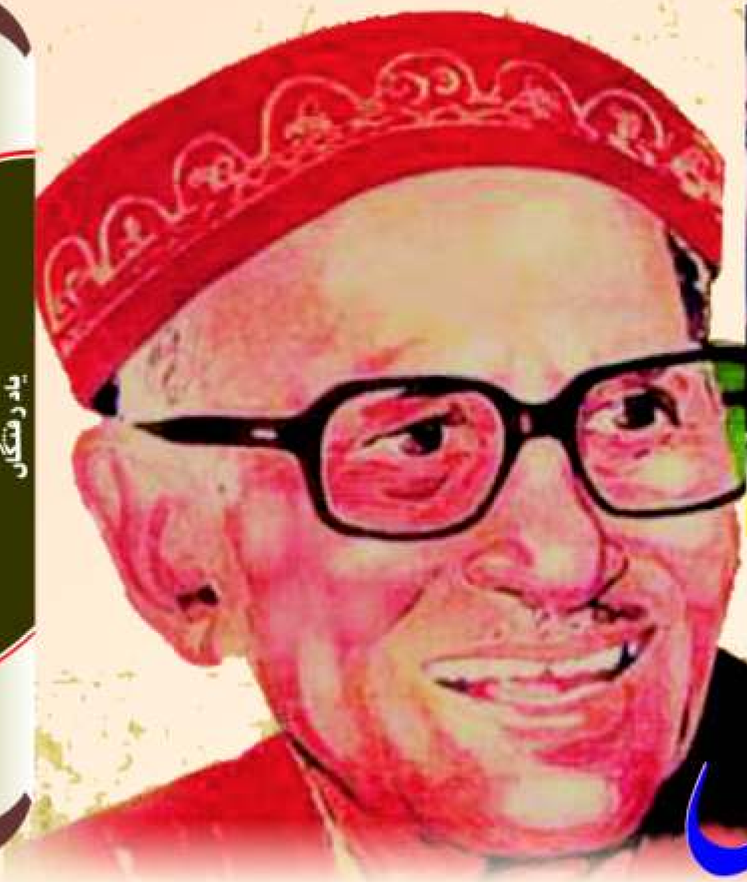

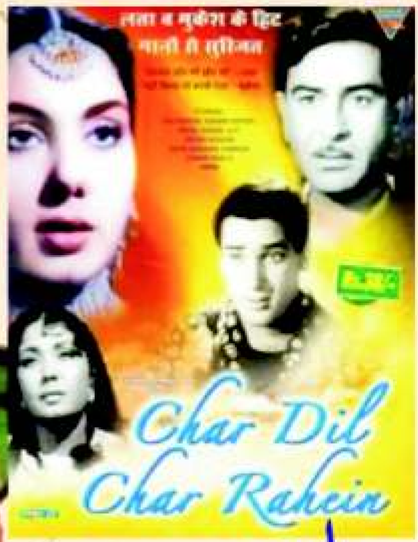

شیخ رحمن اکولوی

خواجہ احمد عباس یادیں

خواجہ صاحب سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب ان کی فلم 'نکسلائٹ' ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم بُری طرح ناکام ہوئی تھی جب کہ اس فلم سے انھوں نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ فلم کے فلاپ ہونے کا ایک سبب بتاتے ہوئے موصوف نے کہا تھا کہ انھوں نے کسی معاملے میں اس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور کانگریس پر بلٹز میں تنقید کر دی تھی جس کے نتیجے میں پہلے تو فلم سنسر بورڈ نے اس فلم کو خوامخواہ روکے رکھا پھر اس قدر کاٹ چھانٹ کے بعد پاس کیا کہ فلم کا ناس ہو گیا۔ اس فلم کی ناکامی نے معاشی طور پر ان کی کمر توڑ دی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا۔ بڑے کربناک انداز میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا: ''کیا نکسلائٹ آپ کے شہر میں لگی تھی؟؟ اگر نہیں لگی ہو تو کسی ٹاکیز والے سے مل کر لگوایئے۔'' ان کی اس بات کے جواب میں میں خاموش رہا۔ ان سے کیسے کہتا نکسلائٹ اکولہ میں لگی تھی اور تیسرے چوتھے دن ہی اتر گئی تھی۔

خواجہ احمد عباس صاحب کو میں ادب کے حوالے سے کم اور فلموں کے رائٹر کی حیثیت سے زیادہ جانتا تھا۔ بطور خاص راج کپور کی فلموں کے حوالے سے۔ میں نے اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ بلا عنوان مطبوعہ اکتوبر 1981 (وور بھ سے شائع ہونے والا طنزیہ و مزاحیہ نثر کا اوّلین مجموعہ) بلٹز ممبئی میں تبصرے کے لیے روانہ کیا۔ خواجہ صاحب نے اپنے کالم 'آزاد قلم' شمارہ 20 مارچ 1982 میں تبصرہ کیا۔ میرے ایک مضمون کا عنوان تھا 'ممبئی قلم کی زد میں' انھوں نے اپنے تبصرہ کو عنوان دیا۔ 'بلا عنوان قلم کی زد میں' انھوں نے لکھا۔ 'ممبئی انقلاب کے اتوار یہ' والے یوسف ناظم صاحب کا رد مقدمہ'' دہلی ملاپ کے 'پیاز کے چھلکے' کے فکر تونسوی (جو خود صف اوّل کے طنز نگار ہیں) کا......؟ (فکر صاحب نے اپنے مضمون کو کوئی عنوان نہیں دیا تھا)

ڈاکٹر مظفر حنفی کی 'بے عنوانی' خواجہ عبدالغفور کی 'بلا عنوان' سفارش محمد ابراہیم نبل کا بھی 'بلا عنوان' قصیدہ ان پانچ ماہرین طنز و مزاح کی مدح سرائی کے بعد ایک 'اخبار چی' کے پاس کیا رہ جاتا ان 'وور بھ' سے شائع ہونے والے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے جو کچھ کہا جا سکتا تھا وہ ان قصیدوں اور مقدموں میں کہہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا میں وہ کہوں گا جو نہیں کہا گیا ہے یعنی اس کتاب کے بعض منفی پہلوؤں سے شروع کروں گا۔ مثلاً:

(1) 'بلا عنوان' اچھا عنوان نہیں ہے۔

(2) سرورق پر جو تصویر بنائی گئی ہے وہ اچھی ہے مگر اس مجموعے کے لیے نامناسب ہے کوئی پھڑکتا ہوا کارٹون ہونا چاہیے تھا۔ جیسے پھڑکتے ہوئے مضامین ہیں اس میں! (یہ تصویر تو کسی جاسوسی ناول پر زیادہ موزوں تھی) اس کے بعد میں اس کتاب کے مثبت پہلوؤں کی طرف آتا ہوں۔ 'ممبئی قلم کی زد میں' اس مجموعے کا سب سے پہلا اور سب سے اچھا مضمون ہے۔ خصوصاً اس کا پہلا ہی جملہ کہ ''ممبئی خوبصورتی اور بدصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا... یہ نمبری شہر ہے......'' ''ریل کی پٹریاں اس کے جسم میں رگوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں'' یہ نہ صرف حقیقت کا اظہار کرتا ہے بلکہ مصنف کے 'مشاہدے' اور حسنِ خیال کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ ایسا ہی ایک جملہ یہ ہے کہ ''ممبئی والوں کے چار روزہ زندگی کے دو دن تو سفر کرنے میں گزر جاتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں'' دریا کو کوزے میں بند کرنا۔''

'چوہوں' پر بات کرتے ہوئے انسانوں کے کردار پر تنقید یہ بھی ایک ماہر طنز و مزاح ہی کا حصہ ہے۔ ''چوہوں کی ہرڈل ریس دیکھ کر آپ کو لطف آجائے گا'' ڈریئے مت۔ یہ چوہے سمجھ دار ہیں کاٹتے نہیں۔ انسان کتنا زہریلا ہوتا ہے اس کی اطلاع انھیں بھی ہے۔ کون بے موت مرنا پسند کرتا ہے اور زہر خوری یا خودکشی تو صرف انسانوں میں عام ہے'' (واہ واہ! کیا انسان کی نام نہاد تہذیب اور تمدن پر کچی مگر کڑوی تنقید ہے بلکہ زہریلی تنقید کہنا چاہیے)

لفظوں کی کفایت شعاری:

یوں تو سب ہی مضامین اچھے ہیں اور اپنے مقصد میں یعنی زندگی کو ایسا مڑا ہوا آئینہ دکھاتے ہیں (جس میں آدمی زیادہ لمبا یا زیادہ موٹا نظر آتا ہے) کامیاب ہیں مگر 'دودھ' کا جواب نہیں۔ خصوصاً یہ جملہ کہ ''دودھ جہاں غذا کا کام کرتا ہے وہیں بہت سے لوگوں کی غذا کا انتظام بھی

کردیتا ہے اس کی غیر موجودگی میں چائے، کافی، آئس کریم، قلفی، فالودہ، لسی، مٹھائیاں بیچنے والوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ دودھ میں پانی ملانے کی بدعت عام ہے جو لوگ ایماندار ہیں۔ وہ دودھ میں پانی نہیں ملاتے پانی میں دودھ ملا کر کام چلاتے ہیں۔"

جو بات ایک معمولی نثر نگار ہزاروں لفظوں میں بیان کرتا وہ ایک طنز و مزاح نگار نے چند لفظوں میں بیان کردی ہے۔ یہ لفظوں کی کفایت شعاری طنز و مزاح کی خصوصیت ہے مگر اکولوی صاحب کو اس میں اور احتیاط و کفایت شعاری کرنی پڑے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کنہیا لال کپور کے انتقال کے بعد ان کی جگہ پر کرنے کے لیے ایک اور طنز و مزاح نگار کی پیدائش اردو ادب کے خاندان میں ہوگئی ہے۔ شادی ہے جس کا نام "اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ اس کا آخری جملہ اس کتاب کی جان ہے" رات ہوتے ہوتے دلہن کو وداع کرنے کا وقت آپہنچتا ہے اس وقت دلہن بہت روتی ہے کیونکہ یہ اس کا آخری 'رونا' ہوتا ہے اس کے بعد ساری عمر دولہا روتا رہتا ہے اور وہ ہنستی رہتی ہے"

خواجہ احمد عباس

21 مارچ 1982 کو لکھا ان کا خط ملا:

آپ کی کتاب 'بلا عنوان' کا ریویو چھپ گیا ہے۔ امید ہے آپ کو ناپسند نہیں آیا ہوگا۔

اس خط سے ان کی اخلاقی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کا نام ادب کے علاوہ فلمی دنیا میں بھی بطور رائٹر پروڈیوسر ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ادب کی طرح انھوں نے اپنی فلموں میں بھی حقیقت پسندی کے رجحان کو اہمیت دی۔ انھوں نے فلم کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش کی اور زندگی کو اس طرح پیش کیا جیسی وہ حقیقت میں ہے۔

خواجہ احمد عباس کی تمام تر توجہ ان مسائل و مصائب پر تھی جن میں ہندوستان کے عام لوگ مبتلا تھے۔ ان لوگوں سے اپنی دردمندی کا اظہار وہ اپنے کالم آزاد قلم، افسانوں، ناولوں اور فلموں میں کرتے رہتے تھے۔ 1946 میں انھوں نے قحطِ بنگال سے متعلق فلم دھرتی کے لال بنائی۔ قحطِ بنگال سے متعلق ستیہ جیت رے کی فلم پاتھر پنچالی کو اولین فلم سمجھا جاتا ہے جب کہ "دھرتی کا لال" اس سے آٹھ برس پہلے ہندوستانی اسکرین پر آگئی تھی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے یہ فلم دیکھی تو رو پڑیں۔ رندھی ہوئی آواز میں مسز نائیڈو نے کہا" میں تو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈروں سے کہوں گی کہ بجائے

1952 میں انھوں نے آسام کے چائے کے باغان میں انگریز مالکان کے ذریعے مزدوروں کے استحصال پر فلم 'راہی' بنائی۔ 1959 میں فلم 'چار دل چار راہیں' بنائی۔ اس فلم کی مرکزی کہانی میں ایک برہمن لڑکی اور امیر لڑکے کی شادی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ 1963 میں فلم 'شہر اور سپنا' بنائی جس کا موضوع ممبئی شہر میں رہائش کا مسئلہ تھا۔ 1972 میں فلم 'دو بوند پانی' میں پینے کے پانی کے مسائل کے ساتھ نچلے طبقے کی زندگی اور سیرت کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ 1980 میں انھوں نے نکسلائٹ فلم بنائی۔

بات چیت میں وقت ضائع کرنے کے بیٹھ کر یہ پکچر دیکھیں جس سے ان کو معلوم ہوگا کہ بنگال کے کال کے مارے ہوئے ہندو مسلمان کیسے رہتے ہیں۔" مگر ہندوستان میں پکچر فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں چل نہ سکی۔ اور بحیثیت رائٹر ڈائرکٹر پروڈیوسر ان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔

1952 میں انھوں نے آسام کے چائے کے باغان میں انگریز مالکان کے ذریعے مزدوروں کے استحصال پر فلم 'راہی' بنائی۔ 1959 میں فلم 'چار دل چار راہیں' بنائی۔ اس فلم کی مرکزی کہانی میں ایک برہمن لڑکی اور امیر لڑکے کی شادی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ 1963 میں فلم 'شہر اور سپنا' بنائی جس کا موضوع ممبئی شہر میں رہائش کا مسئلہ تھا۔ 1972 میں فلم 'دو بوند پانی' میں پینے کے پانی کے مسائل کے ساتھ نچلے طبقے کی زندگی اور سیرت کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ 1980 میں انھوں نے نکسلائٹ فلم بنائی۔

خواجہ صاحب نے جو فلمیں لکھیں وہ کامیاب رہیں جو فلمیں بنائیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ لوگ کہتے "عباس صاحب! آپ دوسروں کے لیے پکچریں لکھتے ہیں تو وہ کامیاب ہوتی ہیں۔ مگر آپ خود اپنی کہانی کو بناتے ہیں تو فیل ہو جاتی ہے" وہ جواب دیتے " وجہ معقول ہے میں راج کپور اور گلزار جیسا کامیاب ڈائرکٹر نہیں ہوں۔ لیکن دراصل وجہ کچھ اور ہے دوسرے ڈائرکٹر گانوں ناچوں اور کامیڈی کا مصالحہ بھر دیتے ہیں۔ اس لیے آوارہ اور شری چار سو بیس کی طرح کی پکچر کامیاب ہو جاتی ہے" خواجہ احمد عباس کے بارے میں شمیم طارق رقم طراز ہیں" خواجہ احمد عباس کی شہرت کا سب سے اہم حوالہ اگرچہ کمیونزم اور ترقی پسند ادبی تحریک ہے۔ جو غلط بھی نہیں ہے مگر ان کی شخصیت فکر اور طرز زندگی کے تعارف کے لیے 'انسانیت دوستی' اور ہندوستان دوستی سے بہتر الفاظ نہیں ہیں۔ "آزاد قلم کے علاوہ اپنی کہانیوں اور فلموں کے ذریعے بھی انھوں نے جو پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ہندوستانی زندگی کا چہرہ اور روح دونوں سموئی ہوئی ہے اس میں ان کے دل کی وہ تڑپ بھی شامل ہے جو مظلوم اور پس ماندہ طبقے کے عوام کو ظلم و استحصال سے نجات دلانا چاہتی ہے مگر اس میں کسی قسم کی نظریاتی شدت یا کسی خاص ازم سے وابستگی کا اظہار نہیں ہے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان سے انسان کی محبت، رنگ، نسل، وطن مذہب یا کسی نظریے سے مشروط نہ ہو۔"

خواجہ صاحب سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب ان کے پیر میں کچھ تکلیف ہوگئی تھی اور وہ غالباً روس سے آپریشن کروا کر لوٹے تھے چلنا تو کجا ان کے لیے پیر زمین پر رکھنا بھی محال تھا۔ نوکر سہارا دے کر لایا دیکھ کر مسکرائے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے ہم نے آگے بڑھ کر ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا مزاج پرسی اور دوسری رسمی گفتگو کے بعد گویا ہوئے 'رحمٰن صاحب' میں دوبارہ انگلی پکڑ کر چلنا سیکھ رہا ہوں" اس ملاقات کے چند مہینوں بعد خبر آئی کہ خواجہ صاحب نہیں رہے اللہ تعالیٰ نے انھیں انگلی پکڑ کر اوپر اٹھا لیا تھا۔ اچھے بچے ہوں یا بوڑھے اللہ میاں کو بھی اچھے لگتے ہیں۔ ہم جب بھی خواجہ احمد عباس سے ملنے جاتے تھے تو ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی چائے وغیرہ لاتی تھی۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ ان کی رشتے دار ہے اور فلموں میں کام کرنے میں Interested ہے۔ آگے چل کر اس لڑکی نے فلموں اور سیریلوں میں اپنی فطری اداکاری سے سب کو چونکا دیا۔ یہی لڑکی نیلیما عظیم آگے چل کر اداکار شاہد کپور کی ماں ہوئیں۔

4 مارچ 1987 کو خواجہ احمد عباس کو دل کا دورہ پڑا یکم جون کو وہ معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ خواجہ عباس کے ذکر کے بغیر ہندوستانی صحافت، ادب اور فلم کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔

■

Dr. Shaikh Rahman Akilvi
Deepak Chowk
Akola - 444006 (MS)

اردو شاعری میں سائنس کی جلوہ نمائیاں

متین اچل پوری

کائنات اور مظاہر کائنات پر غور کریں تو ذہن ایک خلاق اعظم کا تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رب العالمین نے انسان کے قدموں میں زمین کو معجزاتی طور پر بچھا دیا سروں پر آسمان کی نیلگوں چھت آراستہ کر کے اس میں سورج چاند اور ستاروں جیسے عظیم الشان چراغ آویزاں کر دیے۔ آنکھ کے آگے دیدہ زیب رنگ بکھیر دیے اور لذت دہن کے لیے زمین کے دسترخوان پر بے شمار نعمتیں چن دیں اور پھر دم تخلیق خصوصی صلاحیتیں خوابیدہ صورت میں دماغ کو عطا فرمادیں کہ اب انسان تا زندگی اس نعمت عظمیٰ سے کام لے کر علم و ادب، تحقیق و تخلیق اور حکمت و فضل کے میدان میں خدمت خلق اور تسکین قلب کی خاطر امکان بھر جد و جہد کرے۔

سائنس داں بھی اسی عالم رنگ و بو میں سانس لیتا ہے اور شاعر بھی۔ سائنس داں کا قدم بھی اسی کائنات میں اٹھتا ہے اور شاعر کا قلم بھی۔ لیکن دونوں کا ہدف اور نتیجہ سعی و جہد مختلف ہوتے ہیں۔ سائنس داں قطرہ آب میں نہاں برقی توانائی کھینچ کر انسانی بستی کو روشن کرتا ہے۔ شاعر اس قطرہ آب سے اپنی فکر انگیز نگاہ کو شعاع کی مانند گزار کر تسکین قلب و روح کی خاطر ایک دھنک سی نگاہوں کے سامنے آراستہ کر دیتا ہے۔

کون ہے جس کے نین کا موتی میری آنکھ میں اوس
کون ہے جس کی پریت کی خوشبو ساتھ ہزاروں کوس

جمیل الدین عالی

وصف تخلیق سائنسداں اور شاعر دونوں میں مشترک ہے مگر مظاہر تخلیق مختلف۔ سائنس نے زمین کے شکم سے مختلف دھاتیں بھی برآمد کیں اور معدنیات بھی۔ سائنس داں نے پتھر کے کوئلے کی سیاہ چلمنوں میں نہاں روشنی کے ذخیرے کو ابن آدم کے قدموں میں ڈال دیا۔ شاعر نے اس سیاہی کو، اس کالک کو یوں چھوا کہ ایوان سخن روشن ہوگیا۔

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا
چاندی کو چھوئیں تو پایل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں
کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو

سردار جعفری

سائنس داں کا جہان کچھ اور ہوتا ہے اور شاعر کی کائنات کچھ اور ایک کے اطراف عرش و فرش کے بے شمار وسائل ہیں دوسرے کے آس پاس ذات و کائنات کے ہزار ہا مسائل۔ سائنس داں کے تخلیقی سفر کی روداد سے شاعر کے تخلیقی سفر کا افسانہ قطعی مختلف ہے۔ ایک طبعی وسائل و حقائق کے جہان کا صارف ہے۔ دوسرا اوہام و تصورات کے چمنستان کا خوشہ چیں۔ سائنس داں اپنے اطراف و اکناف میں پھیلی دنیا کا سکندر ہے اور شاعر غیر مرئی دنیا کی نت نئی زمینوں پر قلندرانہ شان کے ساتھ قدم رکھتا ہے

ہیم موج امکانی میں
اگلا پاؤں نئے پانی میں

باقی

دھوپ کے لال ہرے ہونٹوں نے ..... تیرے بالوں کو چوما تھا
تیرے عکس کی حیرانی سے ..... بہتا چشمہ ٹھہر گیا تھا
اک رخسار پہ زلف گری تھی ..... اک رخسار پہ چاند کھلا تھا
تھوڑی کے جگ مگ شیشے میں ..... ہونٹوں کا سایہ پڑتا تھا
چندر کرن کی انگلی انگلی ..... ناخن ناخن ہیرا سا تھا
ایک پاؤں میں پھول سی جوتی ..... ایک پاؤں سارا ننگا تھا

پیاسی کونجوں کے جنگل میں　　میں پانی پینے اترا تھا
ہاتھ ابھی تک کانپ رہے　　وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا
آنکھیں اب تک جھانک رہی ہیں　　وہ پانی کتنا گہرا تھا
گہری گہری تیز آنکھوں سے　　وہ پانی مجھے دیکھ رہا تھا
کتنا چپ چپ کتنا گم سم　　وہ پانی باتیں کرتا تھا

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی کی مندرجہ بالا غزل مسلسل کے باب میں شمس الرحمٰن فاروقی یوں رقم طراز ہیں کہ۔ اس کا منظر نامہ کسی سیارے سے آنے والے اسٹروناٹ کی اچانک زمین تک رسائی سے شروع ہوکر انسان کے کشف ذات اور خواب کی طلسماتی فضا کو اپنے گھیرے میں لیتا ہے۔ مرکزی علامت تو پانی ہے لیکن اپنے مخصوص طریقہ کار کے مطابق ناصر کاظمی کا 'میں' جو جنگل میں (جہاں پرندے پیاسے ہیں) پانی پینے اترا ہے۔ ٹھنڈے گہرے چپ چاپ لیکن لفظ پانی کو کئی جہتیں عطا کردیتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس 'میں' کے بغیر پانی شاید محض پانی رہ جاتا۔ نئے تجربات کشف، خوف، غیر مرئی شئے میں مرئی زندگی۔ بے جان بے روح۔ چشمہ حیات (جس سے پیاسی چڑیاں احتراز کرتی ہیں کیونکہ وہ تا ابد زندہ رہنے کے خطرات وعواقب سے آشنا ہیں) کسی غیر انسانی ذہن کا انسانی اور دنیاوی حقائق سے تعارف یہ سب اشارے جو پانی کے تسلسل نے خلق کیے ہیں 'میں' کی معنویت کے بغیر دھندلے یا ادھورے رہ جاتے۔''

یہ 'میں' یعنی شاعر خاک کے تہہ در تہہ پراسرار پردوں میں لپٹی ہوئی شخصیت کا نام ہے اس کے قلم کی کرشمہ سازیاں قاری کو موج استعجاب میں بہالے جاتی ہیں۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

غالب

فراق ایک ہوئے جاتے ہیں زماں و مکاں
تلاش یار میں میں بھی کہاں نکل آیا

فراق

مکاں تبدیل ہوجائے زماں میں
زماں بھی رفتہ رفتہ بے نشاں ہو

عبدالاحد ساز

صبح صادق نمود نوک قلم
رات میری دوات ہوتی ہے

متین اچل پوری

قرآن میں کائنات کے بے شمار حقائق کا ذکر ملتا ہے۔ جدید سائنس ان میں سے کچھ حقائق تک پہنچ سکی ہے۔ چند سائنسی نظریات اور ان سے متعلق شعری نمونے اس طرح ہیں۔

تخلیق کائنات کا نظریہ:

اپنی ہستی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

میر

یہ ارض و سما یہ اوج و پستی کیا ہے
ادراک ضمیر، ہوش و مستی کیا ہے
حرفوں کا فسوں ہے صورت و معانی سب
کن کا لہرا ہے شور ہستی کیا ہے

نور محمد یاس

انسانی ارتقا کا نظریہ۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اقبال

ہوا نے کہا خاک کی ایک مٹھی ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں، موج دریا بڑھی
بولی، میرے لیے ایک تنکا ہے تو
یوں بہادوں گی میں، آتش تند کی
اک لپٹ نے کہا، میں جلا ڈالوں گی
اور زمیں نے کہا، میں نگل جاؤں گی
میں نے چہرے سے اپنے الٹ دی نقاب
اور ہنس کر کہا میں سلیمان ہوں
ابن آدم ہوں میں یعنی انسان ہوں

اختر الایمان

Twin Paradox کا نظریہ۔

چلا ہوں نور کی رفتار سے کہ وہ شہ خوباں
پس ثوابت و سیار گاں کہیں نہ کہیں

مدحت الاختر

کائنات کے عدم وجود Singulalrity کا نظریہ۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لاالہ الااللہ
وہ اپنی لامکانی میں رہیں خوش
مجھے اتنا بتادیں میں کہاں ہوں

اقبال

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا خیال کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

جلیل مانکپوری

نظام شمسی کا نظریہ۔

سکوں جو کائنات میں کہیں نہیں
کہو کہ اب مدار پر زمیں نہیں

شاہد شیدائی

''

کائنات گیسوں اور غبار کا بادل تھا جو ایک بہت بڑے دھماکے کے ساتھ جدا ہوئے۔ اس زبردست انتشار کے نتیجے میں کہکشائیں سورج، چاند، ستارے اور زمین سب کے سب وجود میں آئے۔ اس عظیم الشان تشکیل سے قبل عالم وجود میں کوئی چیز نہیں آئی تھی۔ اس حالت صمدیت کو سائنس داں Singularity اور Nothingness کہتے ہیں۔

''

عبدالاحد ساز نے نظام شمسی کے موضوع کو لے کر بچوں کی دنیا میں جو طویل نظم شائع کی ہے اس میں فطرت کے اس عظیم الشان نظام کو جزیات کے ساتھ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کائنات کے خاتمے (قیامت) کا نظریہ۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

غالب

اک سفر اور ہے سفر کے بعد
بچ کے گزرے کہ اس کا دھیان بھی تھا

کرشن کمار طور

ماہرین فلکیات تخلیق کائنات کے حقائق کو جاننے کے لیے سرگرداں رہے ہیں۔ اسٹیفن ہاکنگ کے مطابق 155 بلین سال پہلے کائنات وجود میں آئی۔ 1927 میں کیتھولک پوپ نے اس نظریے سے اتفاق کیا کہ اس کا آغاز ایک انفجار عظیم کے ساتھ ہوا ہے

Big Bang کا نام دیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ کائنات گیسوں اور غبار کا بادل تھا جو ایک بہت بڑے دھماکے کے ساتھ جدا ہوئے۔ اس زبردست انتشار کے نتیجے میں کہکشائیں سورج، چاند، ستارے اور زمین سب کے سب وجود میں آئے۔ اس عظیم الشان تشکیل سے قبل عالم وجود میں کوئی چیز نہیں آئی تھی۔ اس حالت صمدیت کو سائنس داں Singularity اور Nothingness کہتے ہیں۔ ان حقائق کو قرآن سورۃ انبیا کی آیت 21 میں یوں بیان کرتا ہے ''کیا منکرین حق نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین باہم ملے جلے تھے پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا۔ کیا یہ لوگ پھر بھی یقین نہیں کرتے۔''

نہ کھولنا یہ داستانِ محبت کی کتاب کسی کے سامنے عباس
جس نے سمجھا وہ رہ نہیں پائے گا جو رہ گیا وہ سمجھ نہیں پائے گا

کبھی کبھی مرنے کیلئے زہر کی ضرورت نہیں
حساس انسانوں کو تو رویئے ہی مار دیتے ہیں
موت بڑی اذیت ناک موت ہوتی ہے

اس آیت کریمہ
میں باہم ملے جلے کے لیے 'رتق' کا لفظ آیا ہے۔ جس کے معنی بند کے ہیں اور انھیں جدا کیا کے لیے لفظ 'فتق' آیا ہے جس کے معنی پھاڑنے کھولنے اور الگ کرنے کے ہیں۔ ان حقائق کی توضیح و تشریح کچھ سائنس دانوں نے تفسیر ابن کثیر میں دیکھی تو ہر ایک بے ساختہ پکار اٹھا کہ "I beleave in God , the one ,the unique"

انفجار عظیم کو سائنس داں Big Bang کہتے ہیں۔ قرآن میں اس کے لیے کن کا لفظ ہے۔ مذکورہ بالا رباعی میں شاعر نے بھی کن کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ذیل میں درج شعر کے دوسرے مصرع میں اس مرحلے کی توضیح ملتی ہے۔

احد کی ذات جدا نہیں صفات احمدؐ سے
پھٹا انار تو بکھرے انار کے دانے

سراج اورنگ آبادی

درج ذیل شعر میں کُن کی معجزنمائیوں کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

یہ لفظِ کُن کا انتشار ہے بساطِ نور ہے
دلوں سے کہکشاں تلک جو ارتباطِ نور ہے

متین اچل پوری

مظاہر کائنات کے انتشار کے اس منظرنامے کو جدید شاعر صفوت علی صفوت نے اپنی مثنوی میں جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہی مادہ یہی روشنی یہی سیل وقت کی ابتدا
اسی ایک نقطہ منجمد میں بسا ہے شعلۂ جانفزا
تو یہ ایک روز جو پھٹ پڑا تو لگا کہ جیسے لپیٹ سے
کئی لاکھ دانے نکل پڑے اسی اک انار کے پیٹ سے

یہاں ایک زبردست دھماکے کے ساتھ خلا میں بے شمار کہکشاؤں، ستاروں، سیاروں، چاند، سورج اور زمیں کے انتشار اور پھر ہر ایک کو حکیمانہ انداز سے ایک خاص مقام پر رکھا جانا۔ یہ سارا منظر نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔

Twin Paradox کے نظریہ کے مطابق زمین اور خلا میں وقت کے گزرنے کی رفتار میں بڑی تفریق پائی جاتی ہے Oxford Dictoinary میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

If one of a pair of twins makes a long journey at near the speed of light and then returns,he or she will have aged less than the twin who remains behind

(بیک وقت خلا میں سفر کرنے والے کی عمر زمین پر سفر کرنے والے کی عمر سے کم ہوگی) قرآن حدیث میں معراج کے واقعہ کی تفصیلات اس نظریہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ اقبال نے ادبی چاشنی کے ساتھ اس کی عکاسی کی ہے۔ پاکستانی شاعر خالد عرفان نے رباعیات پر مبنی اپنے مجموعہ کلام 'الہام' میں خصوصی طور پر اسے بیان کیا ہے۔

روز محشر وہی اُمت کے سہارے نکلے
ہم جنھیں بھول گئے تھے وہ ہمارے نکلے
صرف سرکارؐ کو حاصل ہے کمال معراج
کتنے راکٹ تو خلاؤں میں غبارے نکلے
رسول پاکؐ کی سیرت سے روشنی پاکر
تمام چاند ستارے ہمارے جادہ ہیں
جہاز و راکٹ واسکائی لیب و طیارے
براق سرور عالمؐ سے استفادہ ہیں

قصیدہ رحمت للعالمین ﷺ میں سرورعالم کے براق کے ذریعے حیرت انگیز رفتار سے کیے گئے سفرمعراج کی روداد اس طرح بیان کی گئی ہے۔

بچھی جاتی تھی وہ قدموں میں گویا
جو چادر عرش نے تھی سرپہ تانی
قمر بس رات کے ماتھے کی بندیا
ادھر خورشید گویا عود دانی
ستارے رات کے جنگل کے جگنو
زمیں یک نقطہ گویا خاک پانی
بنا مہتاب کوثر کا کٹورا
پڑا جب پرتوِ شاہ زمانی
تصدق آپ پر نور الٰہی
عجوبہ سی خدا کی میز بانی
تجلی میں تھا گم عکس تجلی
بس اب قاصر ہیں الفاظ و معانی

متین اچل پوری

نظام شمسی اس کے سیارے، ان کے مدار اور گردشیں، ستارے، سیارے سب کچھ ماہرین فلکیات کی پر تجسس توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ہر چند کہ شعرائے کرام کے کلام میں بھی ان سب کا ذکر شاعرانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ مگر آدمی کے دکھ درد سے اس کے بے شمار مسائل سے صرف نظر کر کے آفاق کے ویرانوں کا سفر انسانیت کے درد آشنا شاعر کو ایک آنکھ نہیں بھایا ہے۔

جدھر اندھیرا ہے تنہائی ہے اداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی

شہریار

سرابوں میں آب رواں ڈھونڈتے ہیں
کہاں زندگی ہے کہاں ڈھونڈتے ہیں

غلام ربانی تاباں

آسماں گیری کہاں، ذرے کہاں
کن ہواؤں میں غبار اڑنے لگا

نور محمد یاس

آج ہمارے گلوبل ولیج میں ایک ہی موسم پایا جاتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا موسم، سائنسی مانسون سے زمین خرد خوب خوب سیراب وشاداب ہورہی ہے۔ ہر شے عقل کی کسوٹی پر پرکھی جارہی ہے بڑے بھی ہوشیار ہوچکے ہیں اور بچے بھی چالاک۔

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہوگئے

پروین شاکر

لہٰذا پلوٹو جو نظام شمسی کے نو سیاروں میں سے ایک سیارہ شمار کیا جاتا تھا۔ جدید خلائی نظریہ کے تحت اسے سورج کے خاندان سے باہر کی چیز قرار دیا گیا ہے۔ گلزار نے اس صورت حال کی تصویرکشی اپنے انوکھے انداز میں اس طرح کی ہے۔

سیکڑوں بار گنے تھے میں نے
جیب میں نو ہی کنچے تھے
ایک جیب سے دوسری جیب میں رکھتے رکھتے
ایک کنچا کھو بیٹھا ہوں
نہ ہارا نہ گرا کہیں پر
پلوٹو میرے آسمان سے غائب ہے۔

نومبر 2014 میں جاپان کے سائنس دانوں کے ایک دلچسپ اور انوکھے اعلان نے دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ جاپان 2030 تک ایک ایسا شہر زیر آب بسائے گا جس میں 5 ہزار لوگ زندگی کی تمام تر سہولیات کے ساتھ رہائش اختیار کرسکیں گے۔ ماہنامہ شاعر ممبئی کے ستمبر 2006 کے شمارے میں مطبوعہ غزل کے ایک شعر میں اس زیرِ آب دنیا Mini World کی نشاندہی کی گئی ہے۔

سوچ بھی نہ سکتے تھے سطح دیکھنے والے
اک حسین تر دنیا زیرِ آب نکلے گی

نور محمد یاس

وہ سائنس جو آبی ویرانے میں نئی دنیا بسانے کے منصوبے بنا رہی ہے۔اس کی کرشمہ ساز ایجادات نے ماضی بعید میں ہیروشیما اور ناگا ساکی، اور ماضی قریب میں غزہ اور دیگر متعدد گنجان آباد شہروں کو ویرانوں میں بدل کر رکھ دیا۔ان ہلاکت خیزیوں کی ترجمانی اردو شاعری میں جا بہ جا ملتی ہے۔

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے

ساحر لدھیانوی

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اقبال

جنگ دھرتی پہ ستاروں کے لیے جاری ہے
حیف صد حیف کہ ہر شے پہ جنوں طاری ہے
بستیاں دور خلاؤں میں بسانے کی لگن
جنگ در جنگ سلگتے ہیں صداؤں کے محل

چندر بھان خیال

آج سائنسی ایجادات کے غلط استعمال نے عالم انسانیت کو جہنم کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔وقت مٹھی میں دبی ریت کی طرح اپنی دسترس سے متواتر چھوٹتا چلا ہے۔بیچاری مجبور بے بس زمین نہ جانے کب لقمۂ اجل بن جائے۔

ایک ننھی چڑیا نے
توپ کے دہانے میں
گھونسلا بنایا ہے

محمد علوی

تباہ کن ہتھیاروں کے حصاروں سے مظلوم انسانیت کو محفوظ نکال لانے کے لیے شاخِ گلشن کو پھولوں سے نہیں کانٹوں سے کام لینا ہوتا ہے۔ایسے نازک موقعوں پر بھی شعراء کے کلام میں سائنسی اصولوں کی جلوہ نمائیاں الگ انداز سے کارِ خیر انجام دیتی نظر آتی ہیں۔

ایک بھی پھول کھلایا ہے جہاں فطرت نے
انگنت کانٹوں کو نگرانی پہ رکھا ہوا ہے

مظفر حنفی

حل ہوئے ہیں مسئلے شبنم مزاجی بہت
گتھیاں ایسی بھی کچھ ہیں جن کو سلجھاتی ہے آگ

حفیظ میرٹھی

گلوبل وارمنگ: ماحول کا تحفظ آج ایک نہایت ہی سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ برق پا زمانے کی رفتار کے سبب پیدا شدہ گلوبل وارمنگ کا مسئلہ ناقابل حل نظر آتا ہے۔ اس انتہائی تشویش ناک صورت حال کے پیش نظر راقم الحروف کی نظم گلوبل وارمنگ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

رام، محمد، ڈیسوزا گڈ مارننگ
مجھ کو کہتے ہیں گلوبل وارمنگ
آگ پانی میں لگا دیتی ہوں میں
خون کو پانی بنا دیتی ہوں میں
مجھ کو پہنچایا گیا ہے بام پر
دن مری مٹھی میں، قبضہ شام پر
ساری ہریالی نشانے پر مرے
یعنی خوشحالی نشانے پر مرے

سائنس جہاں زحمت کا سبب بنی ہے وہیں باعث رحمت بھی ثابت ہوئی ہے اس نے انسان کے دل و جگر پر گہرے زخم لگائے ساتھ ہی زہر سے تریاق پیدا کرکے اور پنسلین جیسی زود اثر دوائیاں اور مجرب مرہم مہیا کر کے انسان کو زخموں سے نجات بھی دلائی ہے۔اردو شاعری بھی مرہم کانعم البدل بنی ہے۔

اے مظفر بزم میں تیری غزل
جیسے کوئی نرس بیماروں کے بیچ

مظفر حنفی

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بر دوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر

سردار جعفری

کوئی بجلی اس خرابے میں گھٹا روشن کرے
اے اندھیری بستیو تم کو خدا روشن کرے

عرفان صدیقی

سائنس داں اور شاعر دونوں تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں، یہ پھولوں سے عطر کشید کرنے کے عمل سے واقف ہے تو وہ خوشبو کو چٹکی میں پکڑنے کا ہنر جانتا ہے۔ بظاہر دونوں کے درمیان طول طویل فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔مگر جہاں جہاں یہ زمین آسماں ملے ہیں شاعری کے افق پر سائنس کی جلوہ نمائیاں دل آویز بھی ہوئی ہیں اور معنی خیز بھی۔

■

Mateen Achalpuri
Bayabani, Achalpur - 444806
Distt.: Amrawati (Maharashtra)

تدوین کے اصول ومباحث

ظہیر حسن ظہیر

تدوین کے لغوی معنی تالیف کرنا، مرتب کرنا یا ترتیب دینا ہے۔ تدوین کا براہ راست تعلق تحقیق سے ہوتا ہے، اس لیے تدوین تحقیق کا ایک اہم اور مستقل موضوع ہے۔ تدوین کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ آداب تحقیق اور اصول تحقیق سے بھی پوری طرح واقف ہو، کیونکہ اس کے بغیر صحیح تدوین ممکن نہیں، تدوین کے لیے حواشی، مقدمہ، متن کا زمانۂ تصنیف، مصنف اور اس کے عہد سے متعلق ضروری معلومات، داخلی شواہد کا تعین اور ایسی بہت سی متعلقہ باتیں ضروری ہوتی ہیں، اس لیے تحقیق کے فن سے آشنائی کے اور اس سے طبعی مناسبت کے بنا تدوین کا کام مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ جو شخص تحقیقی مزاج نہیں رکھتا وہ تدوین کا کام بھی انجام نہیں دے سکتا، تحقیق و تدوین لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تدوین کی ضرورت اور اہمیت ہر دور اور ہر زمانے میں رہی ہے، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی، اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ تحقیق کی طرح تدوین کے بھی مخصوص اصول، ضابطے، آداب اور مسائل ہوتے ہیں۔ تحقیق کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن اب عام طور سے یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ قدیم متون کو اصول تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب کیے بغیر نہ بہتر تحقیق کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تحقیق کی بہت سی گتھیوں کو صحیح طور سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں لسانی مباحث کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی ہے، کیونکہ اب لسانیات کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جس سے محققین کی توجہ لسانی جائزوں کی طرف بڑھنے لگی ہے اور قدیم متون کی تصحیح کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے۔ صحیح لسانی جائزوں کے لیے صحیح متون کا ہونا لازم ہے، ورنہ غلط اندیشیوں کا سلسلہ بڑھتا ہی جائے گا، اردو میں لسانیات اور صوتیات کے فروغ نے تدوین کی اہمیت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت وافادیت میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں ایک جدید مفصل لغت کی کمی کا احساس بھی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے، اور یہ بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ صوفیا کے ملفوظات، قدیم مخطوطات، سودا، میر، میر حسن اور میر انیس جیسے اہم شعرا کے دواوین اور اسی طرح نثری تصانیف کو بہتر طریقے پر مدون نہیں کیا گیا تو ایک جدید مفصل لغت کی تیاری نہیں ہو سکے گی، یہی صورت صرفی اور نحوی مباحث کی بھی ہے۔ صحیح متون کی تدوین نہ ہونے کے باعث مباحث کے سلسلے میں کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے، یہی حال تذکیرو تانیث اور متروکات کی بحثوں کے ساتھ ساتھ قواعد وغیرہ کا بھی ہے۔

تحقیق کے فروغ وارتقا کے لیے مستند نسخوں کو ماخذ بنانا لازمی ہوتا ہے۔ اس احساس نے بھی صحت متن کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے، اور یہ عام احساس پیدا کر دیا ہے کہ محض یادداشت اور سماعت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، یا کسی بھی سہل الحصول ثانوی ماخذ سے عبارتوں کو نقل کر دینے سے اب کام چلنے والا نہیں ہے۔ تحقیق کے فروغ نے جہاں ادب وشاعری کے معیار و وقار کو بڑھایا ہے۔ اب یہ ضروری سمجھا جانے لگا ہے کہ کوئی بھی شعر و نظم ہو یا عبارت ومضمون اس کو معتبر ترین ماخذ سے منقول ہونا

چاہیے جس سے ماخذ کی حقیقی اہمیت نمایاں ہو سکے، اگر حوالہ اصل ماخذ سے منقول نہیں ہے تو پیش کرنے والا شخص چاہے جتنا بھی معروف ومقبول ہو یا اہم شخصیت کا حامل ہو اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ آج کے سائنٹفک دور یا عہد میں شخص کے بجائے مواد و ماخذ کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ معروف محقق رشید حسن خاں اس ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''شخص کی طرح ذوق کا مسئلہ بھی بہت اہم رہا ہے، جس چیز کو ذوق کہا جاتا ہے اور جو پسند و ناپسند کے ذاتی معیار کا دوسرا نام ہے، اس کی کارفرمائی کا دائرہ وسیع رہا ہے، خصوصاً شاعری میں یہ شاید سب سے زیادہ پریشان کن چیز رہی ہے، تدوین و تحقیق کے سلسلے میں انسانی ذہن کچھ اس طرح ایمان لے آتا ہے اپنے ذوق اور اپنی یادداشت پر کہ چھان بین کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ مفروضہ پسندیدہ شکل کے خلاف کچھ کہا جائے تو ذہن اس کو قبول کرنے کی طرف بہ آسانی مائل نہیں ہو پاتا۔ اس کے اثرات ہماری کتابوں میں اور مضامین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اشعار کے متن میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان میں سے اکثر اسی فریب خوش مذاقی کا کرشمہ ہیں......... تدوین کو تقاضائے خوش مذاقی سے علاقہ نہیں، کتنا ہی بڑا شخص کیسے ہی پر زور انداز سے ذوق سخن یا خوش مذاقی کی وکالت کرے، یا اس کی رعایت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے، لیکن اس کی اس خوش گفتاری کو کسی بھی طرح قابل قبول نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اب سے پہلے اس بات کو اس صفائی اور قطعیت کے ساتھ تسلیم نہیں کرایا جاسکتا تھا، اور اب شخص یا ذوق، دونوں کی تنقید میں نہ جھجک محسوس ہوتی ہے، نہ تکلف ہوتا ہے اور نہ اس کو خلاف وضعداری یا خلاف حد ادب سمجھا جاتا ہے''[1]

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ تحقیق میں جو غلط بیانیاں ماضی میں داخل ہوئی ہیں وہ اصل میں صحیح متون کی کمی اور ثانوی ذرائع پر ضرورت سے زیادہ انحصار کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے کسی محدود دائرے میں وقتی طور پر تھوڑی بہت کامیابی تو حاصل ہو سکتی ہے، لیکن کوئی اہم اور نمایاں کامیابی مشکل ہوتی ہے۔

تحقیق میں کبھی کبھی ایسے مسائل بھی سامنے آتے ہیں کہ اصل مراجع اور مصادر تک رسائی ناممکن بن جاتی ہے تو ایسی صورت میں مجبوراً ثانوی ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے اصل ماخذ کا حوالہ نہ دینے کی وجہ سے جو پیچیدگیاں، گمراہیاں اور غلط فہمیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے وہ بڑا تباہ کن ہے، جیسا کہ پروفیسر حنیف نقوی

''

تدوین کو عموماً لوگ آسان کام سمجھتے ہیں، جبکہ یہ نہایت دشوار عمل ہے، تدوین سے کہیں زیادہ مشکل اس کی شرائط ہیں، جیسے تدوین کا طریقہ کیا ہے؟ صحت متن کا مفہوم کیا ہے؟ اختلاف نسخ کا مطلب کیا ہے؟ اور ایسے ہی دوسرے متعلقات بھی ہیں، جن کا جاننا از حد ضروری ہے۔ زبان، قواعد زبان اور قواعد شاعری وغیرہ سے واقفیت ضروری ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی دسترس کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

''

صاحب نے اپنی کتاب 'تحقیق و تدوین مسائل اور مباحث' میں نقل کیا ہے:

''فتح علی گردیزی نے 'تذکرۂ ریختہ گویاں' میں اکثر شعرا کا کلام میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' سے نقل کرلیا ہے، لیکن اس کا حوالہ ایک جگہ بھی نہیں دیا ہے۔ اس بالواسطہ انتخاب کے ذریعے پیش کیے ہوئے اشعار میں شاہ حاتم کے نام سے پیش کردہ یہ شعر بھی شامل ہے۔

مبتلا آتشک میں ہوں میں اب
آگے آیا مرے کیا ہوا

اس شعر کا مصرع اول حاتم کا نہیں ہے، اس کا اصل مصرع ہے 'ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا' میر نے اس شعر کو اس کے اصل متن کے مطابق نقل کرنے کے بعد استہزائی انداز میں لکھا ہے کہ ''اگر شعر من بود، ایں چنیں من گفتم'' اور اگلی سطر میں شعر کی وہ صورت پیش کی ہے جو گردیزی کے یہاں منقول ہے۔ گردیزی میر کا خوشہ چیں ہے لیکن وہ اس کا اقرار نہیں کرتا۔ یہ شعر اگر ایک طرف اہل نظر کے لیے 'تذکرہ میر' سے اس کی خوشہ چینی کا ثبوت فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف عام قارئین کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے کہ حاتم کے اصل شعر کی اصل صورت یہی ہے۔''[2]

مذکورہ اقتباس میں پروفیسر حنیف نقوی صاحب (مرحوم) نے ثانوی ماخذوں کے انحصار سے ہونے والی جن غلطیوں کے خدشے کا اظہار کیا ہے وہ بالکل درست ہے، اور ایسا بار بار دیکھنے میں آیا ہے اور انھوں نے بھی میر کے تذکرہ 'نکات الشعرا' اور شاہ حاتم کے مذکورہ شعر سے جو دلیل دی ہے وہ بڑی جامع اور قابل غور ہے۔ ایسی ہی ایک بھیانک غلطی کا انکشاف موصوف نے مزید کیا ہے، ملاحظہ ہو:

''پروفیسر محمد حسن نے 'دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر' میں 'مفتاح التواریخ' مصنفہ طامس ولیم بیل کو بربنائے غلط فہمی منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کی تصنیف قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے سے امیر خاں انجام سے متعلق بعض واقعات نقل کیے ہیں۔ پروفیسر فضل الحق نے 'دیوان تاجی' کے مقدمے میں ان تمام واقعات کو براہ راست تسلیم کے بیانات کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے نہ 'مفتاح التواریخ' کا نام لیا ہے نہ پروفیسر محمد حسن کا حوالہ دینے کی ضرورت محسوس کی ہے، ثانوی ماخذ پر انحصار کے نتیجے میں غلطی کے ارتکاب کی یہ ایک عبرتناک مثال ہے۔''[3]

محقق چاہے نیا ہو یا تجربہ کار، کسی یونیورسٹی کا ریسرچ اسکالر ہو یا کسی اہم تحقیقی ادارے کا روح رواں، اس کے لیے تحقیق و تدوین کے فرق کا سمجھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے، لیکن مجبوری یہ ہے کہ تحقیق کے مسائل، آداب، اصول اور طریقۂ کار پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن یہ ناقابل تردید سچائی ہے کہ اردو زبان و ادب میں تدوین کے مسائل، ضابطے اور طریقۂ کار کے معلومات کی آج بھی کمی ہے۔

تدوین کو عموماً لوگ آسان کام سمجھتے ہیں، جبکہ یہ نہایت دشوار عمل ہے، تدوین سے کہیں زیادہ مشکل اس کی شرائط ہیں، جیسے تدوین کا طریقہ کیا ہے؟ صحت متن کا مفہوم کیا ہے؟ اختلاف نسخ کا مطلب کیا ہے؟ اور ایسے ہی دوسرے متعلقات بھی ہیں، جن کا جاننا از حد ضروری ہے۔ زبان، قواعد زبان اور قواعد شاعری وغیرہ سے واقفیت ضروری ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی دسترس کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

اردو زبان میں متن اس تحریر کو کہتے ہیں جسے محقق ترتیب دینا چاہتا ہے، وہ نثر و نظم ہو یا غیر تخلیقی ادب پارہ یا کسی کتاب کا نسخہ...... تدوین متن مختلف نسخوں یا کسی ایک نسخے کا مطالعہ کر کے اصل متن کی دوبارہ تشکیل کو کہتے ہیں، اسی طرح متنی تنقید کا کام مخطوطات کی داخلی کیفیات کی شہادت پر مصنف کے متن تک پہنچنے کی کوشش کا نام ہے، اردو میں تدوین متن سے زیادہ رائج اور مقبول اصطلاح ترتیب متن ہے اور تدوین و ترتیب متن دونوں تقریباً ہم معنی ہیں، کیوں کہ تدوین کے معنی متفرق اجزا کو اکٹھا کر کے اس کی شیرازہ بندی کرنا اور معتبر ترین نسخے سے

> تدوین کا کام بڑا ذمہ دارانہ کام ہے ،اور اردو میں عموماًتدوین کے لیے منظومات میں زیادہ تر دیوان و کلیات اور کوئی طویل مثنوی وغیرہ آتی ہیں۔نثر میں داستان یا تذکرہ وغیرہ آتے ہیں۔تدوین متن کے لیے اس عہد کی زبان، متروک الفاظ، تلفظ، رسم خط اور املا وغیرہ کی واقفیت بھی ضروری ہے ۔اگر متن دکنی ادب سے تعلق رکھتا ہے تو دکنی الفاظ، ان کے معنی و مفہوم، املا اور رسم خط کی بعض علاقائی خصوصیات پر بھی نظر ہونی چاہیے، مخطوطات اور مطبوعات کی تدوین کے اصول بھی قدرے مختلف ہوتے ہیں۔

استفادہ کر کے اس کی تدوین کرنا ہے، جب کہ ترتیب متن کے معنی کسی ادب پارے کے اجزا کو تقدیم و تاخیر سے پیش کرنا ہے۔ تدوین متن پوری کتاب کا موضوع ہوتا ہے، اور بقول رشید حسن خاں ''تدوین تحقیق سے جدا نہیں، یہ تحقیق ہی کی ایک شاخ ہے، اسی لیے انھیں صلاحیتوں اور ذہنی رجحان کی ضرورت ہوتی ہے جو تحقیق کے لیے درکار ہیں''متون کی بہترین تدوین ایک اچھا محقق ہی کر سکتا ہے، اور مدون کے اندر بھی تقریباً انھیں اوصاف کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو محققین میں پائے جاتے ہیں، کیونکہ عام طور سے قدیم متون کی ہی تدوین کی جاتی ہے، اس لیے اس کام کو وہی شخص بہتر طور پر کر سکتا ہے جسے قدیم ادب سے دلچسپی ہو، نیز مخطوطات اور مطبوعات کا مطالعہ بھی وسیع ہو، چونکہ پرانے ادیبوں سے متعلق حالات زیادہ تر فارسی تذکروں اور تاریخوں میں ملتے ہیں، اس لیے بھی مدون کو فارسی زبان کی جانکاری ضروری ہے۔ چنانچہ پروفیسر گیان چند جین نے بھی اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' میں تحریر فرمایا ہے:

''جس مصنف کے متن کی تدوین کی جائے پہلے اس کے بارے میں جملہ مواد سے آگہی بہم پہنچا لینی چاہیے۔ مصنف کی جملہ تحریروں کو دیکھے اور اس سے متعلق جو کتابیں اور مضامین ملتے ہیں انھیں پڑھ جائیے، پھر مصنف کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیے، اس دور کے تاریخی اور سماجی ماحول کو گرفت میں لائیے، اس دور کے معاصر اردو ادب نیز ماقبل ادب پر بھی آپ کی نظر ہونی چاہیے''[4]

تدوین کا کام بڑا ذمہ دارانہ کام ہے، اور اردو میں عموماً تدوین کے لیے منظومات میں زیادہ تر دیوان و کلیات اور کوئی طویل مثنوی وغیرہ آتی ہیں۔ نثر میں داستان یا تذکرہ وغیرہ آتے ہیں۔ تدوین متن کے لیے اس عہد کی زبان، متروک الفاظ، تلفظ، رسم خط اور املا وغیرہ کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ اگر متن دکنی ادب سے تعلق رکھتا ہے تو دکنی الفاظ، ان کے معنی و مفہوم، املا اور رسم خط کی بعض علاقائی خصوصیات پر بھی نظر ہونی چاہیے، مخطوطات اور مطبوعات کی تدوین کے اصول بھی قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطبوعات کے ہر اڈیشن ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، جب کہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا خطی نسخہ عموماً یکساں ہوتا ہے۔ کسی کتاب کی تدوین کے لیے اس کے جملہ قلمی اور مطبوعہ نسخے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اگرچہ یہ کافی مشکل عمل ہے پھر بھی جہاں تک ممکن ہو سکے اہم نسخوں کی مدد لینا کافی ہوتا ہے، اہم اور غیر اہم نسخوں کی شناخت کے لیے براہ راست مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔

جہاں تک مخطوطات کی بات ہے اردو میں مخطوطات کی وضاحتی فہرست کم ہی دستیاب ہو پاتی ہیں۔ فہرستوں کو دیکھ کر اس موضوع سے متعلق تحقیقی کتابیں پڑھ کر نیز بڑے کتب خانوں میں جا کر اہم مخطوطات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو میں علم و آگہی کے تبادلے کا رواج کم ہے اس لیے کم کتب خانے دوسرے کتب خانوں کو اپنے مخطوطات مستعار دیتے ہیں، اور مخطوطے کے عکس بھی کم ہی مل پاتے ہیں، جب کہ مغرب میں اس کے بالکل برعکس ہے، جس سے ابھی بہت سے اہم نسخے بہت سی لائبریریوں، کتب خانوں اور لوگوں کی نجی ملکیت میں پڑے ہوئے ہیں جن تک محققین کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔

عام طور سے مخطوطوں میں دو قسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں، ہیئتی اور معنوی۔ ہیئتی میں کاتب کی غلطیاں آتی ہیں اور معنوی سہو قرأت وغیرہ۔ اردو میں بہت سے حروف کا تعین نقطوں کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کاتب نقطے لگانے میں صحت نہیں برتتا، بعض کاتب صحیح شوشے یا دندانے کے ساتھ نقطے نہیں لکھتے بلکہ آس پاس لگا دیتے ہیں، یا کبھی کبھی پورے پر ہی نقطے نہیں لگاتے۔ نقطے لگانے میں کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے، اس لیے حروف پر نقطے لگانے میں یکسانیت کی کمی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دو یا تین نقطوں کو ملا کر لکھ دیتے ہیں یا نقطے کی کمی بیشی کر دیتے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو صحیح قرأت میں دقت ہوتی ہے اور وہ سہو قرأت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح رسم خط میں بھی غلطیوں کے امکانات پائے جاتے ہیں اور رسم خط میں ملا کر لکھے جاتے ہیں اور بیشتر حروف کی ابتدائی اور درمیانی شکلیں نہایت مختصر ہو جاتی ہیں اور شوشوں اور دندانوں سے حروف کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی نقطے آگے پیچھے یا کم زیادہ ہونے کے امکانات ہوتے ہیں جس سے حروف و لفظ کے تعین میں غلطی ہو سکتی ہے۔ اسی قسم کے اور بہت سارے مسائل اور پریشانیاں پیش آتی ہیں۔ تدوین کے لیے کسی ضابطے یا اصول کا تعین بھی مشکل ہوتا ہے، اس لیے مدون یا محقق کو یہ دشوار گزار مہم صرف اپنے وسیع مطالعے، صواب دید، ادراک و آگہی، دقیق نظری اور تجربے کی روشنی میں غیر

> اردو میں علم و آگہی کے تبادلے کا رواج کم ہے اس لیے کم کتب خانے دوسرے کتب خانوں کو اپنے مخطوطات مستعار دیتے ہیں،اور مخطوطہ کے عکس بھی کم ہی مل پاتے ہیں، جب کہ مغرب میں اس کے با لکل بر عکس ہے، جس سے ابھی بہت سے اہم نسخے بہت سی لائبریریوں، کتب خانوں اور لوگوں کی نجی ملکیت میں پڑے ہوئے ہیں جن تک محققین کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔

معمولی انہماک اور غور و فکر کے سہارے خود ہی کرنی ہوتی ہے، اور اپنی صلاحیتوں کو پوری دیانت داری سے بروئے کار لا کر کوئی اہم، کار آمد یا نئے انکشافات کو اجاگر کر کے اپنے تدوینی عمل کو پیش کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔

حواشی:

1. رشید حسن خاں، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، مطبوعہ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1990، ص،ص 124,125
2. پروفیسر حنیف نقوی، تحقیق و تدوین مسائل اور مباحث، طباعت، اسکرین پلے، تل بھانڈیشور، وارانسی، 2010، ص،ص 17-18
3. ایضاً، ص 18-19
4. گیان چند جین، تحقیق کا فن، مطبوعہ، اتر پردیش اردو اکادمی، 1990، ص 431

■

Zaheer Hasan Zaheer
Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

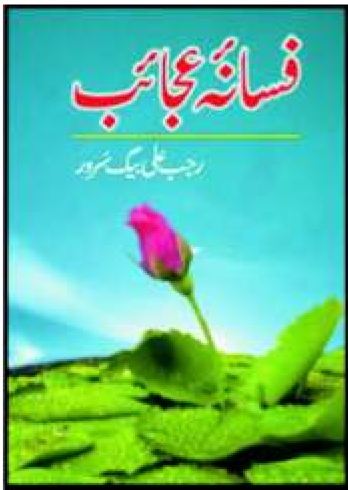

مسعود عالم

اسالیب رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ سرور اردو کے ایک بڑے انشاپرداز تھے۔[1] ان کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا۔ ان کے سن پیدائش کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔[2] غالب گمان ہے کہ وہ 1200ھ بمطابق 1786 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سرور نے 'نشتر ہے رگِ دل کا' سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، اس کے بعد بنارس چلے گئے اور تقریباً دو وہے تک وہیں رہے۔ لیکن آخری ایام میں وہ اپنے وطن واپس آگئے تھے۔ ذی الحجہ 1285ھ بمطابق 15 مارچ تا 12 اپریل کے بیچ 1869 میں ان کا انتقال ہوا۔ اور وہ رام نگر میں سپردخاک ہوئے۔ ان کے دوست اور معالج حکیم احسان علی خاں نے 'فوت میرزا سرور حزیں' سے تاریخ وفات نکالی ہے۔

رجب علی بیگ سرور نے بہت ساری کتابیں لکھی ہیں اُن میں چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

سرور سلطانی، شرار عشق، گلزار سرور، انشائے سرور، شبستان سرور، شگوفۂ محبت، فسانۂ عبرت۔

اُن میں 'سرور سلطانی' خلاصۂ شاہ نامہ فردوسی موسومہ 'شمشیر خانی' اور 'انشائے سرور' رجب علی بیگ سرور نے نواب واجد علی شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی جو تقریباً 1857 میں لکھی گئی تھی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور اردو کے علاوہ عربی وفارسی کے بھی معلم تھے۔ فارسی سے سرور کی واقفیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو میں بعض فارسی کتب کے ترجمے بھی کیے ہیں اور بعض خطوط بھی لکھے ہیں۔ موضوعات کی طرح ان کی نثر میں بھی تنوع ہے اور اسے مختلف اسالیب میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہاں پر اس کا تنقیدی جائزہ لیا جارہا ہے۔

پروفیسر نیر مسعود اپنے ایک مضمون 'رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب' میں سرور کے آغاز نثر نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''مرزا رجب علی بیگ سرور کی باضابطہ نثر نویسی کا آغاز 1825 کے قریب 'فسانۂ عجائب' کی تصنیف سے ہوتا ہے۔[3] جبکہ مضمون 'مرزا رجب علی بیگ سرور (حیات)' میں اطہر پرویز نیر مسعود ہی کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''فسانۂ عجائب کا نقش اول 1240ھ میں تیار ہوا۔[4] ہجری وعیسوی سنہ کا اگر تطابق کیا جائے تو 1240ھ بمطابق 1824 آتا ہے۔ الخلاصہ: نیر مسعود کے اس قول سے مترشح ہوتا ہے کہ ''فسانۂ عجائب کا آغاز 1824 میں ہوا تھا اور تکمیل 1825 میں۔ اس کتاب کی ابتدا کانپور سے ہوئی کیونکہ ان کو بطور سزا کانپور بھیج دیا تھا (اس وقت کانپور (گنگا پار) کو کالا پانی سمجھا جاتا تھا اس لیے سزا جھیلنے کے لیے انہیں کانپور بھیج دیا گیا تھا)۔ لیکن جب نصیرالدین حیدر کی حکومت آئی تو انھوں نے سرور کو بلوایا اور اپنے درباریوں میں شامل کیا اس کے بعد سرور نے اپنی کتاب کو تکمیل تک پہنچائی۔ جیسا کہ 'فسانۂ عجائب' کی ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے: 'سرور' بیان لکھنؤ' میں لکھتے ہیں:

''اچھے آغاز کا انجام بہ خیر ہوتا ہے۔ اللہ تعالی مشقت کسی کی بے کار نہیں کھوتا ہے۔ یہ فسانہ شروع زمانۂ غازی الدین حیدر بادشاہ میں ہوا، اور تمام عصر سلطان بن سلطان ابوالنصر نصیرالدین حیدر دام ملکہ کے ہوا۔''[5]

سرور نے نواب کی مدح میں ایک مدحیہ غزل بھی لکھی ہے، جس کا ایک شعر کچھ یوں ہے:

تاابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشائے لکھنؤ[6]

رام بابو سکسینہ نے بھی اپنی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں اس واقعہ کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جس سے مزید توثیق ہوجاتی ہے کہ سرور نے اس کتاب کا آغاز 1240ھ میں زمانۂ کانپور میں کیا تھا:

''1240ھ میں سرور کانپور گئے اور کہا جاتا ہے کہ غازی حیدر کے 'حکم' سے لکھنؤ سے جلاوطن کردیے گئے تھے۔ وہ کانپور سے نہایت بیزار ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سنہ ہجری نبوی صلعم بارہ سو چالیس تھے، آنے کا اتفاق مجبوراً کور وہ کانپور میں ہوا۔ بلکہ یہ بستی پوچ ولچر ہے۔ اشراف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں۔ احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزلت گزین مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔ یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا کلیجہ منہ کو آیا، قریب تھا کہ جنون ہوجائے، تیرہ بختی روز پا پیش لائے۔''[7]

یہ داستان اوّلاً انھوں نے ایک صحبت میں زبانی سنائی تھی، ان سے فرمائش کی گئی کہ اس داستان کو تحریر کردیں۔ اس مجوزہ تصنیف کے اسلوب اور زبان کے بارے میں انھیں ہدایت ہوئی کہ یہ 'لغت سے صاف ہو' اور جو 'روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے' یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔

اس بیان کے آخر میں سرور نے جو شاعرانہ معذرت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

''نیاز مند کو اس تحریر سے، نمودِ نظم ونثر و جودت طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اسے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا وہ رہنے دیا......''[8]

سرور کا دعویٰ کچھ ایسا ہی نکلا، کتاب لکھتے وقت انہوں نے مذکورہ بالا ہدایات کو ملحوظ خاطر رکھا بلکہ نظر ثانی میں جو الفاظ وقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کے مشکل نظر آئے، اسے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا، رہنے دیا۔ یہی رنگینیٔ بیان، نمود نظم ونثر اور جودت طبع ان کی تحریر کی بہترین مثال ہے۔ جس کی داد غالب جیسے انشا پرداز نے بھی دی ہے۔

سرور کا یہ دعویٰ اس وجہ سے بھی درست مانا جاسکتا ہے کہ فسانۂ عجائب کی نثر جا بجا اس دعوے کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً ''جان عالم نے چار گھڑی بہ جبر صبر کیا۔ پھر اپنی صورت اصلی بن کر، وہی سفید پھول توڑ کر سنگھایا۔ انجمن آرا بہ دستور اوّل اُٹھی، شہزادہ چیخ مار کر لپٹ گیا۔ دونوں مجبور اس زور شور سے روئے کہ تمام باغ ہل گیا، زمین وآسمان دہل گیا۔ جان عالم ہنوز اپنے مصائب، وہاں تک آنے کا حال، فرقت کا درد وملال کہنے نہ پایا تھا کہ انجمن آرا نے یہ کہا......... الخ''[9]

ایک دوسری عبارت:

''جب دونوں کے ہوش وحواس پاس آئے، طبیعت ٹھہری؛ توتے نے سمجھایا کہ آپ دل کو تسکین دیں، خاطر مبارک جمع رکھیں، جان عالم اور انجمن آرا دونوں خیرت سے زندہ ہیں۔ میں نے یہ مقدمہ منجموں اور کاہنوں سے دریافت کیا تھا۔ بالاتفاق سب کا قول ہے کہ سوائے رنج مفارقت، سفرِ غربت، جان کی خیر ہے، سب آملیں گے۔ بس اب مجھے رخصت کرو۔ صبح کو خدا جانے کس وقت بیدار ہو۔ ملکہ نے کہا: واہ......... الخ''[10]

لیکن یہ بات بھی برحق ہے کہ فسانۂ عجائب کی عبارت مسجع مقفیٰ اور معرب ومفرس پر مبنی ہے۔ مصنف نے ایسا صرف اور صرف جولانیٔ قلم دکھانے کی خاطر کیا تھا۔ ناقدین و محققین کو ان کی مسجع ومقفیٰ عبارت سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیے جیسا کہ ان کے بارے میں عمومی رائے ہے کہ ان کی عبارت معرب ومفرس سے پُر اور سہل ممتنع سے خالی ہے۔ سرور نے اپنی کتاب میں دونوں پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ سرور کا اپنا جداگانہ اسلوب تھا۔ وہ جب کہانی کا آغاز کرتے تو ان کی عبارت مسجع ومقفیٰ ہوتی تھی لیکن وہ بندش الفاظ اور تراکیب کی نزاکت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان کے جملوں میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا تھا۔ عبارت ملحوظ ہو:

''گرہ کشایان سلسلۂ سخن، تازہ کنندگان فسانۂ کہن؛ یعنی محرران رنگین تحریر وموزخان جادو تقریر نے؛ اشہب جہندۂ قلم کو میدان وسیع بیاں میں، باکرشمۂ سحر ساز ولطیفہ ہائے حیرت پرداز گرم عنان وجولاں یوں کیا ہے...... ''[11]

اردو کے نامور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد ان کی ایسی عبارت پردنداں شکن ہوجاتے ہیں اور حیرت واستعجاب میں لکھتے ہیں:

''جس انہماک کے ساتھ اس مصنوعی طرز کو فسانۂ عجائب میں شروع سے آخر تک برتا گیا ہے اس کی مثال اردو میں بہت کم ملے گی۔''[12]

نثری اسلوب میں ایسی ترکیب بمشکل ہی آپ کو کہیں نظر آئے گی۔ مصنف نے 'اشہب جہندۂ قلم' کی ترکیب کیا ہی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ قاری اس کو سہل ممتنع سمجھ کر با آسانی روانی کے ساتھ پڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی چیز فہم سے عاری ہے تو وہ ہے الفاظ۔ معنی کی مشکل پسندی (یعنی: ڈکشن کی کمی)۔

سرور داستان گوئی کے ساتھ ساتھ ایک مؤرخ اور اچھے مترجم بھی تھے۔ مہاراجہ ایشری پرساد کی فرمائش پر ملا رضی کی فارسی کی رمزیہ داستان 'حدائق العشاق' دقیق رنگین نثر میں ہے سرور نے 'گلزار سرور' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تو دقیق رنگین کو سلیس رنگین سے بدل دیا۔ دیباچۂ 'حدائق العشاق' کا انھوں نے جو لفظی ترجمہ کیا ہے، اُسے البتہ دقیق رنگین کہا جاسکتا ہے، جو ان کا ایک اپنا الگ انداز واسلوب ہے۔ جس پر مرزا غالب نے تقریظ لکھی تھی۔ اس ترجمے پر سرور کو راجا بنارس سے دوشالہ رومال بہ طور انعام ملا۔ قیام بنارس کا یہ زمانہ مقابلتاً ان کے اطمینان کا تھا۔ ان کی کتاب سے ایک اقتباس درج کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ قاری کے فہم کے لیے آسانی ہو۔

موازنے کے طور پر دونوں سے ایک ایک عبارت نقل کی جارہی ہے:

''نقش کرنے والا قلم شکستہ زباں سے، جاگنے والا اندھیری رات ناکامی کا دلاّ ل، خامہ کی لکنت کرنے والی لسان سے، فسانہ پرداز جلسۂ بے سرانجامی کا، رضی پسر محمد شفیع، نقش اس مطلب کا لوح خاطر عاطر نقش بندوں پر کھینچ کے دکھاتا ہے اور معشوق دل فریب مدعا کو زیور تقریر سے آراستہ کرکے نظر بازون کے پیش چشم لاتا ہے۔ جس رات اس پائمال رنج والم اور تختۂ مشق درد وغم کے وجود بے بود کا ستارہ مشرق عمر سے چمکا اور نیر حیات بے ثبات اس رہ نورد بادۂ حسرت الم کا مطلع ایجاد پر نبض علیل کی طرح دھمکا، گردون گرداں گردش سے معذور، سپہر نیلی سائبان حرکت سے ساکت، مجبور تھا۔''[13]

دوران قیام بنارس انہوں نے 'شبستانِ سرور' [جو 'الف لیلہ' کا ترجمہ ہے] کو اپنے الفاظ میں لکھا ہے۔ صبح اور شام کے ذکر میں انہوں نے روایتی رنگین بیان کا دامن ہاتھ سے جانا نہیں دیا ہے اور قصے کے حسب حال حسن تعلیل سے کام لیا ہے۔ لیکن اصل قصے میں سادگی اور سلیس بیان بالخصوص اختصار کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ذیل میں دو مثالیں دی جارہی ہیں:

(1) ''میرا باپ تاجروں میں بہت گرامی، بڑا نامی تھا۔ بغداد وطن ہے وہیں آج تک مسکن ہے۔ میری ولادت ہارون رشید کی خلافت میں ہوئی۔ باپ میرا پیشۂ تجارت میں مصرف فضول تھا۔ صَرف بے جا، نامعقول تھا۔ جب دنیا سے کوچ کیا، ترکے میں قرض ہاتھ آیا۔ بہت گھبرایا لیکن بڑی دقت سے رفتہ رفتہ قرض خواہوں سے نجات پائی۔ بہ فضل خدا تھوڑے کام میں بڑی برکت ہوئی کہ بہ خوبی روٹی کھائی۔''[14]

(2) ''دفعتہ دو چڑیاں لڑتی ہوئی ایک ٹہنی پر آبیٹھیں۔ ایک تو گر کے زمین پر مرگئی، دوسری اُڑ کے خدا جانے کدھر گئی۔ تھوڑی دیر میں دو اور آئیں۔ قد وقامت میں اُن سے بڑی تھیں۔ جس جگہ وہ چڑیا مردہ پڑی تھی وہاں کی زمین چونچ سے کھود کے اُس کو تہِ خاک کیا، پھر اُڑ گئیں۔ یہ حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ وہ پھر آئیں اور پہلی چڑیا جو قاتل تھی اُس کو پکڑ لائیں۔ دونوں نے اُس کے پَر نوچے، پھر جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینک دیے۔ شاہزادہ قمرالزماں اُس بے جان چڑیا کے پاس آیا۔ پَر تو سب نچے تھے، معدے میں کچھ سُرخ سُرخ نظر آیا۔ اس نے پوناچیر کے دیکھا تو وہی تختی تھی جس کو جانور اس کے ہاتھ سے لے گیا تھا۔''[15]

'شگوفۂ محبت' سرور نے امجد علی خاں رئیس سندیلوی کی فرمائش پر 1272ھ بمطابق 1856 میں لکھا تھا۔[16] یہ فارسی قصہ 'قصۂ آذر شاہ وسمن رخ بانو' کا اردو ترجمہ ہے جس کو مہر چند کھتری نے اردو کے قالب میں ڈھالا تھا اور اس کا نام 'نو آئین ہندی' رکھا تھا۔ یہ 1209ھ بمطابق 1794 میں لکھا گیا تھا۔ یہ قصہ اردو میں 'قصۂ ملک محمد وگیتی افروز' کے نام سے مشہور ہے۔

سرور اور کھتری کے قصوں میں جزئیات میں بعض جگہ تفریق پائی جاتی ہے لیکن ان جزئیات سے قطع نظر بعض چیزیں سرور کے قصے کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات میں سب سے پہلی سرور کا وہ اسلوب اور طرز ادا ہے جس کی بدولت انہیں اردو داستان گوئی اور اردو نثر کے اسلوب کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کی عبارت سے ان کے اسلوب اور ان کے دلکش انداز بیان کا بخوبی پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرور

کو مشکل پسندی کے علاوہ سہل پسندی اور بیانیہ پر کتنا عبور حاصل تھا۔ ذیل میں 'شگوفۂ محبت' سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے۔

'شہر کو آراستہ کرو۔ منادی فوراً ندا کرے کہ خوشی خلق خدا کرے۔ در دولت پر جشنِ عام ہوگا، چھوٹا بڑا اس شہر کا حسبِ لیاقت موردِ انعام ہوگا۔ درِ خزانہ کھلا۔ فقیر غریب محتاج لینے لگے، دعائیں دینے لگے۔ پنڈت، رمّال، منجم، جفرداں جو جو شہر میں کامل تھے، حاضر ہوکے وقت ساعت نحس وسعد دیکھنے لگے۔ غرض کے شرف آفتاب مشتری کی ساعت میں وہ قمر طلعت برج محل سے نکلا۔ مبارک سلامت کی صدا زمین آسمان سے پیدا ہوئی۔ محل کی رنڈیوں کا مجمع ہوا۔ جس نے دیکھا ہزار جان سے شیدا ہوئی۔ حضور شاہ میں نذریں گزرنے لگیں، طبل اسکندری پر چوٹ پڑی۔ شلک کی توپ پر بتی دی۔ شہر کی خلقت مطلع ہوئی۔ شوروغل بڑے بلڑ کا ہوا کہ بادشاہ کے گھر میں لڑکا ہوا۔ ہیجڑے، زنانے، بھانڈ، چونے والیاں دردولت پر حاضر ہوئیں۔ گانا ناچ ہونے لگا۔ سب انعامِ شاہی سے مالا مال ہوئے۔ ہزارہا گناہ گار قید سے رہا ہوا۔ غنی محتاج وگدا ہوا۔ مسجد، خانقاہ، مہمان سرا کی تعمیریں ہوئیں۔ مشائخوں کے روزینے مقرر ہوئے، ملاؤں کی جاگیریں ہوئیں۔ برہمنوں کے سالیانے ٹھہرے۔ پنڈتوں کی توقیریں ہوئیں۔ 17

'شگوفۂ محبت' کی مذکورہ بالا عبارت ثانی سے متعلق پروفیسر وقار عظیم اپنی کتاب 'ہماری داستانیں' میں کچھ یوں گویا ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''خیال کے اظہار کے لیے معمولی کے مقابلے میں غیر معمولی اور قدیم کے مقابلے میں جدید کو ترجیح ایک ایسی روش ہے جسے انسان نے ہر زمانے میں اختیار کیا ہے۔ اسی روش اور میلان کی ایک صورت یہ ہے کہ بات کہنے والے بعض ایسے وسائل کا التزام کر لیتے ہیں جن کے برتنے میں ذہن کو کاوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ بیان کے ایسے اسالیب میں آورد کی کیفیت کا پیدا ہونا لازمی ہے، لیکن اس آورد میں آمد کی شان پیدا ہوجائے، اس تکلف میں سادگی کا مزا آئے یا جدت کے باوجود روانی و شگفتگی میں بھی فرق نہ آئے تو زمانہ انہیں پسندیدگی و تحسین کی سند دیتا ہے۔ سرور کا بیان بھی اسی پُر تکلف میلان کی ایک صورت ہے۔ لیکن ایک بات جس کی انہیں داد ملنی چاہیے یہ ہے کہ قافیہ اور رعایت لفظی کے انتہائی التزام کے باوجود 'شگوفۂ محبت' میں شروع سے آخر تک بیان کی ہمواری ہے۔ قافیوں میں ترنم وموسیقی کی کمی بھی نہیں۔''18

وہیں پروفیسر گیان چند جین 'شگوفۂ محبت' کی زبان واسلوب کا موازنہ 'فسانۂ عجائب' کے اسلوب سے کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ دونوں کی تفریق واضح ہوجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شگوفۂ محبت کی زبان فسانۂ عجائب کے مصنف کی زبان ہے لیکن اس میں عربی فارسی تراکیب کی اتنی شدت نہیں۔ اس کے برعکس شگوفۂ محبت کی نثر میں قافیہ پیائی زیادہ کامیاب ہے۔ یہاں ہر جملے کے آخر میں قافیہ آتا ہے خواہ درمیانی فقروں میں ہو یا نہ ہو۔ فسانۂ عجائب میں فقرے مسجع ہوتے ہیں۔ جملوں کے آخر میں قافیوں کی قید کم ہوتی ہے۔ شگوفۂ محبت میں بھی مناظر اور جذبات کے بیان میں استعارات، حسن تعلیل، ضلع جگت اور نازک خیالی کی کارفرمائی ہے.....19

'شرارِ عشق' داستانی عہد کی سب سے چھوٹی داستان ہے جس کو سرور نے بیگم صاحبہ بھوپال کی فرمائش پر 1851 میں تحریر کی تھی۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ داستان 1856 میں لکھی گئی تھی۔ الغرض یہ داستان سرور نے بڑی عجلت میں لکھی تھی جیسا کہ داستان کی تمہید سے پتہ چلتا ہے، سرور نے اس کے لیے معذرت خواہ بھی ہیں۔ یہ داستان تین حصوں پر مشتمل ہے۔ تمہید، متن قصہ اور خاتمہ۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سرور نے ان تینوں حصوں میں اپنے اس رنگین اسلوب کو کس طرح برتا اور نباہا ہے جو داستان سرائی کے فن میں ان کا امتیاز ہے۔ تمہید کے بعد سرور قصہ کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''اب جو تیرھویں صدی ہے تو نیکی کا بدلہ بدی ہے۔ راہ ورسم محبت سررشتۂ اتحاد واُلفت اس خاکدان پُر غبار بے بنیاد میں نہیں۔ جانور کی تو خلقت میں وحشت ہے۔ غیر جنسی کی دہشت ہے، فرقہ بے مروت آدمی زاد میں نہیں۔ اور ہے تو مکروفریب، شوروشر، فتنہ یا فتور ہے۔ سچ یہ کہ جھوٹ کے پتلے ہیں۔ خلقت میں فساد، نیت میں مور ہے۔ وہ جو بہت معقول فی الحال ہیں، سگِ زرد برادر شغال ہیں۔''20

ان ابتدائی فقروں میں سرور کا انداز بیان اور طرز نگارش بالکل ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ ماقبل داستان فسانۂ عجائب اور گلزار سرور میں دکھائی دیتا ہے جس کے سبب سرور کو پہلے ہی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ یعنی: رنگین اسلوب، قافیہ کی پابندی اور رعایت لفظی وغیرہ وغیرہ۔

'فسانۂ عبرت' [یہ کتاب سرور کی وفات کے بعد چھپی] اس میں سرور کا اسلوب انشائیہ کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ عہد امجد علی شاہ کی بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کے بیان میں سرور کا یہ اسلوب مزاحیہ کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ ایک طرح سے اگر یہ کہا جائے کہ اردو ادب میں مزاحیہ ادب کی ایک شاندار روایت سرور کی عبارت میں نظر آتی ہے تو بے جا نہ ہوگا گرچہ اس وقت مزاح کے فنی لوازمات وبنیادی اصول تیار نہیں کیے گئے تھے۔ ان کی اس عبارت کو مزاحیہ ادب کے عمدہ نمونوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ سرور نے ایسی تحریر اس لیے رقم کی تھی کہ اس دوران ان کی ملازمت خطرہ میں تھی اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی غصہ میں تھے۔ انھوں نے سارا نزلہ اس کتاب کی عبارت آرائی میں گرا دیا اور خوب مبالغہ سے کام لیا۔ سیاسی، سماجی انتظامی خلفشار اور ابتلائے عام کا ایسا مرقع سرور کی اس نثر سے پہلے اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔ انشائی تکلفات اور نثر رنگین کے لوازم کے باوجود اس نثر شہر آشوب میں عجب بے ساختگی اور آمد کی کیفیت ہے۔ ان کے دور کے آخری اسلوب کے بارے میں پروفیسر نیر مسعود فرماتے ہیں کہ: ''شگفتگی اور چلبلاپن سرور کی نثر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے اور جب وہ طنز ومزاح اور ہجو نگاری پر آتے ہیں تو اُن کے قلم میں شوخی عجب کاٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ نثر کا یہ اسلوب سرور سے پہلے اردو میں بہت کم نظر آتا ہے۔ خصوصاً 'فسانۂ عبرت' میں سرور کا یہ رنگ بہت تیز ہے۔''21

قارئین کے لیے مثال کے طور پر 'فسانۂ عبرت' سے ماخوذ ایک اقتباس ٹکڑوں میں نقل کیا جارہا ہے جس سے اندازہ ہوسکے کہ یقیناً فسانۂ عبرت کی عبارت انشا اور مزاح کا مرقع ہے۔ اس میں بیانیہ نثر کے جوہر کھلتے ہیں۔

''حکومت نظمی، نیا طور ہوا۔ اس دورے میں رنڈیوں کا دور ہوا۔ ایسی ہوا بگڑی، قوتِ ممیزہ شہر سے اُڑ گئی۔ کسی کی ماں نے رسالہ نہ چھوڑا، بیٹا رسالدار ہوا۔ کسی کی بہن نے پلٹن سے منھ نہ موڑا، سالا سالار ہوا۔''

''گیدڑوں نے دیماس شیر گھر لیا۔ غیر نے منھ پھیر لیا۔ ایک کو دوسرے سے کینہ ہوا۔ کنجشک کے پنجے سے باز کا زخمی سینہ ہوا۔ شاہین کبوتر کے جور سے حامل رنج ومحن ہوا۔ لنورا سیمرغ پر طعنہ زن ہوا۔ زاغ شب گرد کے مقابلے میں بد دماغ ہوا۔ آنکھ دکھانے لگا۔ پِدّا بلبل بستان کو آوازے سنانے لگا۔''

''اس سرکار کی کیا توقیر ہو جس کا لندنی سفیر ہو۔ جب منھ کھولا انگریزی ہانک بولا۔ نہ جرأتِ تقریر، نہ لیاقتِ تحریر۔ مرد پیر دام حرص میں اسیر۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ کھڑے کی قطع کیا کہوں، جیسے اڈھی کی

چوں چوں۔''22

سرور کی انشا پردازی کا ایک عکس ان کے مضامین اور داستانوں کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کے مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سرور کا اسلوب رنگینیت سے ساتھ ساتھ سہل پسندی اور آسانیت کا حامل تھا۔ آغاز مشکل پسندی سے کرتے لیکن دھیرے دھیرے آسان اور ہندی آمیز بیانیہ کی طرف لوٹ جاتے۔ لیکن سرور خطوط میں بہت زیادہ رنگینی اور انشا پردازی کے قائل نہیں تھے۔ مہاراجہ بنارس کے ایک خط کے جواب میں انھوں نے اوّلاً اس خط کے لکھنے والے انشا پرداز کی 'تحریر نشیانہ' کی مدح نما ہجو لکھی، پھر لکھا '' یہ یک نگاہ مضمون کا حاصل ذہن میں نہ آیا۔ سبحان اللہ! یہ غور غواصی کر کے مدّعا نکال لایا مطلب سمجھا۔'' خود سرور کے خطوں میں ادبی چاشنی کے ساتھ کچھ بول چال کا سا انداز ضرور جھلکتا ہے۔ خواہ ان کا مکتوب الیہ کوئی عالی مرتبت شخص ہی کیوں نہ ہو۔ واجد علی شاہ کے کلکتے چلے جانے کے بعد سرور نے ان کو ایک خط میں لکھنؤ کی خرابی کا حال لکھا۔ اس خط کے چند فقرے، جن میں بادشاہ کی کوٹھی فرح بخش کی حالت لکھی ہے، درج ذیل ہے:

''خدا کسی کو بے وارث و والی نہ کرے، مالک سے مکان کو خالی نہ کرے۔ فرح بخش سخت دل تنگ ہے۔ بے مکین مکان کا عجب رنگ ہے...... طالع اس کا شوم ہوا۔ ہُما نے منہ پھیرا، نحوست نے گھیرا، مسکن زاغ و بوم ہوا۔ طاقوں میں طوطے، کانسوں پر کوے، منڈیروں پر مینا، بُرجوں میں ابابیل، چھت پر چیلیں ہیں۔ ویرانے پن کی دلیلیں ہیں''23

انشائے سرور میں بعض خطوط ایسے بھی ملتے ہیں جو غالب کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یعنی: مراسلے کو مکالمہ بنا دینے والا اسلوب۔ بعض جگہ ان کے خطوط پر غالب کا مغالطہ بھی ہو جاتا ہے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے یہ خط غالب ہی کے نام ہیں۔

''قبلۂ بندہ، تسلیم بجالاتا ہوں جو کام نیا کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں۔ آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے، میں نے ہرکاروں سے رسم بڑھائی ہے۔ گو ہم پایہ نہیں، کم ہوں، مگر قدم بہ قدم ہوں''24

استاد محترم ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اندرونی شواہد و دوسرے قرائن کی مدد سے بہت اطمینان بخش طور پر ثابت کیا ہے کہ سرور کے یہ خط غالب کے نام ہیں۔25

مضامین چکبست میں چکبست نے لکھا ہے کہ:

''اودھ پنچ سے پہلے رجب علی بیگ سرور کی طرز تحریر کی پرستش ہوتی تھی۔''26

سرور بیشتر فنون لطیفہ میں کاملیت کی حد تک دخل رکھتے تھے۔ داستان نویسی، تاریخ نگاری، ترجمہ نگاری، خطوط نویسی کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے خطاط بھی تھے، یہ فن انھوں نے مشہور خطاط حافظ ابراہیم سے سیکھا۔ فنِ موسیقی اور فنون سپہ گری میں بھی وہ کافی ماہر تھے۔ شعر و شاعری سے اُن کو غیر معمولی شغف تھا، اسی رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص سرور اختیار کیا اور آغا نوازش حسین خاں نوازش عرف مرزا خانی لکھنوی کی شاگردی اختیار کی۔ موضوعات کی طرح ان کی نثر میں بھی تنوع ہے جسے مختلف اسالیب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر نیر مسعود نے اپنے مضمون میں سرور سے ہمدردی جتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری بیشتر تنقید نے سرور کے ساتھ کچھ یک طرفہ سا رویہ اختیار کر رکھا ہے اور ان کی نثر کو بے لطف، پرتکلف اور از کار رفتہ قرار دے کر قریب قریب مسترد کر دیا ہے۔ اپنے کلاسیکی سرمایے کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں اور ہماری ادبی اور تخلیقی نثر کی تاریخ میں سرور زیادہ توجہ اور ہمدردانہ مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔''27

حواشی

(1) اپنی کتاب 'شگوفۂ محبت' کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''نامساعدت بخت اور نیرنگی زمانہ سے نہ عربی میں دخل ہُوا، نہ فارسی میں کامل ہُوا، دونوں سے نا آشنا رہا۔ ایک کا بھی علم نہ حاصل ہوا۔ پست ہمتی سے اُردو کے لکھنے میں اوقات بسر کی۔ کچھ دن نظم کا اہتمام رہا۔ شعر کہنے کا خیال خام رہا، جب وہ بھی نہ ہو سکا، نثر کی طرف خیال آیا۔''

(2) بقول رام بابو سکسینہ ''سرور 1202ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے'' (دیکھیے، ص: 21، باب 16 حصہ نثر)۔ حامد حسن قادری ان کے سن پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ''غالباً 1202ھ/ 1787 (مرزا غالب سے دس برس پہلے) پیدا ہوئے۔'' (بحوالہ، داستان تاریخ اردو، ص: 158) اطہر پرویز سرور کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں ڈاکٹر نیر مسعود کے حوالے سے بات کرتے ہیں کہ انھوں نے ان کی تاریخ پیدائش 1200ھ/ 1786 اندازہ لگایا ہے۔ اُن کا قیاس اس بنا پر ہے کہ فسانۂ عجائب کے دیباچے میں سرور نے خود لکھا ہے کہ: ''چالیس سال جہاں کی دیکھ بھال کی، ایسا شہر، یہ لوگ نظر سے نہ گزرے'' یعنی: فسانۂ عجائب کا نقش اول 1240 بمطابق 1824 میں تیار ہُوا، اس لیے ڈاکٹر نیر مسعود اس نتیجے پر پہنچے کہ چالیس سال پہلے یعنی 1200ھ میں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ، فسانۂ عجائب، مرتبہ: اطہر پرویز، ص: 15) ڈاکٹر سلیمان حسین خاں اور رشید حسن خاں نے بھی اپنے دیباچے میں اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔]

(3) بحوالہ غالب نامہ، جولائی 1995، ص: 75

(4) بحوالہ فسانۂ عجائب، مرتبہ: اطہر فاروقی، علامہ اقبال لائبریری، کشمیر (مخطوطہ)

(5) فسانۂ عجائب، مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔ ص: 19

(6) ایضاً، ص: 21

(7) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری، مطبع بشی تیج کمار و پرائیوٹ لمیٹڈ، ص: 21، باب 16 حصہ نثر

(8) بحوالہ فسانۂ عجائب: مرتبہ رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔ ص: 31

(9) فسانۂ عجائب، مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔ ص: 296-97

(10) ایضاً، ص:...... 311

(11) ایضاً، ص: 32

(12) فنِ داستان گوئی، کلیم الدین احمد، ص: 143

(13) دیباچہ حدائق العشاق۔ ص: 2

(14) شبستان سرور، ص: 129

(15) شبستان سرور، ص: 191

(16) ہماری داستان کے مصنف پروفیسر وقار عظیم نے اپنی کتاب کے صفحہ 268 پر اس کی تاریخ 1272ھ بمطابق 1876ء لکھا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ جبکہ 1272 بمطابق 1856ء ہوگا۔ گیان چند جین کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں اس کی بھرپور تصدیق کرتی ہے۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ 559 پر رقمطراز ہیں:...... اس وجہ سے سرور نے 1856م 1272ھ میں اپنے طور پر لکھا۔ اسی زمانے میں واجد علی شاہ معزول ہوئے تھے......

(17) دیکھیے، شگوفۂ محبت

(18) بحوالہ، ہماری داستانیں، پروفیسر وقار عظیم، ص: 274-75

(19) بحوالہ، ہماری داستانیں، گیان چند جین، ص: 561

(20) ہماری داستانیں، پروفیسر وقار عظیم، ص: 274-75

(21) دیکھیے، شرار عشق

(22) پروفیسر نیر مسعود، رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب، ص: 81۔ غالب نامہ، جولائی، 1995

(23) دیکھیے، انشائے سرور

(24) ایضاً

(25) دیکھیے مضمون: 'غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور' مشمولہ کتاب 'خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ' از کاظم علی خاں، ناشر کتاب گھر، لکھنؤ، 1981

(26) بحوالہ، مقدمہ فسانۂ عجائب: مرتبہ: رشید حسن خاں، مضامین چکبست، انڈین پریس الہ آباد، سال طبع: 1940، ص: 229

(27) پروفیسر نیر مسعود، رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب، ص: 87۔ غالب نامہ، جولائی، 1995

■

Saud Alam
B-114, Okhla, Main Market, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

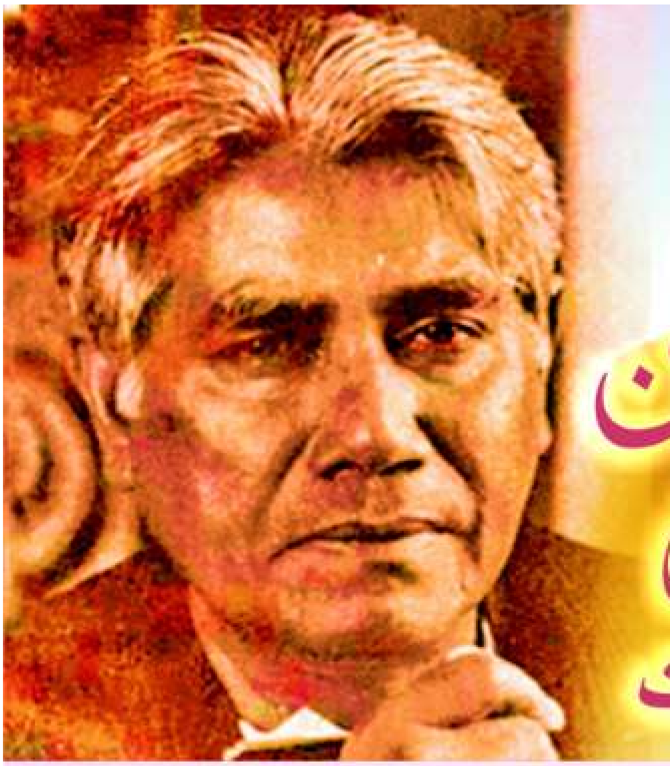

اختر الایمان کے یہاں ماضی کی بازیافت اور مراجعت

انجم پروین

اختر الایمان اردو شاعری کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ جس دور میں انھوں نے فہم و ادراک کے راستے ناپنے شروع کیے، وہ ادب میں ذہنی و فکری اور جذباتی و حسیاتی تبدیلیوں کا عہد تھا۔ نثر و نظم کا سرمایہ بھی بدلتے وقت کے ساتھ تغیرات کی نئی کروٹوں سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ نئے لکھنے والے نئی حسیت اور تازہ کار اسلوب کا پرچم تھامے سامنے آرہے تھے۔ اختر الایمان اس انقلاب آفریں لشکر میں اپنے تمام تر نئے تخلیقی رویوں اور منفرد طرز احساس کے ساتھ پیش پیش تھے لیکن انھوں نے تقلید اور تتبع کے رجحان سے اپنی شاعری کو یکسر محفوظ رکھا۔

اختر الایمان نے اپنی نظموں میں مختلف النوع اور نادر تجربات کر کے اردو شاعری کو باثروت بنایا ہے۔ ان کی نظمیں ایک عجیب قسم کی دردمندی، اضمحلال اور کرب کی نشان دہی کرتی ہیں۔ 'وقت' کو ان کے یہاں اقبال اور قرۃ العین کی طرح اختصاصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ وقت کہیں تو نقش گر حادثات بن کر کرب کے اتھاہ سمندر میں دھکیل دیتا اور کہیں اس درد سے نجات حاصل کرنے کے لیے قوت و شفا عطا کر کے جینے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ فنی اور تکنیکی اعتبار سے بھی ان کی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں بیشتر نظمیں اشاراتی و علاماتی نظام اور طنزیہ اسلوب پر منحصر ہیں۔ بعض ایسی ہیں جن میں ماجراتی، حکایتی، روداد نگاری اور ڈرامائی عناصر شامل ہیں اور چند ایسی عمدہ نظمیں بھی ہیں جن میں آرٹ اور فلم کی مخصوص تکنیک مثلاً فلیش بیک، مکالماتی انداز، مونتاژ اور کولاژ وغیرہ کے بہترین استعمال سے مختلف Scene create کیے گئے ہیں۔ داخلی خود کلامی کی مدد سے فرد کے باطن میں گھس کر اس کی اندرونی کیفیات کو آشکار کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اظہار و بیان کے یہ جدید تجربے ان کے یہاں موضوع اور طرز ادا سے اس طرح آ کر ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

اختر الایمان کی شاعری کے تمام تر مجموعے ان کے روحانی کرب اور ذہنی کشمکش کے غماز ہیں۔ ان کے یہاں یہ کرب اپنے حال سے نا آسودگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں بنیادی مسئلہ اقدار کا زوال اور ان کی تلاش و جستجو ہے۔ چونکہ اقدار کی جڑیں براہ راست ماضی اور حال سے وابستہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا جب یہ قدریں اس مشینی دور میں پامال ہونے لگتی ہیں تو وہ حال سے مایوس اور نا آسودہ ہو کر ماضی میں پناہ گزیں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے درد اور حزن و ملال کی یہ تمام کیفیات ان کی شاعری میں بھی در آتی ہیں۔ ان تمام نکات سے قطع نظر، قابل توجہ امر یہ ہے کہ اختر الایمان کا پہلا ہی مجموعہ نظم 'گرداب' (1943) اس ارتکاز فکر کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ اس میں ان کا شعور اور شدت احساس و غم ان کی مختلف نظموں سے جھلکتا ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر نظموں میں ماضی و حال باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اس طرح کہ جب عصر حاضر کے مختلف مسائل اور حالات و وقت کے جبر سے شاعر متصادم ہوتا ہے اور اس بھنور سے نکلنے کی اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تو وحشت زدہ ہو کر وہ اپنے ماضی اور خوش کن گزشتہ لمحوں کی چادر تان لیتا ہے۔ شکستہ آرزوؤں اور موجودہ مسائل سے بجائے مقابلہ اور دفاع کرنے کے اپنے ماضی کی جانب مراجعت کر کے ان سے فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماضی کی طرف مہاجرت کبھی تو عشق ناکام کی صورت، کبھی اقدار کے فقدان اور ذہنی و جذباتی گھٹن کی شکل، تو کبھی ایک بالک کے روپ اور تلاش سکون میں نمایاں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں گرداب کی یہ نظمیں مثلاً پرانی فصیل، جمود، تنہائی میں، مسجد قابل توجہ ہیں:

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے الجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن

———

یہاں بھٹکی ہوئی روحیں کبھی سر جوڑ لیتی ہیں
یہاں پر دفن ہیں گزری ہوئی تہذیب کے نقشے

———

مری نظروں نے قتل و خوں، ہوس رانی بھی دیکھی ہے
یہاں جذبات بھی عریاں کیے ہیں کج کلاہوں نے
یہاں لوٹی ہوئی پونجی پہ ماتم بھی کیا آ کر
یہاں تھک کر سہارا بھی لیا ہے بادشاہوں نے

(پرانی فصیل)

نظم کے مذکورہ مصرعوں میں اقدار کا نوحہ، ماضی و حال کی کشمکش اور قدیم و جدید کا تصادم واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر اپنی تنہائی میں مٹتی ہوئی قدروں کو انتہائی بے بسی سے دیکھ رہا ہے اور گہرے صدمے کے باعث اس ماحول سے مفرور اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

اختر الایمان کے پہلے مجموعے کا نام گرداب ان کے اضمحلال اور اندرونی کرب کی جانب واضح اشارہ ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر امید و بیم، زندگی و موت

اور جمود وحرکت کے گرداب میں کہیں پھنس کر رہ گیا ہے۔ جبکہ دوسرا مجموعہ 'تاریک سیارہ' اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں ان کا وہی تصادم اور روحانی کشمکش جو ان کے داخل میں کہیں پنہاں و پوشیدہ تھی نمایاں ہے۔ جذبات و احساسات کی سیلانی جو گرداب کی نظموں میں عروج پر تھی وہ ان کی بعد کی نظموں میں قدرست پڑ جاتی ہے۔ گرداب کو شاعر کا مجموعہ اول ہونے کے باوجود دیگر شعرا کے مثل ان کے جذبات ومحسوسات کی ابتدائی داستان قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس میں انھوں نے اپنی تنہائی، شکستگی، ناکامی اور نا آسودگی کے بعد کے احوال وکوائف کا برملا اظہار کیا ہے۔ مسلسل کرب وانتشار اور آلام روزگار کی جو کیفیات اس میں جس شدت کے ساتھ کروٹیں لیتی ہیں اس کا اظہار نہ تو دیگر شعرا کے ابتدائی مجموعوں میں ملتا ہے اور خود اختر الایمان کی بعد کی نظموں میں بھی خال خال ہی نظر آتا ہے۔ مثلاً فیض، مجاز، ساحر، جاں نثار اختر وغیرہ کی ابتدائی شاعری میں ہی محبت والفت اور جذبات ومحسوسات کی دنیا، غم تنہائی، بے چینی اور حزن کی داستان پہلے اور اپنے ماحول اور تہذیب ومعاشرت کا بیان بعد ازاں بطور تبدیلی ملتا ہے۔ محبت میں ناکامی اور اپنے ماحول سے بیزاری، ہنگامہ خیزی سے تنفر اور داخلی کرب اختر الایمان کی نظم 'تنہائی میں'، 'محرومی' اور 'جمود' میں شدید غم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان دونوں نظموں سے چند مصرعے پیش خدمت ہیں جو اس حقیقت حال کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں:

تجھ سے وابستہ وہ اک عہد، وہ پیمان وفا
رات کے آخری آنسو کی طرح ڈوب گیا
خواب انگیز نگاہیں وہ لب درد فریب
اک فسانہ ہے جو کچھ یاد رہا، کچھ نہ رہا
میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ کانٹے نہ غبار
شام کے سائے میں واماندہ سحر بیٹھ گئی
کارواں لوٹ گیا مل نہ سکی منزل شوق
ایک امید تھی سو خاک بسر بیٹھ گئی...

(محرومی)

محرومی ونا آسودگی اور شدید کرب وانتشار کی یہ کیفیات نہ صرف چند نظموں بلکہ ان کے اولین مجموعے کی ہر نظم کے پس پردہ زیریں لہر کی مانند جاری وساری ہیں، جس کے مطالعے سے شاعر کی روح بسمل تک بآسانی رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ گرداب کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے شاعر کے نازک آبگینے کو زبردست ٹھیس لگ چکی ہے اور وہ بے حد ملول ونڈھال ہو چکا ہے۔ چونکہ اس کے دل کا موسم یاس انگیز اور غم میں ڈوبا ہوا ہے، جس کے باعث اسے اپنے قرب وجوار کا ماحول بھی سوگوار معلوم ہونے لگتا ہے یوں اپنے آس پاس کی ہر شے مثلاً منزل شوق، دم توڑتا سورج، سوکھی ببول، گول سا چاند، محرابیں، دیواریں، راستے اور تالاب وغیرہ پر اس کے آنسو اور غم کا پرتو نظر آتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب کسی انسان کو کوئی انوکھا واقعہ پیش آجائے یا کوئی ایسی اچھوتی اور انہونی بات اس کو کہی جائے جو سیدھے اس کے دل کے تاروں کو مس کر دے یا براہ راست اس کے دل پر لگ جائے تو اس کے نتیجے میں جس قسم کا جذبہ یا غم پیدا ہوگا وہ اس سے دنیا کا کوئی بھی بڑا کام کروا سکتا ہے۔ یہاں بھی شاعر کے شدت غم اور شدت تنہائی ومحرومی اور ذات وشخصیت کو مرکز توجہ بنانے کے عمل نے اسے اعلیٰ درجے کی شاعری وجود میں لانے کا ہنر پیدا کر دیا۔ جس سے ایسا شعلہ لپکتا ہے کہ وہ جس چیز کو چھو جائے کندن بنا دے۔ گرداب کی نظموں سے یہ ادراک بھی ہوتا ہے کہ اس میں ماضی اختر الایمان کے ان ہی تجربات کا حامل ہے جن سے ان کا براہ راست تعلق رہا ہے۔ ماضی کے یہ تجربات 'بطور یاد رفتہ' ان کے حافظے میں محفوظ ہیں جن کا ظہور ان کی نظموں میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔ ان یادوں میں دونوں کیفیات بیک وقت مل جاتی ہیں، کربناک لمحے بھی اور خوشگوار واقعات بھی۔ یہ یادداشتیں اور ماضی کے تجربات کو اگر ان کے انفرادی اور اجتماعی شعور کا حصہ قرار دیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ اختر الایمان اپنی شاعری اور ایام گزشتہ کے تجربات سے متعلق 'یادیں' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس وقت نہیں لکھا جب ان تجربات اور محسوسات کی منزل سے گزر رہا تھا انھیں اس وقت قلم بند کیا ہے جب وہ تجربات ومحسوسات یادیں بن گئے تھے جب ہر نشتر کے لگائے ہوئے زخم مندمل ہو گئے تھے ہر طوفان گزر کر سطح ہموار ہو گئی تھی اور ہر رفتہ اور گزشتہ تجربے کی صدائے بازگشت مجھے یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے میں ان سے وابستہ بھی ہوں اور نہیں بھی یہی وجہ ہے میری بیشتر شاعری میں ایک یاد کا سا رنگ ہے اور یہ شاعری بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔''

ہر گزرنے والا پل ماضی بن جاتا ہے اور جب اس ماضی کو صفحۂ ہستی پر رقم کیا جائے تو تاریخ جنم لیتی ہے جس میں وقت کی ستم ظریفیوں اور شدید قوت عمل کی کارفرمائی شامل ہوتی ہے۔ یہی وقت اختر الایمان کی شاعری میں ایک توانا کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے، جس کے تیز وتند ریلے میں ہر ایک شے خواہ تہذیب وتمدن ہو یا سماجی اقدار بہتی چلی جاتی ہے۔ یہ عدم کو وجود اور وجود کو عدم میں تبدیل کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ انسان کو زیر کر کے اس کے تمام حوصلوں اور قوتوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے بے بس کر دیتا ہے، جس کے باعث اس کی وقت سے ٹکرانے اور مقابلہ کرنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ اس صورت حال سے جو کشمکش اور تصادم پیدا ہوتا ہے وہی ان کی شاعری کا علامیہ قرار پاتا ہے۔ اس تصادم میں شاعر ماضی کی اقدار کے روبرو کھڑا نظر آتا ہے۔ جہاں سے وہ ماضی کی تباہی اور اقدار کی گرتی ہوئی عمارت کا منظر دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن اس شکستہ ماضی اور ان قدروں سے وابستہ محسوسات و تصورات کے واسطے ماسوا کرب وآہ اور آنسو کے اس کے پاس کچھ نہیں۔ باوجود اس کے وہ اپنے ماضی اور عہد رفتہ سے بری طرح منسلک ہے۔ یہ انسلاک اسے ماضی وحال کے مابین تذبذب اور الجھن کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ گومگو کی یہ کیفیت ان کی نظموں میں ہے۔ بطور مثال ایک اقتباس:

ایک دوراہے پہ حیران ہوں کس سمت بڑھوں
اپنی زنجیروں سے آزاد نہیں ہوں شاید!
میں بھی گردش گہہ ایام کا زندانی ہوں
درد ہی درد ہوں فریاد نہیں ہوں شاید!...

(محرومی)

گرداب کی ان نظموں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنی داخلی وخارجی زندگی کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ یہاں اس کے آگے بڑھنے اور واپس پلٹنے سے متعلق متضاد رویے سامنے آتے ہیں۔ وہ اس مسافر کی طرح راستے کے پیچ وخم میں گھر کر رہ جاتا ہے جس کی نہ آگے کی سمت و راہ متعین ہے اور نہ ہی پیچھے پلٹنے کا راستہ بھائی دیتا ہے۔ شدید کرب اور احساس تنہائی کے تحت شاعر ایک ایسے سفر پر گامزن ہو جاتا ہے جس کے اختتام پر فہم وادراک کی منزلیں اس کی منتظر تھیں۔ لیکن ادراک واحساس کی یہ راہیں اس کے لیے مکمل طور پر واضح نہیں تھیں یوں اسے پیچیدہ راستے پر بڑھتے رہنے میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔ نظم پگڈنڈی سے یہ داخلی کشمکش کی کیفیات صاف مترشح ہے۔

'گرداب' کے بعد شاعر نے انفرادی اور شخصی شاعری سے احتراز کرنا شروع کر دیا۔ غالباً اس کی اہم وجہ یہ رہی ہوگی کہ شاعر مسلسل روحانی کرب واضطراب، محرومی اور تنہائی کے عمیق سناٹے سے عاجز اور اوب گیا ہوگا اس لیے بغرض ذہنی کرب سے نجات حاصل کرنے اور کچھ

تقاضائے فطری کے مطابق اپنی توجہ خارجی عوامل سے پر شاعری کی طرف مرکوز کردی۔ یہ تبدیلی اختر الایمان کے یہاں ان کے دوسرے مجموعۂ نظم 'تاریک سیارہ' سے اجاگر ہونے لگتی ہے۔ اب وہ غم تنہائی اور خود اذیتی کی سطح سے بالا تر ہوکر زمینی مظاہر اور خارجی تصورات کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ شاعر کے اس ردعمل کے بعد ان کی نظموں سے وہ گہرائی و گیرائی اور جذبے کی شدت ناپید ہونے لگی جو اس کی شاعری کا بنیادی محرک تھا۔ اس مراجعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اختر الایمان 'آبجو' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''احباب کے ایک حلقے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ 'گرداب' کی شاعری قنوطی، یاس انگیز اور گھٹن لیے ہوئے ہے۔ اس غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ شاعری کی طرف ہمارے اکثر پڑھنے والوں کا رویہ سنجیدہ نہیں ہے... گرداب کی جن نظموں سے زیادہ غلط فہمی ہوئی وہ مسجد، موت، قلو بطرہ، پگڈنڈی، تنہائی میں وغیرہ وغیرہ ہیں۔''

بعد ازاں شاعر نے مذکورہ نظموں سے متعلق اظہار خیال بھی کیا کہ یہ نظمیں بڑے بڑے موضوعات کو پیش کرتی ہیں اور انھیں کسی نہ کسی علامیہ کا نتیجہ قرار دیا۔ اور انھیں شاعر کی ذاتی زندگی کی ناکامیوں، محرومیوں اور داخلی کرب سے کوئی واسطہ نہیں۔ گویا احباب نے شاعر سے کہا ہوگا کہ بڑے بڑے واقعات اور موضوعات ہی عظیم شاعری کی اصل ضمانت ہوتے ہیں۔ محض ذات و شخصیت کو ہی موضوع اظہار بنایا جائے تو اس سے قنوطی اور یاس انگیز شاعری ہی وجود میں آئے گی۔ گمان اغلب ہے کہ اسی وجہ سے انھوں نے اس دیباچے کے ذریعے اپنی شاعری میں یاس اور قنوطیت کی نفی کی ہوگی۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دل کی گہرائیوں سے جو بات نکلتی ہے وہی فن کی معراج کو پہنچتی ہے۔ ایک عظیم شاعر اگر اظہار ذات کو مظاہر دنیا اور لامحدود کائنات کے ادراک سے آمیز کرکے بصورت فن پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے دیرپا اثرات ذہن و دل کے پردے پر مرتسم ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اس طرز فکر سے شعوری طور پر اجتناب کرکے اختر الایمان نے جو مقبول عام اور خارجی محرکات کے زیر اثر شاعری کی اس نے ان کی شاعری کی شدت کو نقصان پہنچایا۔ تاریک سیارہ میں شامل بیشتر نظمیں اسی خارجیت کے قبیل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً:

میں ہوں ایسا راہی جس نے دیس دیس کی آہوں کو
لے لے کر پروان چڑھایا اور رسیلے گیت بنے
چلتے چلتے جگ کے آنسو اپنے دیپ بجھا ڈالے
میں ہوں وہ دیوانہ جس نے پھول لٹائے خار چنے!
میرے گیتوں اور پھولوں کا رس بھی سوکھ گیا تھا آج
میرے دیپ اندھیرا بن کر روک رہے تھے میرے کاج...

(انجان)

لیکن یہ طریق کار زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا چونکہ اختر الایمان ایک منفرد لب و لہجے کا شاعر ہے وہ عام نظریات پر مبنی شاعری پر کیوں کر اکتفا کرسکتا تھا۔ غم انگیز اور داخلی کرب و گھٹن کی شدت کو کچھ حد تک کم تو کردیا تھا لیکن مکمل طور پر ختم نہیں کیا تھا۔ لہٰذا تاریک سیارہ کے بعد از سر نو اپنے ماضی کی جانب واپسی کا سفر اختیار کرتا ہے۔ وہ یادیں جو شاعر کی زندگی کرنے کا وسیلہ تھیں جن کو گردش ایام نے دھندلا کردیا تھا بجلی کے ایک کوندے نے ان گرد آلود یادوں کو ایک بار پھر چمکا دیا اور وہ یادیں ایک کے بعد ایک اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ مراجعت کے بعد بھی اس نے ایسی عمدہ نظمیں تخلیق کیں جن میں زخمی روح، کسک اور کرب تو نہیں البتہ پہلے سا خلوص اور ایام رفتہ کی خلش ضرور ملتی ہے۔ ماضی کی جانب مراجعت اور بازیافت کا یہ عمل تاریک سیارہ کے بعد کی نظموں باز آمد، واپسی، ریت کے محل، ڈاسنہ کے اسٹیشن کا مسافر، ایک لڑکا، یادیں، رخصت، شفقی وغیرہ میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے:

مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے اک بلائے جاں
مرا ہم زاد ہے ہر گام پر ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں

میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا خاشاک دو عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں؟...

(ایک لڑکا)

ان میں اور ان جیسی دیگر نظموں میں شاعر کی اپنے ماضی کی جانب واپسی واضح طور پر اجاگر ہوتی ہے اور یہ واپسی اس کے اپنے گزشتہ ماحول اور گزشتہ زندگی سے از سر نو ملاقات کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس مراجعت میں شاعر نہ صرف ماضی قریب کی طرف پلٹتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنے ایام جوانی سے گزر کر اپنے لڑکپن تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ جہاں ایک لڑکا جو کہ اس کا ہم زاد ہے اس کے حافظے کے پردے سے نمودار ہوکر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ مراجعت کا یہ جذبہ اس پر اس درجہ حاوی ہوتا ہے کہ وہ شدت احساس سے مغلوب ہوکر اپنے ماضی میں چھپنے کی شعوری کوشش کرتا ہے اور اپنے ہمزاد کو جھٹلا کر اسے یہ باور کرا دینا چاہتا ہے کہ اس کے باطن میں بھڑکتا ہوا شعلہ اب سرد پڑ چکا ہے جس میں کبھی ایک خاشاک دو عالم کو پھونک ڈالنے کی شدید خواہش تھی۔ لیکن اس کا ہمزاد اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ معلوم ہوتا ہے شاعر نے خود ہی ان شراروں کو راکھ تلے دفن کردیا ہے جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اب اس کو داخلی گھٹن، قنوطیت اور زندگی کی محرومیوں اور شکستگی سے کوئی علاقہ نہیں۔ جبکہ وہ جانتا ہے گرچہ غیر واضح طور پر ہی سہی ذات کی پنہائیاں، روح کی کسک، زندگی کی کشمکش، کرب اور خود نفسی کی کیفیات کو نہ تو فراموش کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز۔ ماحول چاہے جتنا بدل جائے لیکن دل کی گھٹن اور سوگواری فضاؤں میں بھی مغمومیت اور سوگواری تحلیل کردیتی ہے۔ تاہم سلسلۂ زیست کا یہ تصور ہنوز قائم اور جاری رہتا ہے۔

اس دفعہ کی مراجعت میں اسے اپنے لڑکپن کی وہ تابندہ باتیں یاد آتی ہیں جو گزرتے وقت کے ساتھ کہیں پیچھے چھوٹ گئی تھیں جن کا احساس زیاں اسے شدید کرب میں مبتلا کردیتا ہے۔ البتہ ماضی کی بازیافت میں وہ اپنے عہد کے فکری و فنی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے تجربات و مشاہدات کو اردو کی شعری روایت سے جوڑتے ہوئے فن کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ اس لیے ان کی تخلیقات میں جو دکشن جنم لیتا ہے وہ مختلف اسالیب، جدید شعری رویوں، نئی حسیت، نئے طرز احساس اور منفرد لب و لہجے کا پتا دیتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو انھیں ان کے ہم عصر شعرا میں بنیادی امتیاز بخشتا ہے۔

کتب:

1. کلیات اختر الایمان: مرتبہ سلطانہ ایمان، بیدار بخت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سنہ اشاعت 2000
2. نظم جدید کی کروٹیں: وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سنہ اشاعت 2000
3. جدید اردو نظم: نظریہ و عمل: پروفیسر عقیل احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سنہ اشاعت 2012
4. نظموں کے تجزیے: مرتبہ پروفیسر قاضی افضال حسین، مسلم ایجوکیشنل پریس، نئی اسرائیلان، علی گڑھ، سال اشاعت 2009

■

Anjum Parveen
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001

تمل زبان میں اردو تخلیقات کے تراجم

امان اللہ ایم بی

تمل ناڈو برصغیر کی وہ ریاست ہے جو اردو مرکز سے دور جنوب بعید میں واقع ہے جہاں کی عوامی و سرکاری زبان تمل ہے۔ تمل ناڈو میں تمل اور انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں کے لیے دائرہ تنگ ہے۔ اس کے باوجود چند ایسے مخصوص علاقے ہیں مثلاً وانمباڑی، آمبور، میل وشارم، آرکاٹ، کرشنگری، سیلم اور ترچناپلی وغیرہ جہاں اردو بولنے والوں کی آبادی قابل لحاظ ہے۔ چنئی شہر میں بھی اردو بولنے والوں کی خاصی آبادی ہے۔ چنئی شہر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک مرکز گزشتہ 20 سالوں سے اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس مرکز میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبا عربی اور اردو میں ڈی ٹی پی اور فن خطاطی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دیگر زبانوں سے اثرات قبول کرنے میں دراوڑی خاندان کی سب سے قدیم ترین زبان تمل اور ہند آریائی خاندان کی سب سے جدید ترین زبان اردو کی روش کئی اعتبار سے ہم آہنگ ہے۔ ہیئت، تہذیب، تاریخ اور تمدن میں گویہ دونوں زبانیں متضاد ہیں لیکن رواداری، وسیع النظری اور ملنساری کے اعتبار سے دونوں زبانوں میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دونوں زبانوں کی تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر مرحلے میں یہ ایک دوسرے سے اثر پذیر رہی ہیں۔ تمل اور اردو کے اسی اثر پذیر مزاج نے دونوں زبانوں کو قریب لانے میں مدد دی ہے۔ آج جب ہم ان دونوں زبانوں کا موازنہ کرتے ہیں تو کئی باتیں مشترک ملتی ہیں۔ اردو کی بیشتر تخلیقات کا جہاں تمل زبان میں براہ راست ترجمہ ہوا ہے تو کہیں انگریزی یا دیگر زبانوں کے توسط سے تمل میں ترجمے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے مقالے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شعری تخلیقات کے تراجم، فکشن کے تراجم اور مذہبی تراجم کے تحت الگ الگ بحث کرتے ہوئے ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔

شعری تخلیقات کے تراجم:

علامہ اقبال کی نظمیں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کا تمل زبان میں 'مُرَئی اِیذُمْ' 'بَدِلُمْ' کے عنوان سے اے ایم یوسف اور ایم اے حنیف نے منظوم ترجمہ کیا ہے جسے 1992 میں 'مَرْ مَلَرِچی پَدِپَگَم' ترچناپلی نے شائع کیا ہے۔ اقبال کے اردو اشعار کے ساتھ ساتھ ان کا تمل ٹرانسلٹریشن بھی پیش کیا گیا ہے۔ مترجمین نے اقبال کی فکر اور ان کے احساسات کی ترسیل کو تمل زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ 'شکوہ' کے کل 31 بند اور 'جواب شکوہ' کے 36 بند مجملہ 67 بندوں کا مکمل ترجمہ کرنے کے بعد اسی کتاب میں اقبال کی مشہور نظم 'تصویر درد' کا 'نَائُلی یَنْپَاز' کے عنوان سے اور اقبال کے ترانے 'ترانۂ ملی' اور 'ترانۂ ہندی' کا 'سَمُدَایَپْ پَاذَلْ' اور 'نَاٹُپْ پَنْ' کے زیر عنوان ترجمہ کیا ہے۔ ان تراجم میں مترجمین نے وہی روش اختیار کی ہے جو نظم 'شکوہ و جواب شکوہ' میں اختیار کی گئی ہے۔ ان نظموں کے ترجمے سے قبل مترجمین نے اقبال کی فکر انگیز شاعری اور اقبال کی شخصیت کا مختصر تعارف پیش کیا ہے اور ان نظموں کی تخلیق سے متعلق اقبال کے نقطۂ نظر کو واضح بھی کیا ہے۔ مترجم نے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ قارئین شکوہ کے بعد جواب شکوہ کو ضرور پڑھیں تاکہ اقبال کے مقصد و منشا تک رسائی ہو سکے۔ اس ترجمے کے آخر میں 'ماحصل' کے طور پر اس نظم کا نچوڑ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ نریم پیٹ ایم اے سلام نے بھی اقبال کی نظموں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کا تمل زبان میں ترجمہ کیا جو تمل روزنامہ 'اسی' میں شائع ہوا۔

نظم 'تصویر درد' کا تمل زبان میں منظوم ترجمہ یوسف اور حنیف نے کیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے اس نظم کے تاثر کو اول تا آخر برقرار بھی رکھا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

پُرِند دُ کولُولَئی یَانَالْ اِنْدِیَہ پیرُ مَکَلے نِینگ گَلْ اَزِنْدِدُ پووِیزْ گَلْ!
وَرَلاٹرِجْ چُوذُگ لِلْ اُنگ گَلْنیپْ پَفْرِیَہ وَذِوَمْ کُوذَ اِلَّامَلَاگُوذُمْ

اقبال کے ترانہ ملی اور ترانہ ہندی کے تمل ترجموں میں بھی وہی جوش و خروش ملتا ہے جو اقبال کے اردو ترانوں میں موجود ہے۔ 'ترانہ ملی' اور 'ترانہ ہندی' سے ایک ایک شعر ملاحظہ ہو:

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

میلَئی نَاذُگَلِنْ پَلَتْ تَاکُگَلِلُمْ یِنگ گَلْ بَانگ گولِی مُزَنگ گِیذُ!
اَلَئی یَائِیپْ پَائِنْد دُ نَمْ اُنَرچِی یَوزُکُمْ اَذَنگ گِذَوِلَئی!

☆

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

مَدَمْ اوُرُوَزْکُورُوَزْ کُرُودَتَئی بودِکَ وِلَئی
نَامْ اِنْدِیَزْ گَلْ! نَمْنَاذُ اِنْدِیَا

رباعیات امجد:

امجد حیدرآبادی کی 300 منتخب رباعیات کا تمل میں ترجمہ 'نیانَ وِڈِیلْ' کے نام سے 1994 میں نریم پیٹ ایم اے سلام نے کیا۔ یہ منتخب رباعیات کے ترجمے دراصل تمل ماہنامہ 'مسلم مُرسو' میں سلسلہ وار شائع ہوتے رہے اور تمل عوام میں اس کے تئیں پسندیدگی کا اظہار کیا گیا تو سلام صاحب نے اسے مستقل کتاب کی شکل دے دی۔

تمل ناڈو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر، ادیب و نقاد جناب علیم صبا نویدی کی تخلیقات میں ہائیکو کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ آپ کے ہائیکو کی نظموں کا مجموعہ 'تشدید' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کا براہ راست تمل زبان میں ترجمہ تمل ناڈو اردو اکیڈمی کے سابق وائس چیرمین مرحوم سجاد بخاری صاحب نے 'پے سُنم وِرَلْ گُلْ' کے نام سے کیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ تمل کے مشہور شاعر 'تمِژَنْ بَنْ' نے لکھا ہے۔ اس کتاب میں کل 172 نظمیں شامل ہیں۔ علیم صبا نویدی نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں ہیئتی تجربے کیے ہیں اسی طور ہائیکو میں بھی آپ نے 5-7-5 والی ہیئت کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ تمل زبان میں ہائیکو نظمیں لکھنے والوں میں کوی کو عبدالرحمٰن کا نام نمایاں ہے۔ تمل زبان میں ہائیکو نظموں کو رواج دینے کا سہرا آپ کے سر باندھا جاتا ہے۔ سجاد بخاری نے علیم صبا نویدی کے اردو ہائیکو کا ترجمہ کرتے ہوئے تمل ہائیکو نظم نگار کوی کو عبدالرحمٰن، تمِژَنْ بَنْ، اَروْ مَدِی، اَمُدَ بھارتی، مُو. میتا کی ہائیکو نظموں کا موازنہ علیم صبا نویدی کی ہائیکو نظموں کے ساتھ بھی کیا ہے۔ مترجم لکھتے ہیں کہ علیم صبا نویدی کی ہائیکو (اردو تخلیق) کا جو اثر ہے وہ تمل زبان میں منتقل ہونے کے بعد ماند پڑ جاتا ہے جس سے مفہوم بھی اردو ہائیکو نظموں سے قدرے مختلف ہو جاتا ہے۔

علیم صبا نویدی کی ہائیکو نظمیں اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے بھی اور گہرائی و گیرائی کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ آپ کی ایک ہائیکو جس میں انگلیاں گفتگو کرنے کا انداز تمل قالب میں یوں ہے:

پیسُم وِرَلْ گُلْ
تَالْ مِیدو اولِی مَژَئی
تُلُمْ نَدِگُلْ

تنہائی کا منظر پیش کرتے ہوئے قاری کے دل کو لبھانے والی یہ ہائیکو جس کا تمل ترجمہ یوں ہوا ہے:

وَتَکْ کَیلْ گُلْ
پَوُزْ نَمی اِرَوْ
سنگِیدَ اَلَئی

☆

مَنْ اَژُکَئی
کَنگَئیلْ کَژُوِدْ
یَدِرْ کَوَلَئی

ساہتیہ اکادمی سے ایوارڈ یافتہ محمد علوی کا شعری مجموعہ 'چوتھا آسمان' جو 1991 میں شائع ہوا اس کا تمل ترجمہ 'نَانگَاوَدُ وَانَمْ' کے عنوان سے مَگَّرنْد دَنْ نے کیا ہے۔ مگرندن چونکہ اردو سے واقف نہیں تھے اس لیے اس ترجمے کے لیے انھیں انگریزی کا سہارا لینا پڑا۔ 'چوتھا آسمان' سے ایک نظم 'کتبہ' جس کا تمل میں 'نِنَئِیوُ کَلْ' کے عنوان سے ہوا ہے نظم ملاحظہ ہو:

قبر میں اترتے ہی	یَنْ پُدَئی کُزِیٹلِرُنگ کِی
میں آرام سے دراز ہو گیا	وَسَدِیَاگ کَالَ گُلَئی اَگَئِی
اور سوچا	مَگِژْنْد دِین
یہاں مجھے	یَارُمْ اِنْگ کُو
کوئی خلل نہیں پہنچائے گا	اَبدَتُو وِلَئِی وِکّہ مَاتَارگَلْ یَنْرُو
یہ دو گز زمین	اِنْد دَ اِرَنْدْ دُو گیجَا مَنْ
میری	یَنْ سوتَاگ اِرُنْد دَ دُو
اور صرف میری ملکیت ہے	یَنَکُو مَتُّمْ سوِنْد دَ مَاگ
اور میں مزے سے	سَاوَ گَاسَمَاگ نَان
مٹی میں گھلتا ملتا رہا	کَرَئِی یَتْ تُونگ کِنِین مَتِّلَ
وقت کا احساس	کَالَ اُنَرْوُ
یہاں آکر ختم ہو گیا	اِنگ کُووِنْدُ نُو مَرَنْدُ دُ وِتُّو
میں مطمئن تھا	نَان نِمَدِیَاگ اِرُنْد دِین
لیکن بہت جلد	آنَال
یہ اطمینان بھی مجھ سے چھین لیا گیا	نِینْدَ نِیرَتْ تِرکَلَئِی
ہوا یوں	نَان
کہ ابھی میں	اِنُمْ
پوری طرح مٹی بھی نہ ہوا تھا	مُژُدُمْ مَنَاگ وِلَئِی
کہ ایک اور شخص	اَدرُکُل اِنُورُوَنْ
میری قبر میں گھس آیا	یَنْ کَلَرْتِیَئِی آکَرَمِتُّکْ کونْد دَانْ
اور اب	اِپُودُ
میری قبر پر	یَنْ کَلَرْتِیَنْ مِیدُو
کسی اور کا	اِنُورُوَنِنْ
کتبہ نصب ہے!!	نِنَئِیوُکْ کَلْ اِرُکّرِدُو!!

ایم اے سلام نے ماہرالقادری کی مشہور نظم 'طاقوں میں سجایا جاتا ہوں' کا تمل زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ دینی موضوعات پر بھی آپ کے کئی تراجم اردو سے تمل زبان میں شائع ہوئے ہیں جس کا تذکرہ مذہبی تراجم کے تحت آئے گا۔

کوی کو عبدالرحمٰن تمل زبان کے جدید شعرا میں اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ آپ کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ نے تمل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تمل شاعری کی بدولت ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔ آپ نے علامہ اقبال، بہادر شاہ ظفر اور فیض احمد فیض جیسے مشہور شعرا کے منتخب کلام کا تمل میں ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں تمل شاعری میں صنف غزل اور ہائیکو کو رواج دینے کا سہرا بھی آپ ہی کے سر جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن نے اردو غزل کو تمل میں متعارف تو کرایا ہے لیکن انھوں نے اردو غزل کی ہیئت اور اس کے مزاج کو قائم نہیں رکھا اور اس کی ہیئت کو سرے سے بدل دیا ہے۔ البتہ موضوعات کے ساتھ ساتھ غزل کے تلازموں کو جوں کا توں قائم رکھ کر تمل غزل کی بنیاد رکھی۔ علاوہ ازیں، غزل کے معروف تصورات کو نہ صرف تمل غزل میں جاری رکھا بلکہ ان تصورات کو تمل نظموں میں بھی استعمال کیا۔ عبدالرحمٰن نے اردو غزل کے بعض کلاسیکی استعاروں کو بالکل نئے ڈھنگ سے استعمال کیا ہے نیز کوی کو عبدالرحمٰن کی شعری تخلیقات سے تمل میں اردو شاعری کے کئی تصورات عام ہوئے ہیں۔

کوئمبتور میں فیض احمد قادری نے علامہ اقبال کی منتخب نظموں کا براہ راست اردو سے تمل زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے شعری مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے

اقبال کی قومی نظموں اور ترانوں کا تمل کے ثقافتی پس منظر میں ترجمہ کیا اور 2007 میں 'اوز دان اُلگ مہا کوی علامہ اقبال' کے عنوان سے شائع کیا۔ فیض قادری کو دونوں زبانوں اردو اور تمل میں مہارت حاصل ہے۔ آپ کے والد اور دادا اردو کے اچھے شاعر تھے۔ آپ کے والد نے اقبال کی نظموں کا ترجمہ تمل زبان میں کیا تھا جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے لیکن وہ اب دستیاب نہیں ہیں۔ فیض احمد قادری نے جب اردو کی منتخب غزلوں کے اشعار کا ترجمہ تمل زبان میں 'مان کن' کے نام سے پیش کیا تو اس سے تمل شعراء کے اندر اردو غزل سے بھی دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمل کے شعرا نے اردو کے کلاسیکی اور جدید شعرا مثلاً میر، مومن، غالب، بہادر شاہ ظفر، داغ، شیفتہ، علامہ اقبال، سیماب اکبرآبادی، ناصر کاظمی، جگر، آنند نرائن ملا اور فیض کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ مشاہیر کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہوں:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

کادلْ یَنْ بدْ سُلَبْ مَانَدْ اِلّئی اِوْلَوْ مَنُمْ تیرِنْد ڈُ کولُنْگ گلْ
اَدُو اوزْ نیرُپُكْ كَدَلْ اَدِلْ موزْگِتْ تان كَرَئی ایرَ وینْدْ دُمْ

☆

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یَنْد دَ اورْ سیلُم سُلَبْ مَاوَدْ یَنْ بَدْ كَدِنَمانَدْ دان
مَنِدَنْگم مَنِدَناگم باكِیَمْ كِدَئیپْ دِلّئی یے

☆

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

نیِنْدْ دَ آیُلئی کیٹُو نانْگ نانْكَلئی وَانْگ گوَنْدین
اِرَنْدْ ڈُ آسَئی ویلَّتْ تِلْ كَزِنْد دَدْ اِرَنْدْ ڈُ یَدِرْ پَارِتّلْ

☆

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

نِیی مَنُكْ كَاگ اُمْ اَلّه وِنُكْ كَاگ اُمْ اَلّه
اُلَگُمْ اُنَكْ كَاگ نِیی اُلَگُتْ تِرْكَاگ اَلّه

اس کے علاوہ فیض قادری نے اقبال کی ایک اور مشہور نظم 'بچے کی دعا' کا تمل زبان میں منظوم ترجمہ 'كُزَنْد دَئیِنْ پِرَازْتَنئی' کے عنوان سے کیا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

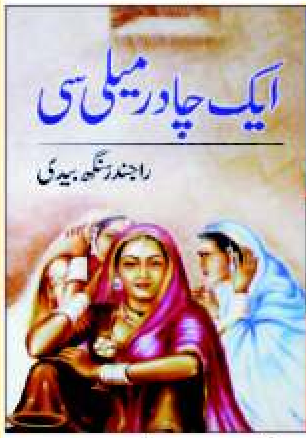

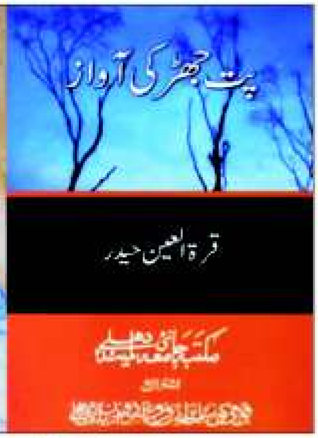

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

یَنُدَئیه آسَئی اِدزْ گلِنْ مُولَمْ پِرَازْتَنئی ویلِپُدْ گِرَدْ اِرَئیوَا
یَنُدَئیه وَازْكَئی يَئی وِلَكَئیپْ پونْرْ اولی مَیمَانَدائی آكُوَایاگ
یَنُدَئیه سَكْتِیالْ اُلَكِنْ اِرُلْ گ لیلَامْ وِلَكُنْمْ
یَنُدَئیه اولِرْ وَالْ اووَاوزْ اِدَمْمْ اولی پیرَنُمْ
مَلزْ گلَالْ پونگ گا اَزْگ پیرُوَدَئیپْ پولَه
یَنُدَئیه اَنْرَلَالْ یَنُدْ دیسَمْ اَزْگ پیرَنُمْ
اِرَئیوَا وِنَلْ پُوچِی یَئیپْ پولَه یَنُدَئیه وَازْكَئی يَئی اَمئیپْ پایاگ!
كَلِوی یَنُمْ وِلَكِنْ میدْ یَنكُو كَادَلئی ایزْ پَدُتُوایاگ!
ایزَئی گلُكُو اُدوی سیئی وَدُمْ دُكِتْ تِلزُہوزْ گ لِدَتِلُمْ
مُدِہوزْ گ لِدَتِلُمْ انُبو سیلُتُودُمْ یَنُدَئیه یَئی یَاگ اَمئی یَنُمْ
یَنْ اِرَئیوَا!! تِیمَئی اِلزُنْدُدْ یَنُتْكْ كَاپَانْرُوَایاگ
تُویَه وَزِی یدَاوه اَنْدَدْ وَزِیلْ یَنَّئی نَدَئی یَئِلَه وَنپْ پایاگ

فکشن کے تراجم:

ساہتیہ اکادمی نے اردو کی تخلیقات کو تمل کا جامہ پہنانے کی جو کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں راجندر سنگھ بیدی کا ناول 'ایک چادر میلی سی'، انتظار حسین اور آصف فرخی کا مرتب کردہ افسانوی مجموعہ 'پاکستانی کہانیاں'، قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے 'پت جھڑ کی آواز' اور گلزار کا افسانوی مجموعہ 'راوی پار' کا تمل زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ ناول 'ایک چادر میلی سی' کا ترجمہ تمل زبان میں 'پولیوْ اِزَنْد پورْوَئی'' کے نام سے ٹی۔ راجن نے کیا ہے جسے ساہتیہ اکیڈمی نے 1986 میں شائع کیا۔ 'پاکستانی کہانیاں' کا ترجمہ تمل میں 'پاکستان سِرُو كَدَئیگلْ' کے عنوان سے ما۔ رام لِنگَمْ نے کیا اور 2010 میں یہ مجموعہ شائع ہوا۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوی مجموعے 'پت جھڑ کی آواز' کا 'اُدِرُمْ اِلَّئی گلِنْ اوہ سَنئی' کے نام سے تمل ناڈو کی مشہور قلمکار اور سابق ڈی جی پی محترمہ تِلَّكَوَتی آئی پی ایس نے ترجمہ کیا ہے اور گلزار کا افسانوی مجموعہ 'راوی پار' کا 'راوی نَدِئلْ' کے عنوان سے شیو شنکری نے تمل کے قالب میں ڈھالا ہے۔ خورشید عالم خاں کی تصنیف 'ڈاکٹر ذاکر حسین' کا ترجمہ 'ڈاکٹر ذاکر حسین۔ اردو کَلْوِیَالَرْ' کے عنوان سے سدھارتن نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ تمام تراجم کی اشاعت کا کام ساہتیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام ہوا ہے۔

پریم چند کا نمایاں افسانہ 'کفن' کا بزبان تمل 'سَوَت تُنی' کے نام سے فیض قادری نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ افسانہ 'اردو الکَیَم اوز اَرِمُگَم' کتاب میں شامل ہے جو 2007 میں منظر عام پر آئی۔ مترجم نے پریم چند کے افسانے کو اسی انداز اور اثر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد اس افسانے کا بامحاورہ تمل زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے جس سے تمل قاری کو پریم چند کی افسانہ نگاری اور ان کے فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اردو فکشن کے مشہور نام کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے منتخب افسانوں کا ترجمہ را۔ ویزی نادن نے 'اردو کَدَئی گَلْ-I' کے نام سے کیا ہے جو نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، نئی دہلی سے پہلی مرتبہ 1978 میں شائع ہوا جس کی دوسری اشاعت 1987 میں عمل میں آئی۔ اس کتاب سے یہ اندازہ ہوا کہ پروفیسر اختر اور ینوی نے 'اردو افسانے حصہ اول' کے نام سے تین مشہور افسانہ نگاروں کا انتخاب پیش کیا تھا جسے را۔ ویزی نادن نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے زیر اہتمام اسے تمل کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کہیں بھی اردو افسانے کے انتخاب کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔ بہر کیف جن افسانوں کا ترجمہ ہوا ہے زبان و بیان کے لحاظ سے اور پیش کش کے لحاظ سے بھی قابل اعتنا ہے۔ کرشن چندر کے افسانے 'پورے چاند کی رات' کا 'مُژُو نِلَوْ'، اور دیگر افسانے 'کُیِنْچِ چامیار'، 'غالیجہ' کا 'جَمُکّالَم'، 'نَارْ چندك كَنَرْ'، 'نو اُمْ یس اُمْ' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے 'لمبی لڑکی' کا 'اَئِی'، 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کا 'تَنْگ گَلْ تُیَرْنِی یَنَكْ کُتَارْنگ گَلْ'، افسانہ 'لاجونتی' کا 'تونَار چُرْنگ گِی'، 'بیل' کا 'بِیَل' اور ٹرمینس سے پرے' کا 'یَلَئیگُو اَپَالْ' کے عناوین سے ترجمہ کیا ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے کا 'اوڑ چنّ وِشَیَم'، 'چوتھی کا جوڑا' کا 'مَنَجِ چیلَئی'، 'امربیل' کا 'اَمَرَوَلِی'، 'دو ہاتھ' کا 'اِرَنْدُ ذُ كَئی گَلْ' اور افسانہ 'بچھو پھوپی' کا 'بچو اَتّئی' کے نام سے ترجمہ ہوا ہے۔ یہاں مترجم نے ان افسانوں کا براہ راست اردو سے تمل میں ترجمہ کرنے کے بجائے انگریزی کے توسط سے تمل زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے جس کے سبب لفظ 'بچھو' کا انھوں نے 'بچو' کے معنی میں ترجمہ کیا ہے جو بچی پھوپی کے معنی رکھتا ہے۔ یہ غلطی در اصل مترجم کی اردو سے ناواقفیت کے سبب ہوئی ہے جس کا انہیں احساس ہے۔

ڈاکٹر حیات افتخار نے تمل ادب کی تاریخ کا براہ راست ترجمہ تمل زبان سے اردو میں کیا جسے ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے 1991 میں شائع کیا۔ مو۔ ورداراجن کی اصل تمل تصنیف 'تمل الكیه ورلارو' کا شمار تاریخ تمل ادب پر لکھی گئی بہترین تصنیفات میں ہوتا ہے اور تمل زبان و ادب کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بنیادی حوالے اور ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ اردو دانوں کو تمل زبان و ادب کے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے لیے بنیادی ماخذ کا کام دیتا ہے۔ تاریخ تمل ادب کا اردو ترجمہ جہاں اردو دانوں کو تمل ادب سے روشناس کرانے کے لیے کیا گیا تھا اسی طرح تمل والوں کو اردو ادب خاص طور پر اردو افسانوی ادب کے شہ پاروں سے متعارف کرانے کے لیے آپ نے اردو کے بعض عمدہ اور شاہکار افسانوں کو تمل زبان میں منتقل کیا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی، سعادت حسن منٹو کے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا تمل ترجمہ تھا جو تمل ماہنامہ 'منجری' مئی 1984 میں 'سوندو ناڈو' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی دوبارہ اشاعت منٹو کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر دسمبر 2012 میں جب شعبہ عربی فارسی و اردو مدراس یونی ورسٹی نے منٹو صدی تقریبات کے سلسلے میں ایک شاندار بین الاقوامی سمینار منعقد کیا تھا جس میں منٹو کو خراج عقیدت کے طور پر آپ نے 'سعادت حسن منٹو اُم اردو سِرُ کَدَئی یُم' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں منٹو کی افسانہ نگاری سے متعلق بسیط مضمون 'منتو اور اَرِمُگَم' لکھ کر منٹو کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کے مشہور افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا براہ راست اردو سے تمل میں ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے جدید افسانہ نگار شوکت حیات کا افسانہ 'آگ' کا ترجمہ 'تیی' کے نام سے کیا جو تمل ماہنامہ 'اَنّم وِڈو توڈو' (دسمبر 84ء) میں شائع ہوا۔ ہندی کے مشہور افسانہ نگار پرکاش کانت کے افسانے کا اردو ترجمہ ماہنامہ 'شاعر' میں 'پاپا ہم ہندوستان لیں گے' شائع ہوا تو اس کا تمل ترجمہ آپ نے 'وِلَئیَانُو بومَئی' کے نام سے کیا اور وہ بھی تمل ماہنامہ ''منجری'' میں شائع ہوا۔

کرشن چندر کا ڈراما 'دروازے کھول دو' کا ڈاکٹر پی احمد باشاہ نے 'کَدَوْگَلَئی تِرَنْد ذ وِڈنگ گَلْ' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ احمد باشاہ نے اس ڈرامے کے کردار اور ان کے مکالموں کو تمل میں منتقل کرتے وقت تمل زبان کا لحاظ بھی رکھا ہے اور اردو کے ماحول کا پاس بھی۔ اس اصل ڈرامے کا مقدمہ جو خواجہ احمد عباس نے لکھا ہے اس کا تمل زبان میں ترجمہ سجاد بخاری نے کیا ہے۔ مترجم نے اس ڈرامے کے عنوان کا ترجمہ 'کَدَوْگَلَئی تِرَنْد ذ وِڈنگ گَلْ' کیا ہے اس کے معنی اردو میں 'دروازے کھول کر چھوڑ دو' ہوئے۔ در اصل 'کَدَوْگَلَئی تِرَنْد دِڈنگ گَلْ' ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی ان کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔

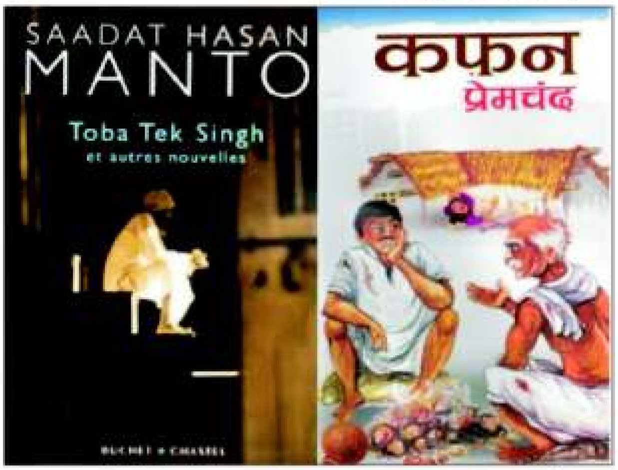

تمل ناڈو کے مشہور افسانہ نگار، شاعر و ادیب، محقق و استاد مرحوم یعقوب اسلم عمری کے افسانوی مجموعہ 'چہروں کی دیوار' جس میں کل 15 افسانے شامل ہیں کا ایم اے سلام نے 'مُنَدْ ذَانَئی مَلَرْ گَلْ' کے نام سے 2010 میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ یعقوب اسلم عمری تمل ناڈو کے افسانوی ادب کے حوالے سے ایک نمایاں نام ہے۔ آپ کے دیگر افسانوی مجموعے 'دو ندیوں کے پار' اور 'امر کہانیاں' منظر عام پر آ کر قارئین ادب سے داد و تحسین بھی حاصل کر چکے ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ 'چہروں کی دیوار' کے تمل ترجمہ کا محرک محترمہ کنی موژی، ممبر پارلیمنٹ ہیں۔ محترمہ خود بھی تمل کی شاعرہ ہیں آپ نے ایک کتاب کی رسم اجراء میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ انھیں اردو زبان سے لگاؤ ہے، وہ اردو کے ادبی سرمایہ سے والہانہ دلچسپی رکھتی ہیں اور ان کی مجبوری ہے کہ وہ اردو زبان پڑھنا نہیں جانتیں اس لیے اگر اردو کی تخلیقات کا تمل زبان میں ترجمہ ہو جائے تو اس ادبی سرمایہ سے خاطر خواہ استفادہ ہو سکتا ہے۔ اس تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے یعقوب اسلم صاحب نے جناب ایم اے سلام صاحب جو اردو اور تمل دونوں زبانوں کے لیے ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں سے رجوع کیا اور اس طرح ایک افسانوی مجموعہ 'مُنَد ذَانَئی

مَلَز گُل' کے عنوان سے منظر عام پر آ گیا۔ یہ کوشش قابل تحسین اور خوش آئند ہے۔

مختار بدری تمل ناڈو کے ممتاز شاعر، معروف ادیب و بہترین مترجم کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ مختار بدری کی ادبی کاوشوں کی بساط کافی وسیع ہے۔ تقریباً سات دہائیوں سے وہ لکھ رہے ہیں۔ انھیں ملال ہے کہ درمیانی پچیس برس خوابوں کے تعاقب میں گذر گئے۔ جب منزل آسان ہوئی تو ان کے اندر کا فن کار لوٹ آیا۔ ان کے نزدیک ایک فن کار کے لیے سیرابی نہیں بلکہ تشنگی ضروری ہے۔ مختار بدری نے جس زمانے میں ترجمہ نگاری کی طرف توجہ دی، ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ انھوں نے اردو کہانیوں کو تمل میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ہفتہ وار 'کللئی منرم'، ماہنامہ 'کللئی ارنگم'، ہفت روزہ 'کللکی'، ماہنامہ 'اموده سُرَبی' وغیرہ میں یہ کہانیاں متواتر شائع ہونے لگیں۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، رام لعل، کرتار سنگھ دُگل، انور جلال، عادل رشید، عائشہ حکیم، سہیل عظیم آبادی، پرکاش پنڈت، ذکی انور، اختر عادل روپ، یوسف منان جیسے نامور ادیبوں کے افسانوں کو اردو زبان سے تمل کا روپ دیا۔ خواجہ احمد عباس کی کہانیوں کے دو مجموعوں 'مصور' اور 'لوٹ آئو بابو' کو مختار بدری نے 'اووِیَنْ' اور "تِرمبی وازنگل بابو" کے نام سے سری 'مگل کمپنی' سے شائع کیے۔ چند ہی برسوں میں خواجہ احمد عباس کے ناول اور افسانوں کے مجموعے تمل زبان میں منظر عام پر آنے لگے۔ دو ایک سال تو ایسے بھی گذرے کہ اردو کا مسودہ صاف بھی نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کا تمل ترجمہ کتابی شکل میں عباس صاحب کے ہاتھوں میں ہوتا۔ مختار بدری نے خواجہ احمد عباس کے ناولوں اور کہانیوں کے مجموعوں کو تمل زبان میں شائع کیا۔ مختار بدری نے خود ایک اچھے ناول نگار ہونے کا ثبوت بھی دیا انھوں نے تمل زبان میں اپنی تخلیق 'ناگ سانتِي' شائع کی اور پھر نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی کے لیے جیلانی بانو کے ناول 'ایوان غزل' کا تمل زبان میں 'کوِدَالَیَم' کے نام سے ترجمہ کیا۔ مختار بدری نے کل اڑتالیس (48) سے زیادہ کتابیں ترجمہ کیں، آپ نے تمل زبان سے بھی کئی شاہکار افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو سے تمل میں جو تراجم ہوئے ان میں سے چند کے نام ملاحظہ ہوں۔ اووِیَنْ (مصور)، تِرمبِی وَازُنگ گُلْ بابو (لوٹ آؤ بابو)، سِرمِیْمْ سَمْقِرَمْمْ، اِرُلْمْ اولِی یُمْ اِرَوَنْ کَرَنگ گُلْ، اَرُنودَیَمْ، مَنِدَنْ وَازُگِرَانْ، نَمبِکَئی نَنْچِتْ تِرَمْ (اس میں بیس اردو افسانہ نگاروں کی کہانیاں ہیں)، آرْ اِنْد دِیرْ گُلْ، نکسلاتُکَلْ، کَنَّادِچْ چُوزگُلْ، مُوْنُرْ چِکَرَنگ گُلْ، اِرْ تِلی نِیرْ، نَانگو نَنبِرگُلْ، لیله مجنو، عباسِنْ کَدئی گُلْ، گودْمَنئیمْ روسا اُمْ، کَادَلْ سیئی گرایا کادَلْ وغیرہ۔

تمل زبان میں عادل رشید کی کہانیوں کا مجموعہ 'کَدئی سولَتْ تُما؟' اور ناول 'روپ' دیا نندورما کے نفسیاتی مضامین کا ایک مجموعہ 'آپ اور آپ کے مسائل' کا 'نینگ گلُمْ اُنگ گُلْ پِرَچِنَئی گَلُمْ' منظر عام پر آئے۔ مہندر ناتھ کا ناول 'رات اندھیری ہے' بھی شائع ہوا۔ ترجمہ نگاری کی دشواریوں کا مختار بدری کو بخوبی احساس ہے۔ انھوں نے تمل سے اردو اور اردو سے تمل لغات ترتیب دے کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس سے اردو اور تمل دونوں زبانوں میں تبادلہ ادب کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ غرض فکشن کا ایک معتد بہ حصہ تمل زبان سے اردو میں اور اردو سے تمل زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ مختار بدری نے تمل کہانیوں کو اردو میں پیش کیا ہے، اور اردو کی بہت سی نگارشات کو تمل کا قالب عطا کیا ہے۔

مذہبی تراجم:

جہاں تک تمل اور اردو ادب کا ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا سوال ہے، یہ بات

تمل اور اردو دونوں زبانوں کے ادیبوں کے لیے اور ان دوزبانوں کی ہیئت اور ادب کے مشترک پہلوؤں کی نشاندھی اور اس سے پیوستہ تناظر پر گفت و شنید کے لیے اب راہیں ہموار ہوچکی ہیں. ہمیں یقین ہے کہ اردو کی تخلیقات سے تمل ادب میں اضافے ہوتے رہیں گے اوراسی طرح تمل کا ادبی سرمایہ بھی اردو کو میسر ہوگا.

وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تمل کے جدید شعرا، مصنفین اور مترجمین نے اردو ادبیات کا اثر قبول کیا ہے۔ اس سلسلے میں ترجموں سے بڑی مدد ملی ہے۔ تمل میں عربی اور فارسی تصانیف کے ترجموں کی ایک مستحکم روایت ہمیں ملتی ہے۔ فارسی شعرا خیام اور رومی کے بعد اردو کے شاعر علامہ اقبال اور دیگر شعرا کے کلام کے ترجمے ملتے ہیں۔

اردو کی کہانی:

سید فیض احمد قادری نے تمل دنیا کو اردو ادب کی تاریخ سے متعارف کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ کو تمل ناڈو کے غیر اردو دانوں تک پہنچانے میں پہل کی ہے۔ 'اُردو اِلَکِیَمْ اور اَرِمُگَمْ' کے عنوان سے انھوں نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جو دراصل سید احتشام حسین کی تصنیف 'اردو کی کہانی' کا ماخذ ہے۔ اس کتاب میں سید فیض احمد قادری نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے احتشام حسین کی تصنیف کا صرف 60 فیصد ترجمہ کیا اور حسب ضرورت حذف و اضافہ بھی کیا ہے۔ فیض قادری نے اردو کی کہانی میں جو ابواب شامل کیے ہیں جیسے زبانوں کا گھر ہندوستان، اردو زبان کی ابتدا، گھر سے دور دکھنی ہندوستان میں، ولی کی شاعری، ترقی کا زمانہ، پچھم سے پورب تک، نظیر اکبر آبادی، دبستان لکھنؤ، نثر کی ترقی، دلی میں ایک بہار اور، نئی منزل کی طرف، کچھ نئے کچھ پرانے، نیا زمانہ نیا ادب، کچھ ضروری اشارے جیسے ابواب کو برقرار رکھا ہے پھر اس کے بعد تمل ناڈو میں اردو 'تمل ناڈُمْ اردو موڑیُمْ' کے نام سے ایک اہم باب کا اضافہ بھی کیا ہے جس میں تمل ناڈو میں اردو ادب کی تاریخ اور اس کی ترویج و اشاعت کا جائزہ لیا ہے جو یقیناً معلومات میں اضافہ کا باعث ہے۔ اسی کتاب کے آخر میں فیض قادری نے 'دورِ حاضر میں اردو' کے عنوان سے عالمی سطح پر اردو کی مقبولیت کا جائزہ بھی لیا ہے۔

الحاصل یہ کہ ریاست تمل ناڈو کی سرکاری زبان تمل ہے اور اردو والوں کا تعلق تمل زبان سے ایک عرصے تک صرف بول چال کی حد تک ہی رہا اس لیے اس کے ادب سے واقفیت کے معاملے میں گریباں اور دامن کا فاصلہ رہا ہے۔ ایک عرصے تک اس فاصلے کو پاٹنے کی کوشش نہیں کی گئی البتہ آزادی کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ان دونوں زبانوں کے درمیان ترجموں کے ذریعہ پل تعمیر کرنا ناگزیر ہو گیا تو یہاں کے ادیبوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور حتی المقدور تمل زبان میں اُردو کی تخلیقات کو روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ تمل اور اردو دونوں زبانوں کے ادیبوں کے لیے اور ان دو زبانوں کی ہیئت اور ادب کے مشترک پہلوؤں کی نشاندہی اور اس سے پیوستہ تناظر پر گفت و شنید کے لیے اب راہیں ہموار ہو چکی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کی تخلیقات سے تمل ادب میں اضافے ہوتے رہیں گے اور اسی طرح تمل کا ادبی سرمایہ بھی اردو کو میسر ہوگا۔ اس طرح ایک صحت مند اور مثبت روایت لسانی مطالعوں کے میدان میں راہ پائے گی جو گلوبلائزیشن کے اس دور میں لسانیاتی اتحاد اور ارتکاز کی کوششوں میں سودمند ہوگی۔

■

Dr. Amanullah MB
Asst. Prof. Dept of Arabi, Farsi & Urdu
Madras University- 600005 (Tamil Nadu)

عطیہ حسین

مظفر حسین سید

ہندوستان میں تخلیقی ادب اور خصوصاً اُردو ادب کے تعلق سے بیسویں صدی کا عشرہ دوم خاصا فنکار خیز تھا۔ ابھی عشرہ اوّل میں کئی ممتاز ادیب و شاعر (مثلاً داغ دہلوی، مولانا حالی، علامہ شبلی، رتن ناتھ سرشار اور محمد حسین آزاد، جہان ادب سے رخصت ہوئے تھے اور عشرۂ دوم میں، ان کا خلا، پر کرنے کی غرض سے نہ سہی، مگر اُردو ادب اور جہان سخن کو ایک نئی جہت اور ایک نئی تازگی بخشنے کے لیے متعدد قلم کار اس عالم رنگ بو میں تشریف آور ہورہے تھے۔ (مثلاً سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، سردار جعفری اور معین احسن جذبی وغیرہم) یوں عطیہ حسین ان تمام موقر ادبا و شعراء کی تقریباً ہم عصر تھیں۔ مگر وہ ان کی طرح خوش قسمت ثابت نہ ہوسکیں کہ، ان کی صدی دھوم دھام سے منائی جاتی، جیسی کہ اکثر ادباء وشعراء کی منائی گئی۔ شاید ان کا قصور یہ تھا کہ اردو کی عالم و فاضل ہونے کے باوصف انھوں نے اپنا ذریعہ اظہار انگریزی کو بنایا، اور اُردو کو جزوی طور پر بھی نہیں اپنایا، اگر وہ بھی احمد علی کی طرح ہر دو زبانوں کی قلم کار ہوتیں تو شاید ان کی صدی بھی شاندار نہ سہی، ایک محدود پیمانے پر منائی جاتی۔ اس ضمن میں یہ اعتراض درج کرایا جاسکتا ہے کہ عطیہ حسین غیر اُردو ادیبہ تھیں، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ خوش ونت سنگھ بھی تو انگریزی کے مصنف تھے، جن پر اُردو میں خوب لکھا گیا اور راجندر یادو ہندی کے ادیب تھے مگر ان پر بھی اُردو میں بہت نہ سہی کچھ نہ کچھ لکھا ہی گیا۔ اگر اُردو کا دامن وسیع تر کرنا ہے تو ہمیں اپنے اذہان کو مزید کشادہ کرنا ہی ہوگا۔ ستم در ستم یہ کہ ہندوستانی انگریزی ادب (انڈو اینگلین لٹریچر) کے باب میں بھی کوئی ان کا نام نہیں لیتا۔

انگریزی زبان کی موقر و موثر ادیبہ عطیہ حسین اگر آج حیات ہوتیں تو ان کی عمر 105 برس ہوتی۔ 2013 ان کی صدی کا سال خاموشی سے گزر گیا، نہ کسی نے انھیں یاد کیا، نہ کوئی جلسہ منعقد ہوا، نہ کسی جریدے کا کوئی خصوصی شمارہ شائع ہوا، انھیں خراج عقیدت پیش کرنے لیے کسی رسالے کا کوئی گوشہ بھی مختص نہ ہوسکا۔

اپنی دانشوری اور نابغگی کی قوت پر عطیہ حسین اسی ذہنی رفعت پر فائز تھیں، جس پر ہماری کئی دیگر خواتین دانشور (مثلاً رشید جہاں، ممتاز شیریں اور بعد ازاں قرۃ العین حیدر) جلوہ گر تھیں۔ افسوس کہ عطیہ حسین کی صحیح قدر و قیمت نہیں آنکی گئی، غالباً ان کی انگریزی تصانیف کے اردو تراجم بھی ابھی تک نہیں ہوسکے ہیں (اگر ان کے ورثاء اجازت دیں تو راقم اس سمت میں اپنی خدمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرسکتا ہے۔)

عطیہ حسین نے 1913 میں ایک شدید تصادماتی و شورشی پس منظر میں اس جہان رنگ و بو میں قدم رنجہ فرمایا، اُس وقت شہر سخن لکھنؤ میں بدلتی اقدار، زوال آمادہ تہذیب اور نئے مغربی خیالات، جیسے موضوعات پر زبردست مباحثے و مناظرے جاری تھے، ان کا خاندان اپنی قدیم روایات کی پاسداری کے باوصف ترقی پسندانہ خیالات کا حامل تھا۔ ایک جانب ان کے والد محترم دانشگاہ کیمبرج سے فارغ التحصیل تھے، تو دوسری طرف ان کی تعلیم یافتہ والدۂ مکرمہ نے خواتین کی تعلیم وفلاح کے لیے لکھنؤ میں ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا، اور یہی لکھنؤ عطیہ حسین کا وطن تھا۔ خود عطیہ حسین کی تعلیم لکھنؤ کی منفرد تعلیمی درس گاہوں، اوّلاً مارٹییر ے گرلس اسکول اور ثانیاً ازابیلا تھوبرن کالج میں ہوئی، یہ دونوں تعلیمی ادارے جدید تعلیم نسواں کے لیے وقف تھے۔ انگریزی تعلیم کے علاوہ ان کے والدین نے گھر پر دینیات، نیز عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم و تدریس کا نظم بھی کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلم خواتین کی تعلیم جدید ایک اہم بلکہ متنازعہ موضوع کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ اگرچہ متعدد مصلحین قوم و ماہرین تعلیم اپنی نگارشات کے ذریعے تعلیم نسواں کی بھرپور وکالت کررہے تھے، مگر اس کے باوجود دختران اشراف کا خالصتاً انگریزی تعلیم حاصل کرنا ایک عجوبہ تھا۔

برطانوی ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی تعلیم جدید کے بانی و عظیم مصلح معاشرہ سرسید اگرچہ ابتداً دختران اسلام کی باضابطہ تعلیم کے حق میں نہ تھے، اور اس امر کی وکالت کرتے تھے کہ مسلمان لڑکیوں کے لیے گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی دینیات عربی، فارسی، اور اردو کی تعلیم کافی ہے، تاہم ان کی رائے بعد ازاں تبدیل ہوئی تھی، اگرچہ خود انھیں ان کی حیات نے یہ موقع فراہم نہیں کیا کہ وہ دختران ملت کے لیے علاحدہ سے کوئی تعلیمی ادارہ قائم کرتے مگر ان کے مقلد رشید شیخ عبداللہ نے ایک بے

مثل کارنامہ انجام دے کر بنات مسلم کے لیے ایک اعلیٰ سطح پر تعلیمی ادارہ قائم کیا، جو آج درسگاہ نسواں کے نام سے موسوم اور دانش گاہ سے ملحق ہے۔ اس کے بعد دیگر حضرات نے ان کی تقلید کی اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے متعدد ادارے قائم کیے۔ مزید برآں اردو کے موقر ادیب ڈپٹی نذیر احمد کی 'بنات النعش' جیسی تصنیف منظر عام پر آچکی تھی، جس میں تعلیم نسواں کی پُر زور وکالت کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس دور کے لکھنؤ میں تعلیم نسواں کی حامی کئی تنظیمیں فعال تھیں، نیز خواتین کے رسائل نکل رہے تھے، جو تعلیم نسواں کے تئیں بیداری کے علمبردار تھے۔

درحقیقت 1920 اور 1930 کے عشروں کا لکھنؤ خاصا سرگرم و پُر جوش تھا، آزادی خیال، انسانیت نوازی، مارکسیت اور ترقی پسند نظریات، اس شہر کی آب و ہوا میں گردش پذیر تھے اور ان افکار کے حاملین خواتین کی ترقی، خودمختاری و مساوات کی حمایت میں بنیاد پرست، روایت پسند اور مغرب مخالف فکر پر مصر طبقات سے نبرد آزما تھے۔ اس ماحول میں عطیہ حسین نے موقر انگریزی اخبارات 'پائنیر' و 'اسٹیٹسمین' میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ اسی دوران 1932 میں افسانوی مجموعہ 'انگارے'، دور رس ثقافتی و دانشورانہ نتائج کے حامل ایک واقعے کی شکل میں منصۂ شہود پر وارد ہوا۔ اس ہنگامہ خیز مجموعے میں سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانے اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔ لکھنؤ کے ان چار نوجوان دانشوروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے مغربی نظریات کو متعارف کرایا تھا نیز اپنی تحریروں کے توسط سے عصری مسلم معاشرے کی تادیب کی کوشش بھی کی تھی، ان انقلابی، جدت پسندانہ صداؤں نے عطیہ حسین کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے، اپنے جاگیردارانہ پس منظر کے باوجود وہ اپنے طبقے اور اپنے معاشرتی گرد و پیش میں رواں دواں منافقانہ و متضاد رویوں کا احساس و ادراک کرنے پر قادر تھیں۔ یہ امر تعجب کا باعث ہے کہ 'انگارے' میں عطیہ حسین کی کوئی نگارش کیوں شامل نہ تھی، جبکہ وہ ہر طرح اس کی اہل تھیں اور ترقی پسندانہ نظریات کے حامل نوجوانوں کے گروہ سے ان کے روابط استوار تھے۔ خود اُن کے برادر حقیقی بائیں بازو کے رجحانات کے پیروکار تھے، ملک راج آنند، احمد علی اور سجاد ظہیر جیسے قدآور ادیبوں کے حلقے میں شامل تھے، اور جب 1936 میں عظیم ادیب پریم چند کی صدارت میں ترقی پسند تحریک کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا تو عطیہ حسین اس کے فعال شرکا میں شامل تھیں۔ عطیہ حسین کا حساس ذہن اپنے اعلیٰ جاگیردارانہ طبقے اور اس میں پیوست سماجی درجہ بندی، ناخواندگی، افتراق و امتیاز اور خواتین کے استحصال کا مشاہدہ کرتے بُری طرح بے قرار و بے چین تھا۔ اعلیٰ خیالات کی حامل اُن کے مثل خاتون کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ بائیں بازو کی فکر اور قوم پرستانہ نظریات کا اثر قبول نہ کرتی، اور یوں بھی ان دنوں کا لکھنؤ ایسی تمام معاشرتی تحریکات کا مرکز بنتا جا رہا تھا۔

عطیہ حسین نے کم عمری میں ہی افسانہ نگاری بھی شروع کردی تھی، گوانھوں نے اُردو کی بجائے زبان فرنگ کو ذریعہ اظہار بنانا پسند کیا تھا۔ بعدازاں انگریزی زبان میں ان کا اوّلین افسانوی مجموعہ 'فینکس فلیڈ' (Phoenix Fled) کے عنوان سے 1953 میں شائع ہوا اور اس کے بعد ان کا واحد ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' (Sunlight on a Broken Colum) 1961 میں شائع ہوا۔ تاہم 1998 میں ان کی وفات کے بعد ان کے کاغذات میں سے ان کا ایک نامکمل ناول 'نو نیو لینڈز، نو نیو سیز' (No New Lands No New Seas) برآمد ہوا، جو کچھ عرصہ قبل شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی چند غیر مطبوعہ تخلیقات پر مشتمل ایک افسانوی مجموعہ بہ عنوان 'ڈسٹینٹ ٹریولر: نیو اینڈ سلیکٹڈ فکشن' (Distant Traveller: New and Selected Fiction) بھی اشاعت پذیر ہوا ہے۔

عطیہ حسین کے افسانوں میں، ان کی تخلیق 'اسٹورم' (Storm) کو ان کی نمائندہ تخلیق قرار دیا جاسکتا ہے، جس کی خوبی اس کا طرز تحریر، نیز سادگی اور طنزیہ لہجہ ہے۔ عطیہ حسین اپنے کرداروں کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ بے مصرف بلکہ مافوق الفطرت معلوم ہوتے ہیں، تاہم انھوں نے ان تمام کرداروں کو اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ہی مستعار لیا ہے۔ مثلاً ان کی ایک نگارش میں جب ایک اجنبی عورت طوفان باد و باراں سے اپنی جان بچا کر ایک اعلیٰ طبقاتی خاندان کی پناہ میں آتی ہے، تب اس اونچے گھرانے کی خواتین کا رعونت بھرا رویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ تاہم اس خاندان کی ایک نوجوان لڑکی اس اجنبی عورت کی مدد کرتی ہے اور اسے ایک عدد چھتری فراہم کرتی ہے تاکہ وہ بارش میں شرابور ہوئے بغیر باہر نکل سکے۔ وہ لڑکی اُس عورت سے اس کے بعد بھی بار بار ملاقات کرتی ہے، لیکن جب اس بات کا علم اس کے اہل خاندان کو ہوتا ہے تو اس پر پابندی عائد کردی جاتی ہے کہ وہ اس خاتون سے کبھی نہ ملے۔ اس طرح مصنفہ اعلیٰ طبقے کی ذہنی ابن الوقتی کو منظر عام پر لاتی ہیں۔ ان کا افسانہ 'فینکس فلیڈ' (Phoenix Fled) اپنے اختتام کے لیے معروف ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک ضعیفہ ہے، جو اپنا پشتینی مکان چھوڑ کر تقسیم وطن کے نتیجے میں تشکیل شدہ ایک نئے ملک جانا نہیں چاہتی۔ اس کا خاندان اسے تنہا چھوڑ کر ترک وطن کرلیتا ہے۔ جب ایک ہجوم اس کے پشتینی مکان کو نذر آتش کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اپنی گہری تشویش کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے: ''سوچ

آئینۂ حیات

نام: عطیہ حسین، **والد:** شیخ شاہد حسین قدوائی
والدہ: نثار فاطمہ، **سنہ پیدائش:** 1913،
مقام پیدائش: لکھنؤ
آبائی وطن: تعلقہ گدیا، ضلع بارہ بنکی (اودھ)
دادیھال: تعلقہ دار، جاگیردار، اعلیٰ تعلیم یافتہ
نانھال: منصب دار و عہدیدار، اعلیٰ تعلیم یافتہ
تعلیم: خانگی سطح پر دینیات، عربی، فارسی، اُردو کی تعلیم، مابعد، اسکولی تعلیم لامارٹینیر سے میں اور گریجویشن، ازابیلا تھوبرن کالج سے
ذھنی وابستگی: ترقی پسند تحریک کے ساتھ
برادران: (1) رشاد حسین، سفارت کار، ہندوستانی ہائی کمشنر برائے سری لنکا، (2) فواد، پائلٹ، پاکستان ایرفورس
ھمشیر گان: ذکیہ اور رضیہ، **شادی:** ۱۹۳۳
شوھر: علی بہادر حبیب اللہ، تعلقہ دار، سیدان پور، بارہ بنکی (اودھ)، اعلیٰ تعلیم یافتہ
رھائش: اوّلاً لکھنؤ، بعدازاں لندن
پیشه: نشر و اشاعت (بی بی سی لندن سے وابستگی)
شوق: تحقیق و تصنیف (بہ زبان انگریزی)
اولاد: (1) پسر، وارث حسین ٹی وی ڈائریکٹر، مقیم لندن (2) دختر۔ شمع حبیب اللہ، فلم ساز، مقیم لندن
وفات: 1998 (لندن)
قلمی وارث: منیزہ شمسی (برادرزادی) اور ان کی دختر کاملہ شمسی، ہر دو قلم کار
انعام: طلائی تمغہ لکھنؤ یونیورسٹی (گریجویشن کے بعد)
یادگار: عطیہ حسین ٹرسٹ فنڈ، نیون ہیم کالج، کیمبرج برائے خطبات و مالی امداد برائے جنوب ایشیائی طالبات۔
تصانیف: (1) فینکس فلیڈ، افسانوی مجموعہ، انگریزی 1953)، (2) سن لائٹ آن اے بروکن کالم، ناول (1961)، (3) کلنگ دی انڈین وے (1967)، (4) نو نیو لینڈز نو نیو سیز (نامکمل ناول) بعد وفات (5) ڈسٹینٹ ٹریولر سلیکٹڈ: نیو اینڈ سلیکٹڈ فکشن افسانوی مجموعہ بعد

لو"۔ وہ اپنے استخوانی وجود کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے "سوچ لو، کہیں تم ایک گڑیا گھر میں تو داخل نہیں ہو رہے ہو"۔

جذباتی رنگ آمیزی کے باوجود اس افسانے کے المناک اختتام کا موازنہ مشہور انگریزی مصنفہ، کیتھرین مینس فیلڈ (Katherine Mansfield) کی بعض تخلیقات سے کیا جاتا ہے، جن کا اثر عطیہ کی تخلیقات پر نمایاں طور پر نظر آتا ہے، ان کے افسانے حقیقت نگاری، نیز پُرقوت جزئیات نگاری سے مزین ہیں، علاوہ ازیں ان کا طرز نگارش، بلاشبہ ترقی پسند مصنفین کی حقیقت پسندی کے اثرات سے بھی مملو نظر آتا ہے۔ اعلیٰ مرتبت شاعر، سی. ایس. لیوس (C. S. Lewis) کے ذریعے افزائش حوصلہ کے سائے میں عطیہ حسین نے اپنا ناول انگلستان میں تخلیق کیا۔ ان کی کہانی کی راویہ چودہ برس کی ایک لڑکی لیلیٰ ہے، جو عطیہ کی کہانی 'اسٹورم' میں جلوہ گر پُرجوش تخلیق کار کی مانند ہی اپنے گرد و پیش کی دنیا کے کھوکھلے پن، خوش امیدی و خوش فہمی، نیز ابن الوقتی کو بے نقاب کرتی ہے۔ اپنے طبقے اور اپنے خاندان کا مشاہدہ اپنی غیر متعصبانہ نظروں سے کرنے کی اپنی اہلیت کو برقرار رکھتے ہوئے عطیہ حسین ابہام و تفاوت کے سیلاب نہاں میں بہتے ہوئے ایک مخصوص تمدن کو اپنے قلم کی گرفت میں لانے میں کامیاب ہیں۔ 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' میں بیسویں صدی کے نصف اول کے مسلم معاشرے کو پیش کیا گیا ہے۔ اپنے ہمسر و ہم عمر لڑکوں کے مثل اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش مند لیلیٰ کو اپنے خاندان کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس دنیا اور اس ماحول کی دوسری ستم ظریفی یہ ہے کہ طبقۂ اشراف کی ایک دوشیزہ، زہرہ کی شادی اس کی مرضی و منشا کے خلاف کرادی جاتی ہے، جب کہ اس کے عین برعکس ایک ملازمہ نندنی کو اپنی پسند کے مطابق اپنا جیون ساتھی چننے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عطیہ حسین ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتی ہیں جس میں مذہب اور عقیدہ ہنوز وجہ تفریق نہیں تھے بلکہ اس میں ثقافت کی ثروت اور رنگا رنگی برقرار تھی، نیز خصوصی نوعیت کے تہوار، رسوم و عقائد ابھی رائج تھے۔ سچ یہ ہے کہ عطیہ نے کبھی اس امر کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ ایک ایسا معاشرہ جس میں مختلف مذاہب اور ثقافتیں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ نشوونما پاتی تھیں، وہ معاشرہ یک دم منتشر اور درہم برہم بھی ہو سکتا تھا۔ قابل ذکر ہے کہ ان کی تحریر میں درد اور رنج تو ہے، مگر تلخی، مایوسی اور بے چینی نہیں ہے۔ جب تقسیم وطن کے پانچ برس بعد انھوں نے اپنا آبائی مکان دیکھا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس میں ایک مخصوص طرز حیات دفن ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی، جسے اس عمارت نے قبول بھی کر لیا تھا۔ انھوں نے بعد میں لکھا، "اس کی تباہی و بربادی میں میں نے ان تمام برسوں کو دیکھا، جو ہمارے خاندان نے وہاں گزارے تھے۔ سست رفتار متعدد برسوں نے ایک طرز حیات کو جنم دیا تھا اور چند تیز رفتار برسوں نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا"۔

دراصل ان کے ناول 'سن لائٹ آن اے بروکن کالم' کی شان نزول اسی لمحے میں پوشیدہ تھی۔ اس ناول کا عنوان ٹی. ایس. ایلیٹ (T. S. Eliot) کی نظم 'دی ہولو مین' (The Hollow Man) سے مستعار ہے۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ یہ ناول دراصل ایک خاندان کی شکست و ریخت کا مرثیہ ہے، جب سارا پس منظر بدل رہا تھا۔ ان کا یہ ناول اس تباہی و بربادی کی علامت ہے، جس کا شکار ان کے وطنی شہر کا پھولتا پھلتا تمدن اچانک ہو گیا تھا۔ وہ تمدن ایک طرز حیات تھا، زندگی کا ایک انداز تھا، جو اپنے تمام تر نقائص کے باوصف نشاط و انبساط سے لبریز تھا، اور اس میں کم از کم ایک ناپائیدار جہان کا سراب نہیں تھا۔ عطیہ حسین اپنے مذکورہ بالا ناول میں مستحکم احساسات و تصورات پیش کرنے میں کماحقہٗ کامیاب ہیں، نیز یہ ناول اس مطمح نظر کے تحت لکھا گیا ہے کہ تیزی سے ناپید اور تحلیل ہوتی ایک دنیا کو مجسم کر قلم کی گرفت میں لا کر بعینہٖ پیش کر دیا جائے، ایک دنیا جو اب صرف ان کی یادوں میں آباد تھی۔ احمد علی کی تخلیق 'دہلی کی آخری شام' کے مثل انھوں نے بھی دراصل ایک روزنامچہ تحریر کیا ہے، ایک دستاویز مرتب کر کے پیش کی ہے، ان کے اس ناول کو یقینی طور پر ایک ایسی مکمل و جامع تخلیق کے طور پر دیکھا جانا چاہیے، جو ایک زوال آمادہ جاگیرداری نظام کی تصویر کشی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس دور حیات میں پنہاں ان سیاسی و ثقافتی داخلی تحرکات کی بھی نشان دہی کرتی ہے، جن کا نتیجہ بالآخر وطن عزیز کی تقسیم کی شکل میں برآمد ہوا۔ تاہم ان کے اس شاہکار ناول کو محض اس تبصرے تک محدود کرنا بھی درست نہیں ہوگا، بلکہ ناانصافی ہوگی، کیوں کہ یہ ناول اپنی جداگانہ حیثیت میں سیاسی و معاشرتی حدود سے خوب خوب تجاوز کرتا ہے۔

بعد ازاں خود مصنفہ نے اس امر کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اس ناول کی تخلیق کا فیصلہ اپنے اس احساس کے زیر اثر کیا کہ وہ دنیا جس کی وہ باسی تھیں، وہ انحطاط پذیر ہو کر وجود سے عدم کی جانب آمادۂ سفر تھی۔ علاوہ ازیں ان کے اس تخلیقی عمل کی محرک ان کی یہ زبردست خواہش تھی کہ نسل آئندہ کی موجودگی کا اعتراف بھی کیا جائے اور اس کی اہمیت کو درج بھی کر دیا جائے، کیوں کہ اب بھی معاشرے میں ایسے افراد موجود تھے جو ایک خوش آئند مستقبل میں کامل یقین رکھتے تھے۔ درحقیقت انسانی زندگی کے تئیں عطیہ حسین کا یہی عقیدہ ان کے وسیع تر ذہنی افق کو اجاگر کرتا ہے، نیز انسانی روایات کے عین مطابق ایک عظیم ادیبہ کے طور پر ان کی حیثیت و مرتبے کی توثیق کرتا ہے۔

عطیہ حسین کا خمیر، جس کثیر جہتی و اجتماع ضدین قسم کے ماحول سے اٹھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کی ددیہال جاگیردارانہ اور ننہال افسرانہ تھی اور سسرال ملی تو خالصتاً سیاسی اور وہ بھی مسلم لیگی۔ اس کے بعد آزادی وطن کے شانہ بہ شانہ تقسیم وطن کا ہولناک تجربہ سامنے آیا، ان کا ذہن فطرتاً آزاد خیال اور ترقی پسند تھا، لہٰذا ایک پیچیدہ خاندانی پس منظر نے انھیں باغی بنا دیا، ان کا انقلابی ذہن ہندوستان کے زوال پذیر مسلم معاشرے میں بسے رہنے کو آمادہ نہ تھا، اور دل کسی طور دو قومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آئے پاکستان جانے کو راضی نہ تھا، سو ایک آزاد معاشرے کی جستجو میں مغرب کی راہ لی اور مستقلاً برطانیہ میں رہائش اختیار کی۔ اس طرح ایک مجموعہ اضداد پس منظر نے ایک سنجیدہ، صاحب فکر و نظر، دانش ور خاتون کے وجود کی تشکیل کی جس کا یقین کثیر جہتی ثقافت میں تھا، ایک ایسے معاشرے کی تعمیر میں تھا، جہاں ہر قسم کی جائز آزادی میسر ہو۔ ایک فلاحی نظام ہو، نیز مساوات کا دور دورہ ہو، یوں کہنا چاہیے کہ اس دور کے لکھنؤ کے خواب آور ماحول سے نکل کر انھوں نے جب حقائق کی سنگلاخ وادی (مغرب، بالخصوص لندن) میں قدم رکھا تو پھر تخیلات کی اپنی ایک دنیا رچالی، جس میں صالح اقدار کے حامل ایک آزاد فکر معاشرے کی آرزو تھی، اور دنیا کو جیسا پایا تھا، اس سے بہتر اور زیادہ خوبصورت بنا کر رخصت ہونے کا خواب۔ اگرچہ یہ سب کچھ انتہائی مثالیت پندی (آئیڈلزم) کی اساس پر تھا۔ مگر عطیہ حسین کے پاس ان کے اپنے دلائل و منطقی جوازات یقیناً رہے ہوں گے۔

(راقم نگارش ہٰذا، کی بنیادی معلومات کے لیے جناب شکوہ محسن مرزا، لکھنؤ کا شکر گزار ہے۔)

■

Dr. Muzaffar Husain Syed
29/11, Sir Syed Road
Darya Ganj, New Delhi - 110002
Cell.:9818827853,9211366940
syedmh92@yahoo.com.syedmh92@gmail.com

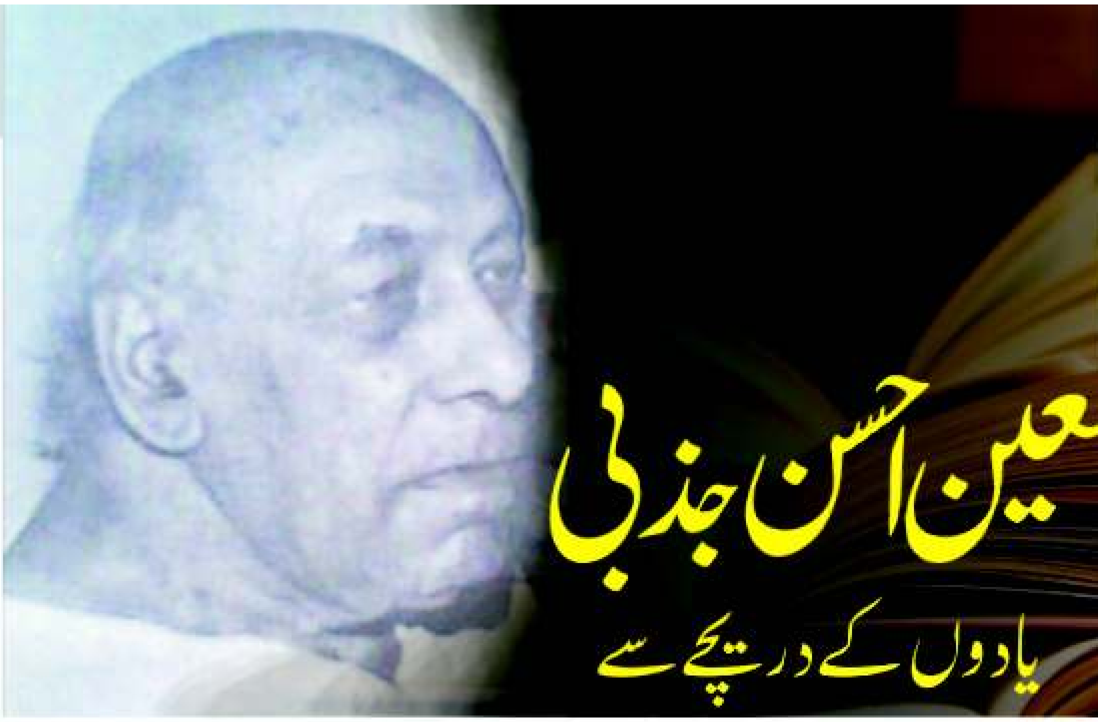

جمال اختر

معین احسن جذبی

یادوں کے دریچے سے

جذبی صاحب سے میرا تعلق تقریباً 1980 سے لے کر ان کے انتقال کے وقت یعنی 13 فروری 2005 تک رہا۔ میں 1977 سے شاعری کرنے لگا تھا۔ جذبی صاحب ان دنوں یونیورسٹی کے مکان تار والے بنگلہ ذاکر باغ میں مقیم تھے۔ ان کے گھر کے سامنے اردو کے مایہ ناز انشاپرداز وطنز ومزاح نگار رشید احمد صدیقی صاحب کا بھی یونیورسٹی کا ہی ایک بڑا سا کوٹھی نما مکان تھا جو آج بھی ہے اور جس میں ان کے چھوٹے بیٹے اکبر رشید صاحب رہتے ہیں۔ جذبی صاحب اس وقت سبکدوش ہو چکے تھے، میرا تعلق اردو سے تھا، اس وجہ سے میں جذبی صاحب سے واقف تھا۔ میں اکثر ان کے گھر حاضر ہو جاتا اور گھنٹوں اردو اور اردو والوں کی بات ہوتی۔ میں اپنی غزلیں بھی جذبی صاحب کو سناتا اور دکھاتا۔ جذبی جیسی شخصیت میری غزلیں سن کر کیا کہتی بس وہ یہی کہتے تھے میاں شعر کہتے رہیے مشق ہر چیز کی ضروری ہے۔ انھی دنوں جذبی صاحب ذاکر باغ سے منتقل ہو کر اپنے گھر میں سرسید نگر آگئے جو میرے گھر کے پاس ہی تھا۔ اب سلسلہ اور بڑھتا گیا۔ میرے والد کی جامعہ اردو پر ایک کنفیکشنری کی دکان تھی۔ میں بھی اسی دکان پر بیٹھتا تھا۔ میرے ایک چچا جو انگریزی کے استاد تھے ''ایم اے بی ایڈ'' تھے لیکن اردو سے تعلق ہونے کی وجہ سے (ایم اے) اردو بھی کیا تھا۔ ایک روز علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ وہ دکان پر میرے پاس کھڑے تھے۔ اتفاقاً جذبی صاحب بھی سگریٹ لینے چلے آئے اور عادتاً میں اور جذبی صاحب کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چچا یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جذبی صاحب کے جانے کے بعد میرے چچا مجھ سے پوچھنے لگے۔ یہ بڑے صاحب کون ہیں اتنی دیر بات کر رہے تھے۔ میں نے کہا چچا یہ مجھے بہت مانتے ہیں۔ میں اپنی شاعری بھی انھی کو دکھاتا ہوں۔ یہ جذبی صاحب ہیں۔ میں نے دیکھا کہ چچا خاموش ہو گئے اور جب تک جذبی صاحب انھیں جاتے نظر آئے دیکھتے رہے اور پھر مجھ سے بولے تم لوگوں کا علی گڑھ میں رہنے کا یہی تو فائدہ ہے۔ ہم نے جب برسوں پہلے (ایم اے) اردو سے کیا تھا تو ان کو پڑھا تھا۔ ان کی غزلیں نصاب میں شامل تھیں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم ان کو دیکھ پائیں گے اور یہ تم سے سڑک پر کھڑے بات کر رہے ہیں۔ اس روز جذبی صاحب سے میری اور بھی عقیدت بڑھ گئی۔

میری غزل جو 1980 میں 'روپ' کے شمارے میں شائع ہو گئی تھی اس کے بعد جب کوئی غزل کہیں چھپتی تو میں لے جا کر دکھاتا، پڑھتے۔ اگر کوئی شعر پسند آتا تو خوش ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک غزل کا شعر پسند آیا۔ کہنے لگے اختر صاحب اگر ایسی شاعری ہو سکتی ہے تو ضرور ہونی چاہیے۔ پھر بولے مجھے امید ہے کہ آپ شعر کہنے لگیں گے۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کی زبان سے یہ بات سنی تھی وہ شعر یہ تھا:

بھیگے کاغذ کی طرح اب تو سلگنا مشکل
اتنا احسان کرو مجھ کو جلانے آؤ

مجھے اسکول سے ہی سگریٹ کی لت لگی ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھا ہوتا تو بھی کش لیتا تھا، تو مجھ سے کبھی کبھی کہتے آپ تو اس عمر میں یہ بڑی والی سگریٹ پیتے ہیں۔ جب ہم پڑھتے تھے تو ہم چھو بھی نہیں پاتے تھے ایسی سگریٹ۔ آپ کو کیا بتاؤں کیسے زندگی یہاں تک آئی ہے۔ ایک بیڑی کو تین مرتبہ میں پیا کرتے تھے بجھا بجھا کر۔ اپنے بیتے ہوئے خراب دور کو اکثر یاد کیا کرتے۔ کبھی اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتاتے کہ ہم ابھی شعور کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اب اس گھر میں گزارہ مشکل ہونے لگا تو گھر چھوڑ دیا۔ ایک ماموں جھانسی میں تھے۔ ان کے گھر جا پہنچے۔ وہاں پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ماموں بہت چاہتے تھے ہم ان کی بہن کی نشانی جو تھے۔ وقت گزرتا رہا ایک روز ہم گھر لوٹے ممانی جان ماموں سے جھگڑ رہی تھیں۔ جھگڑا اس بات کا تھا کہ یہ لڑکا زندگی بھر کو یہیں کا ہو گیا۔ ہم نے خود سنا اور خاموش ہو رہے۔ اگلے روز جب ماموں گھر سے چلے گئے تو ہم نے خط لکھ کر ماموں کے بستر پر رکھا اور خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد گردش زمانہ کہاں کہاں لیے پھری۔ یہ معین ایسے ہی جذبی نہیں بن گیا؟ کبھی Sant Jons کالج آگرہ کی باتیں کرتے، کبھی بھوپال کی یادوں میں کھو جاتے تو کبھی دلی اور بمبئی کی باتیں بتانے لگتے۔ جب آگرہ میں پڑھتے تھے، ان دنوں کو اکثر دہراتے۔ بڑے بڑے لوگ آگرہ میں تھے۔ جذبی صاحب فانی بدایونی سے شروع سے متاثر تھے۔ ان کی بہت عزت کرتے۔ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں بھی حضرت فانی کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ بتانے لگے اختر صاحب فانی کا یہ کمال تھا کہ ان کی شخصیت اور فن دونوں بڑے کمال کے تھے، آواز میں بڑا رعب تھا۔ میری عمر آپ جیسی تھی۔ میں جب ان کے پاس حاضر ہوتا تو مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے۔ دیکھتے ہی کہتے آؤ برخوردار آؤ بیٹھو ویسے کم ہی لوگوں سے بات کرتے تھے۔ جب دل ہوتا تو کہتے جذبی شعر سناؤ۔ مجھ سے شعر سن کر خوش ہوتے، لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی ایسا لگتا کہ میں نے جو شعر انھیں سنایا ہے انھیں شاید یقین

نہیں کہ شعر میں نے کہے ہیں لیکن کبھی زبان سے کچھ بھی نہ کہتے لیکن میں یہ سوچ کر ضرور خوش ہوتا کہ اتنے بڑے استاد کو اگر یہ شک ہے کہ یہ شعر میرے نہ ہو کر کسی اور کے ہیں تو یہ تو اچھی بات ہے میرے لیے کہ میں اب ایسے شعر کہنے لگا کہ فانی جیسی شخصیت کو مشکوک کر رہی ہے۔ فانی کا ذکر اکثر ہی کیا کرتے۔ کبھی کوئی پرانی بات نکلتی تو جوش صاحب کی بہت باتیں کرتے بتاتے کہ جوش جیسا شاعر تھا ویسی ہی اس کی بھاری بھرکم شخصیت تھی اور ویسی ہی شاعری بھی تھی۔ پھر کہتے میں نے جوش جیسا کھانے والا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ جب ہم دونوں آگرہ میں تھے تو صبح آ کر آواز دیتے جذبی۔ اور ہم دونوں ٹہلنے نکل جاتے۔ صبح صبح لوٹتے میں کبھی کبھی اپنے گھر لے جاتے اور کہتے آؤ جذبی ناشتہ کر کے جانا جب ناشتہ آتا تو لگتا آٹھ دس لوگوں کا ناشتہ آیا ہے۔ ابلے انڈے اچار، دس بارہ پراٹھے، بڑے پیالے میں ملائی، چائے۔ ناشتہ شروع ہوتا، ہم تو ایک پراٹھا ہی کھاتے اور چائے لے لیتے۔ وہ پٹھان سب ختم کر کے ہی اٹھتا لیکن کیا شعر کہتا تھا وہ تو اسی دور میں بڑی شہرت کا مالک بن چکا تھا۔ جذبی صاحب اپنے ساتھیوں میں تین لوگوں کی اکثر بات کرتے۔ جوش، ساحر اور مجروح ان سب کو بڑا شاعر مانتے تھے۔ ساحر سے میں بھی ہمیشہ بہت متاثر رہا ہوں۔ آج بھی ہوں۔ ساحر کے متعلق کہتے وہ جیسا سچا انسان تھا ویسا ہی اچھا شاعر بھی تھا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ جذبی صاحب صبح کو ٹہل کر لوٹے تو دکان پر میرے والد سے معلوم کیا۔ مولانا شاعر

> **کبھی ترقی پسندوں کی بات کرتے کبھی استاد داغ کی محفلوں کی بات کرنے لگتے۔ ایک مرتبہ داغ کی محفل کا ایک قصہ سنانے لگے۔ داغ کے یہاں محفل چل رہی تھی۔ بہت سارے شعرا اور بہت سارے داغ کے شاگرد موجود تھے۔ جب استاد داغ نے اپنی غزل پڑھنا شروع کی تو ان کا ایک شاگرد ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ استاد آپ کی زبان سے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔**

اعظم کہاں ہیں۔ پاپا نے بتایا ابھی تو سو رہے ہوں گے مجھے گھر سے بلوایا اور کہنے لگے یار تم کیا خاک شاعری کرو گے۔ تم صبح اٹھ کر مناظر قدرت ہی نہیں دیکھتے۔ میں اور مجاز تمھاری عمر میں ٹہلنے نکلتے تو سات آٹھ کوس تو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ علی گڑھ میں مجاز اور جذبی صاحب کا بہت وقت ساتھ گزرا۔ دونوں بہت قریبی دوست تھے اور جوانی میں ہی مجاز نے سب کو تنہا چھوڑ دیا اور موت کو گلے لگا لیا۔ اس بات کا ذکر بھی اکثر کرتے۔ جب دونوں کا ساتھ تھا اس وقت یونیورسٹی کا اسٹاف کلب میڈیکل روڈ پر ہوا کرتا تھا۔ ایک پرانی کوٹھی میں جس کا نام لالہ رخ تھا جو آج بھی ہے۔ بتاتے ہم دونوں گھنٹوں وہاں پر بیٹھا کرتے۔ مجاز کی تو بیٹھنے کی وجہ ہوتی۔ ہم اس کا ساتھ نبھاتے۔ میں کبھی پوچھتا جذبی صاحب مجاز کے وہاں بیٹھنے کی کیا وجہ ہوتی تو جواب نہ دے کر صرف مسکرا دیتے۔ مجاز کے وہاں بیٹھنے کی وجہ تو کسی حد تک ان کی نظم 'آوارہ' سے پتہ چلتی ہے

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
یا کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

کبھی کبھی جذباتی ہوتے نظر آتے۔ کہتے اگر مجاز اتنی جلدی مر نہ جاتا تو اس صدی میں اس کے قد کا دوسرا کوئی شاعر نہ ہوتا۔ یہ بات 1989-90 کی ہے۔ میں اردو سے ایم اے کر رہا تھا۔ ان دنوں علاوہ پڑھائی کے مجھ پر کوئی اور ذمے داری نہ تھی اور جذبی صاحب سے ملنے کے لیے کبھی وقت کی پابندی نہ تھی۔ صبح دوپہر شام رات میں جب بھی چاہتا ان سے ملنے جا سکتا تھا۔ گھر میں باہر کی جانب جو کمرہ تھا وہ جذبی صاحب کا تھا۔ میں جتنے وقت بھی ان کی خدمت میں حاضر رہتا کچھ نہ کچھ سیکھنے کو ہی ملتا۔ ان باتوں سے مجھے پڑھنے میں بھی مدد ملتی۔ ایک روز اپنے ملازم کو آواز دی جو ایک نیپالی لڑکا تھا اور کہنے لگے چائے لاؤ اور یہ جو بیٹھے ہیں میری جانب اشارہ کر کے یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت اچھی چائے لانا۔ جذبی صاحب کی یہ باتیں میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ ہوتیں۔

کہاں میں کہاں جذبی صاحب۔ وہ حضرتِ اصغر کو بہت بڑا شاعر مانتے تھے لیکن جگر صاحب کو جتنا بڑا شاعر مانتے اتنا ہی بڑا انسان بھی۔ ان کی شخصیت سے بے پناہ متاثر تھے۔ جب ان حضرات کی باتیں نکلتیں تو کئی گھنٹے تک چلتیں۔

کبھی ترقی پسندوں کی بات کرتے کبھی استاد داغ کی محفلوں کی بات کرنے لگتے۔ ایک مرتبہ داغ کی محفل کا ایک قصہ سنانے لگے۔ داغ کے یہاں محفل چل رہی تھی۔ بہت سارے شعرا اور بہت سارے داغ کے شاگرد موجود تھے۔ جب استاد داغ نے اپنی غزل پڑھنا شروع کی تو ان کا ایک شاگرد ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ استاد آپ کی زبان سے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی۔ سب نے اس کی جانب دیکھا۔ استاد تو لال پیلے ہوگئے۔

حرف بد منھ سے جو نکلا تو تمھیں جانو گے

استاد غصے میں بولے تم بتاؤ پھر کیا ہونا چاہیے۔ شاگرد بولا استاد ایسے کر دیں۔

حرف اب منھ سے جو نکلا تو تمھیں جانو گے

یہ سن کر داغ نے اس لڑکے کو سینے سے لگا لیا۔ پھر مجھ سے بولے، میں آپ کو یہ سب اس لیے سناتا ہوں کہ آپ ان باتوں سے کچھ حاصل کریں۔ یہ حقیقت ہے مجھے نہ صرف ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا بلکہ قسمت سے مجھے ایسے اور کئی لوگ میرے پڑوسی تھے کہ میں جن سے بہت کچھ سیکھتا رہا۔ مثلاً وحید اختر، شہریار، اختر انصاری، اصغر عباس، علامہ محفوظ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، عصمت چغتائی اور جاوید اختر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے۔ یہ بات جولائی 1993 کی ہے۔ میں گھر میں سویا ہوا تھا۔ میری والدہ نے مجھے جگایا۔ جمال اٹھو باہر جذبی صاحب کھڑے ہیں۔ ایک اور کوئی صاحب ہیں میں اٹھ کر دروازہ پر گیا۔ جذبی صاحب سامنے کھڑے تھے۔

جذبی صاحب کی دنیا بڑی عجیب تھی۔ میں ایک دن جذبی صاحب کے یہاں موجود تھا۔ ایک صاحب شعبۂ اردو میں استاد تھے۔ آج بھی ہیں۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا سلام کیا۔ بولے جذبی صاحب ہیں۔ میں نے کہا جی اندر آئیے۔ جذبی صاحب سے درخواست کی۔ ڈاکٹر صاحب لکھنو سے ٹی وی کی ٹیم آئی ہوئی ہے آپ سے انٹرویو کے سلسلے میں۔ جذبی صاحب کا جواب سن کر وہ سب اور میں بھی دنگ رہ گئے۔ بولے تم سب جانتے ہو میں ان سب باتوں سے بہت دور رہ کر جیا ہوں اور اس وقت تو اختر میاں سے کسی بات پر بحث چل رہی ہے۔ آپ لوگ پھر کبھی آئیں تب آجائیں۔ یہ بات کہہ کر ان سب کو رخصت کردیا اور میرے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہے۔

میرے گھر کے باہر کے حصے میں ایک بیری کا درخت تھا جو آج بھی ہے۔ دوسرے صاحب اس طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب خیریت اتنی گرمی میں آپ یہاں؟ کہنے لگے ارے بھئی سردار جعفری آئے ہوئے ہیں۔ تم سے ملوانے آیا ہوں۔ تب میں نے دیکھا اور تیزی سے ان کی جانب بڑھا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔ میرے لیے یہ ایک خواب جیسا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے دو عظیم شخصیتیں ایک ساتھ میرے گھر آئی ہیں۔ میں دونوں لوگوں کو گھر میں لایا۔ بیٹھے پانی لیا۔ میں نے پوچھا کول ڈرنک لاؤں۔ یا چائے لیں گے۔ دونوں بولے نہیں اور کچھ نہیں پھر کچھ دیر بات ہوتی رہی۔ اسی وقت میں نے ایک شعر بھی کہا اور دونوں کو سنایا بھی۔ دونوں بہت خوش ہوئے:

اختر سے آکے جذبی نے اک روز یہ کہا
جو جعفری بھی ہیں وہی سردار آئے ہیں

اس کے بعد جذبی صاحب نے مجھ سے کہا آج اتوار ہے اور جعفری کو بمبئی جانا ہے۔ آپ سیٹھ جی ہیں۔ تین ہزار روپیہ کا انتظام کرو۔ کل میں بینک سے نکال کر آپ کو دوں گا۔ میں نے اندر سے پیسے لاکر جذبی صاحب کو دیے۔ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ دونوں کو شمشاد مارکیٹ جانا تھا۔ میں سڑک تک دونوں کو رکشے میں بٹھانے گیا۔ اگلے روز جذبی صاحب کا ملازم ایک لفافے میں پیسے اور کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک کتاب لے کر آیا۔ صاحب نے یہ بھیجا ہے۔ میں نے کتاب کھولی تو سردار جعفری صاحب کی کتاب تھی 'ایک خواب اور' جو میرے لیے تھی اور ایک شعر بھی لکھا تھا میرے لیے۔

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے

سردار جعفری

جو میرے ذاتی کتب خانے میں آج بھی موجود ہے۔

جذبی صاحب کی دنیا بڑی عجیب تھی۔ میں ایک دن جذبی صاحب کے یہاں موجود تھا۔ ایک صاحب شعبۂ اردو میں استاد تھے۔ آج بھی ہیں۔ دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا سلام کیا۔ بولے جذبی صاحب ہیں۔ میں نے کہا جی اندر آئیے۔ جذبی صاحب سے درخواست کی۔ ڈاکٹر صاحب لکھنو سے ٹی وی کی ٹیم آئی ہوئی ہے آپ سے انٹرویو کے سلسلے میں۔ جذبی صاحب کا جواب سن کر وہ سب اور میں بھی دنگ رہ گئے۔ بولے تم سب جانتے ہو میں ان سب باتوں سے بہت دور رہ کر جیا ہوں اور اس وقت تو اختر میاں سے کسی بات پر بحث چل رہی ہے۔ آپ لوگ پھر کبھی آئیں تب آجائیں۔ یہ بات کہہ کر ان سب کو رخصت کردیا اور میرے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہے۔ شعبۂ اردو میں 14 اگست کو مشاعرہ ہوتا ہے۔ ایک سال پاکستان سے احمد فراز بھی آئے ہوئے تھے۔ پروگرام کے بعد ناصر شکیب، احمد فراز اور میں ٹہلتے ہوئے گھر آگئے۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد پرانے یعنی بزرگوں کی بات نکلی۔ جذبی صاحب کا بھی ذکر آیا۔ احمد فراز بولے جذبی صاحب یہاں سے رٹائرمنٹ کے بعد کہاں گئے ہوں گے۔ ناصر شکیب نے کہا یہیں برابر میں ہی رہتے تھے۔ جمال میاں کے تو بہت قریبی معاملات ہیں کیا جذبی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟ تب احمد فراز نے کہا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ چلیے ہم تینوں لوگ اٹھ کر جذبی صاحب کے گھر جس کا نام 'فروزاں' ہے چلے گئے کافی دیر بات چلی۔ فیض، جوش، قمر جلالوی، احمد مشتاق وغیرہ کی زیادہ بات ہوئی۔ پھر پتہ نہیں کس بات پر 'بیوٹی پارلر' کا ذکر ہونے لگا۔ اس پر جذبی صاحب نے کہا آپ لوگ آج بیوٹی پارلر کی بات کرتے ہیں۔ مجروح نے پچاس برس پہلے ہی اس کا ذکر اپنے شعر میں کیا تھا اور پھر وہ شعر سنایا:

منچلے پہنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

مجروح

میں کبھی ان سے شکایت کرتا کہ ڈاکٹر صاحب بہت دن ہوئے ایک شعر بھی نہیں ہوا مسکرا کر جواب دیا اختر صاحب شعر کوئی دھول تو ہے نہیں کہ ہوا چلی اور اڑنے لگے۔ میں خود تین تین برس خاموش رہتا۔ کوئی ایک شعر نہ ہوتا۔ میں تم سے یہی تو کہتا ہوں پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا رکھو۔ اچھے شعرا کو پڑھو مطالعہ جاری رکھو۔ شعر جب ہوں گے ہوجائیں گے۔ جذبی صاحب نے اس بات سے کبھی اتفاق نہ کیا کہ آج کہیں پر کوئی حادثہ ہوتا ہے اور کل کے اخبار میں کسی شاعر کی کوئی نظم اسی حادثے سے جڑی ہوئی آجاتی ہے وہ ہمیشہ یہ کہتے ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔

ان کے ساتھ بیٹھ کر سب سے زیادہ ذکر مجاز کا ہوتا۔ میں نے مجاز کو بہت پڑھا ہے۔ ان کا کلام بھی اور جو ان پر لکھا گیا وہ بھی۔ میں نے ایک دن ضد کی جذبی صاحب سے جیسے میں آپ سے ایک زمانے سے جڑا ہوں، آنا جانا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ مجاز کے ساتھ بھی آپ کا دور ایسے ہی گزرا ہے کبھی تو کچھ خاص بات بتایا کریں۔ خاموش رہے پھر بولے یار اس کی کیا کیا باتیں بتاؤں۔ عجیب شخص تھا خود روتا مگر اس کی یہ کوشش رہتی کہ اوروں کو خوش رکھوں۔ اگر موت کے ظالم ہاتھ اتنی جلدی اس تک نہ پہنچ جاتے تو اس جیسا شاعر اس صدی میں دوسرا نہ ہوتا۔ 44 سال کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے۔ جب میں اور مجاز ساتھ نکلتے تھے تو لوگ اسے رک کر دیکھا کرتے تھے۔ اس کی شہرت کا اس وقت یہ عالم تھا کہ عبداللہ گرلس کالج کی لڑکیاں اس کا فوٹو اور جن کے پاس فوٹو نہیں تھا وہ پرچی پر اس کا نام لکھ کر کھیل کھیلتی تھیں جس کی پرچی مجاز کے نام کی نکلتی وہ اس رات مجاز کی دلہن بنتی۔ یہ غائبانہ شادی ہوتی تھی۔ اس تک یہ خبریں آتی تھیں مگر وہ ان ساری چیزوں سے بے نیاز تھا اسے بس ایک ہی چیز سے ساری محبت تھی جو اس کی موت کا سبب بھی بنی۔ اکثر شام میں میرے پاس آجاتا ایک بند کا تھیلا کاندھے پر لٹکا ہوا اس میں کاغذ میں لپٹی بوتل پڑی ہے اور بس بیٹھ کر سورج کے ڈوبنے کا انتظار کرتا اور بیچ میں کہتا جاتا آج یہ کمبخت ڈوبتا کیوں نہیں۔ بس جیسے سورج غروب ہوا اور اس کی زندگی شروع ہوجاتی۔ رات کے ایک دو بجے تک ساتھ رہتا اور جب اگلے دن ملاقات ہوتی تو ہنس کر پوچھتا یار رات میں تم کہاں تھے جذبی۔ غرضیکہ ہمیشہ ہنستا دکھائی دیتا۔ ہاں اس کا بڑا عجیب انداز یہ تھا کہ جب شعر کہتا تو پہلے خاموش ہوجاتا اور پھر زور سے ہنسنے کی آواز آتی۔ جو بھی کوئی اس کے ساتھ یا پاس ہوتا وہ پوچھتا کیا ہوگیا تم کو تو کہتا وہ ہوا ہے جو تمھیں نہیں ہوا۔ شعر کہہ رہا ہوں۔

عجیب شخصیت کا مالک تھا وہ خود جس حال میں بھی ہو اوروں کو ہنسانے کی باتیں ہمیشہ ہی کرتا۔ وہ ایک مرتبہ میرے ساتھ ہی تھا جب یہ شعر کہا تھا جو ہمیشہ میرے دل و دماغ پر اثر کرتا رہا۔

روئیں نہ ابھی اہل کرم حال پہ میرے
ہوتا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

مجاز

مجھے یاد ہے جب بھی مجاز سے متعلق کوئی ذکر ہوتا جذبی صاحب جذباتی ہوجاتے تھے۔ میرا ایک جو طویل سفر جذبی صاحب کے ساتھ رہا ہے میں نے ان سے اس درمیان بہت کچھ سیکھا۔ خورشیدالاسلام صاحب کی کتاب 'تنقیدیں' میں نے جذبی صاحب سے پڑھنے کے لیے مانگی تو نکال کر مجھے دے دی۔ لیکن ان کے کمرہ میں ایک بڑی ٹیبل ایک سائڈ میں رکھی تھی۔ اٹھ کر وہاں گئے اور وہاں رکھی کاپی میں کچھ لکھا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا کہ یہ ماجرہ کیا ہے؟ پھر بھی میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب کیا لکھ آئے۔ کوئی شعر ہوگیا۔ بولے کچھ نہیں۔ بعد میں کاپی اٹھا کر میں نے دیکھی تو اس پر نوٹ کیا تھا۔ ''جمال اختر کو تنقیدیں پڑھنے کے لیے دی ہے'' مجھے ان کے اس عمل سے بھی کچھ سیکھنے کو ملا۔ میرے ایک پڑوسی تھے جو دو زبانوں میں (ایم اے) تھے اور (بی ایڈ) بھی مگر بے روزگار تھے۔ ان کو نوکری نہیں مل رہی تھی۔ ایک روز ان کا ذکر نکلا تو کہنے لگے یار سنو کوئی دو زبانوں یعنی اگر ڈبل (ایم اے) اور (بی ایڈ) ہے تو کیا آپ یقینی طور پر یہ مان سکتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا قابل ہے۔ پھر ایک قصہ سنایا بولے ایک مرتبہ مولوی عبدالحق بتا رہے تھے کہ وہ کہیں انٹرویو لینے گئے تھے وہاں پر ایک حضرت آئے جو مکمل یونیورسٹی معلوم ہو رہے تھے بظاہر کیونکہ وہ تین زبانوں میں ایم اے تھے اور جب ان سے کچھ پوچھا گیا تو لگے ادھر ادھر کی باتیں بتانے۔ تب میں نے ان سے کہا آپ کو صرف امتحان پاس کرنا آتا ہے۔ یہ فن تو ہے آپ میں لیکن دلچسپی کسی چیز سے آپ کو نہیں۔ ورنہ ایک کوئی بھی لائن پکڑ کر کام کرتے۔ آپ جا سکتے ہیں، کہنے لگے ہم آپ ہر مذہب کو مانتے ہیں لیکن اصل میں آپ کیا ہیں آپ کی پہچان کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ یہ قریب 1987-88 کی بات ہے۔ مجھ پر ایک نامعلوم سا غلبہ طاری تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ والدین کہیں شہر سے باہر گئے تھے۔ گھر پر تنہا یہ کیفیت ایک ہفتہ سے زیادہ جاری رہی۔ رات میں جذبی صاحب کے پاس جا پہنچا۔ وہ بھی بولے کیا پریشانی ہے۔ کہیں عشق ہوگیا کیا میں خاموش سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا میں خود نہیں سمجھ پا رہا ہوں اور میں صرف سگریٹ پی رہا تھا۔ کافی دیر بیٹھا اور جذبی صاحب پتہ نہیں کیا کیا قصے سناتے رہے۔ میں کچھ نہ سمجھ پایا جب میں دیر رات اٹھ کر چلا پوچھنے لگے میاں کدھر جائیں گے۔ گھر جائیے میں نے کہا۔ دیکھتا ہوں میرے ساتھ اٹھ کر گیٹ تک آئے اور کہنے لگے مجھے تشویش ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔ تم پر بالکل مجاز جیسی وحشت طاری ہے آج۔ کبھی کبھی اس کی حالت بھی ایسی ہوتی تھی۔ ساری رات سڑکوں پر ٹہل کر ہی گزار دیتا تھا۔

اردو ادب میں جذبی صاحب کا جو قد اور مقام ہے اس سے کون واقف نہیں. ان کی زندگی میں اور بعد میں ان پر بہت کام ہوا ہے بہت لکھا گیا ہے. ریسرچ ہوئی ہے. میرا مقصد ان کی شاعری یا شخصیت پر کوئی رائے دینا نہیں ہے. نہ میں خود کو اس کے لائق مانتا ہوں. یہ جو تقریباً تیس برس کا عرصہ اور اس میں جو وقت ان کے ساتھ گزرا وہ یقینا بہت قیمتی تھا. جو شاید کسی اور کو نصیب نہ تھا. آخیر وقت میں جذبی صاحب کا رجحان مذہب کی طرف کافی دیکھنے میں آتا ہے.

کسی سے کچھ نہیں بتاتا تھا۔ ان کی یہ بات سن کر میں کچھ ہوش میں آیا کہ میرے ساتھ ہی نہیں ہے اوروں پر بھی ایسا وقت گزرا ہے۔ اگر جذبی صاحب مجھے گیٹ تک چھوڑنے نہ آتے اور یہ بات نہ کرتے تو نہ جانے آج میں کیا کرتا ہوتا۔ کہاں ہوتا۔ میں نے یہ ذکر اس لیے کیا کہ جذبی صاحب کی زندگی میں جو لوگ ان کے کام آئے وہ آخیر آخیر تک ان کے شکرگزار نظر آئے تھے۔ ایک ان کے ماموں جن کے پاس جھانسی میں رہ کر پڑھے تھے اور ان کے ایک اور رشتہ دار عزیز اردو کے مایہ ناز مصنف علامہ راشدالخیری وہ اکثر مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاتے کہ اگر ماموں نے اپنے گھر رکھ کر ہائی اسکول کرنے میں میری مدد نہ کی ہوتی تو نہ کبھی آگرہ کالج، سینٹ جانس تک پہنچ پاتا اور نہ پھر وہاں سے دہلی اور دہلی میں راشدالخیری نے جو میرے والد کے عزیز تھے مدد نہ کی ہوتی تو یقیناً کچھ روز میں مزدوری کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ اپنی غربت اور بدحالی کے قصے سنانے میں وہ کبھی بھی گھبرائے نہیں۔ کیسے سچے آدمی تھے جذبی صاحب۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں نظر آتا۔ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ وہ کبھی کسی کی شکایت نہ کرتے۔ جو لوگ شعبۂ اردو سے واقف تھے اس دور کے جس وقت صدر شعبہ سرور صاحب مرحوم ہوا کرتے تھے جو کہ اردو کے ایک اعلیٰ مقام شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ وہ بھی میرے اور جذبی صاحب کے بھی پڑوسی تھے لیکن جذبی صاحب کو دوران ملازمت ان کی ذات سے کافی نقصان پہنچا۔ اتنا بڑا شاعر اس دور میں صرف لیکچرر ہی بن کر رہ گیا۔ جذبی صاحب کو صدر شعبہ ہونا لازم تھا لیکن شعبے کی سیاست نے انھیں مجبور کر کے رکھ دیا۔ اس کے باوجود جذبی صاحب کبھی سرور صاحب سے نہ ناراض رہے نہ اختلافات کو طول دیا۔ میرے اور معین احسن جذبی کے درمیان جو بات چیت ہوتی تھی میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید وہ سب کسی اور سے نہیں ہوئی ہوگی اور نہ ہی کسی کتاب کا حصہ بنی ہوں گی۔ اردو ادب میں جذبی صاحب کا جو قد اور مقام ہے اس سے کون واقف نہیں۔ ان کی زندگی میں اور بعد میں ان پر بہت کام ہوا ہے بہت لکھا گیا ہے۔ ریسرچ ہوئی ہے۔ میرا مقصد ان کی شاعری یا شخصیت پر کوئی رائے دینا نہیں ہے۔ نہ میں خود کو اس کے لائق مانتا ہوں۔ یہ جو تقریباً تیس برس کا عرصہ اور اس میں جو وقت ان کے ساتھ گزرا وہ یقیناً بہت قیمتی تھا۔ جو شاید کسی اور کو نصیب نہ تھا۔ آخیر وقت میں جذبی صاحب کا رجحان مذہب کی طرف کافی دیکھنے میں آتا ہے۔ اکثر جمعے کی نماز میرے ساتھ بڑی مسجد سرسید نگر میں پڑھتے اور جب بھی میرے گھر آتے تو میرے والد سے کہتے مولانا آپ میرے لیے دعا کیا کریں۔ مجھے یاد ہے اکثر اپنا یہ شعر بھی گنگناتے رہتے تھے۔

موت کتنی بھی شاندار سہی
زندگی کا مگر جواب نہیں

جذبی

مجھے 13 فروری 2005 میں بعد مغرب یہ بری خبر ملی کہ جذبی صاحب نے اپنے گھر 'فروزاں' سرسید نگر علی گڑھ میں اس موقع پرست اور ظالم زمانے اور دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔

■

Jamal Akhtar
Near Jamia Urdu Aligarh
Aligar (UP)
Mob.:9358362312

کلامِ نانک میں وحدانیت

محمد جمیل

سرزمین پنجاب کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں سے پیروں، صوفیوں، اوتاروں نے ہمیشہ سے توحید کی آواز بلند کی ہے۔ گورو نانک صاحب، بابا فرید جی، بلھے شاہ، شاہ حسین اور وارث شاہ جیسی شخصیات کی حیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کی زندگی محض عوام کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے وقف تھی۔ عوام کو خالق دو جہاں کے ساتھ جوڑنا، ان کے دلوں کو نرم کر کے حق و صداقت کی تخم ریزی کرنا ان حضرات کا مقصد اولین رہا ہے۔

گورونانک کا مقصد بھی یہی رہا ہے۔ ان کی پیدائش اس وقت ہوئی جب ظلم و ستم زوروں پر تھا۔ اندھی تقلید کی آندھی بہت زور سے چل رہی تھی۔ پنجاب کی سر زمین زار و قطار رو رہی تھی۔ اوہام پرستی کا بول بالا تھا۔ عوام کو ضعیف الاعتقادی سے نکالنے کے لیے 1469 میں سر زمین رائے بھوئیں کی تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں مہتہ کالو کے گھر ماتا ترپتا کے بطن سے گرونانک پیدا ہوئے۔

گورونانک صاحب نے ابتدائی تعلیم کے طور پر ہندی پنڈت گوپال سے، سنسکرت پنڈت برج لال اور فارسی کی تعلیم صوفی سید حسن سے حاصل کی۔ آپ ستر سال چار مہینے اور تین دن کی عمر گزار کر 2 ستمبر 1539 کو اس دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ (گورونانک اور ان کی تعلیم ودعوت: حضرت مولانا حبیب اللہ قاسمی، ص 18)

گورونانک نے لوگوں کو اوہام پرستی و غلط روایات سے ہٹا کر عوام ہند کے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک دھاگے میں پرونے کی جد و جہد کی۔ لوگوں کو مقصد زندگی سے آگاہ کیا۔ انسانوں کے ساتھ اُنس و ہمدردی کا پیغام دیا آپ حق کے پرستار تھے اس ضمن میں علامہ اقبال نے ان کی شان میں کہا ہے:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

گورونانک کی تعلیمات میں نام جپنا، کرت کرنا اور ونڈ چھکنا ایک ایسا نسخہ ہے جس سے بندے کو ذکر و اذکار ذریعے اپنے خالق کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ نے عورت کے مقام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انھیں قطعی برا نہیں کہنا چاہیے یہ ایسی چیز نہیں جس کی ملامت کی جائے۔ اس کی گود میں تمام پیغمبروں، اوتاروں، پیروں، صوفیوں، بادشاہوں اور بہادروں جیسی شخصیات نے پرورش پائی ہے۔ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا اہم کردار ہوتا ہے۔ یہ کبھی والدہ، بہو، بیٹی اور ساس کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ آپ کا فرمان ہے:

سو کیوں مندا آکھئے جس جمے راجان

گورونانک صاحب کی پوری زندگی سچے سودے (حق سچ کی تجارت) کی تصویر پیش کرتی ہے۔ آپ نے لوٹ کھسوٹ، دھوکہ دہی، بے ایمانی، ناپ تول میں کمی والی تجارت کی سخت الفاظ میں مذمت فرمائی ہے۔ آپ نے کانوں میں مُندری ڈالنے کی بجائے اپنی خواہشات کو ترک کر کے اپنے دل کو اپنے مالک کے ساتھ جوڑنے کی تلقین کی ہے۔ ستر میں لنگوٹی پہننا، ہاتھوں میں چپّی رکھنا، مُنہ پر راکھ ملنا، لمبے لمبے بال رکھ کر لوگوں کو بے وقوف بنانے کو منع فرمایا ہے۔ ان کی پوری زندگی لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کی عکاس نظر آتی ہے۔ آپ نے کہنے کے ساتھ ساتھ کرنے پر زور دیا ہے۔ کھوکھلے نعروں، دعوؤں اور وعدوں کو غلط ٹھہرایا ہے۔ خودستائی کو برا گردانا ہے۔ ظاہر و باطن کو ممیز کرنے کی تعلیم دی ہے۔

انسان خدا کا بندہ ہے۔ بندہ بندگی سے بنتا ہے۔ بندگی اس وقت کرے گا جب اس کو اپنے خالق و مالک کا احساس ہوگا۔ بندگی کے بغیر سراسر شرمندگی ہے۔ انسان کو عبادت و ریاضت میں مشغول رکھنا اور اپنی خواہشات کو دبا کر چلنے کا نام زندگی ہے۔ صبح و شام اپنے مالک کو پیش نظر رکھنا اور ذکر و فکر میں رہنے کا نام بندگی ہے۔ کہنا اور کرنا دو الگ چیزیں ہیں۔ اللہ کے نزدیک شیخ و سید، کالے گورے اور ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ زندگی نیک اعمال سے مزین ہونی چاہیے۔ زندگی نیک اعمال کے بغیر بگڑتی ہے۔ بگڑا ہوا انسان معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرے گا۔ کہنے میں بھی طاقت اس وقت پڑتی ہے جب کہنے والے کی زندگی میں عملی شکل موجود ہو جو دنیا و آخرت کا ضامن بنتا ہے۔ بلھے شاہ جی کا بھی فرمان ہے:

او تھے عملاں نال ہونے نے نبیڑے
کسے نے نہیوں تیری ذات پچھنی

مذکورہ بات کی تصدیق شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اس طرح کی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت پہ نہ نوری ہے نہ ناری ہے

گورونانک صاحب نے اس وحدہٗ لاشریک ہستی کو نرا کار، نربھاؤ، نربیر سے یاد فرمایا ہے کہتے ہیں:

تو اکال پُرکھ ناہی سرکالا
تو پرکھ الیکھ اگم نرالا
تیرا شریک کو ناہیں
جس کے لوے لائے سنایا
(بار۔ گاؤڑی محلہ:1)

انسان کے خمیر میں غلطی اور بھول چوک شامل ہے۔ مالک اپنے مخلوق کو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اللہ نہیں چاہتا کہ انسان میرے پاس غلطیاں کوتاہیاں لے کر حاضر ہو۔ وہ مغفرت کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر انسان اس کے آگے ندامت کے ساتھ جھک جائے تو وہ پچھلی تمام خطاؤں کو معاف فرمانے والا ہے۔

گورو نانک صاحب خالق دو جہاں کی تعریف میں ان کی صفات کو محبت بھرے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

الکھ اپار اگم اگچر نہ تس کال نہ کرما
جات اجات اجونی سبھو نہ تس بھاؤ نہ بھرما

(سیرٹھ محلہ:۱)

انسان کے خمیر میں غلطی اور بھول چوک شامل ہے۔ مالک اپنے مخلوق کو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اللہ نہیں چاہتا کہ انسان میرے پاس غلطیاں کوتاہیاں لے کر حاضر ہو۔ وہ مغفرت کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اگر انسان اس کے آگے ندامت کے ساتھ جھک جائے تو وہ پچھلی تمام خطاؤں کو معاف فرمانے والا ہے۔

گورو نانک صاحب نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ انسان سے کئی دفعہ غلطی ہو جاتی ہے مگر خدا کا نام لینا ان تمام کمیوں کو پاک کر دیتا ہے کہتے ہیں:

بھلن اندر سبھ کو ابھل گورو کرتار

(سری راگ محلہ:۱)

گورو نانک صاحب نے حقیقی مولیٰ کو ناد، پاؤن پانی، بسنتر، چت گپت، ایسر برما، جتی ستی اور سنتوکھی جیسے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ اللہ کو بادشاہوں کا بادشاہ تسلیم کیا ہے اور اس کی رضا میں راضی رہنے کا اظہار کیا ہے:

سو پاتساہ، ساہا پات صاحب نانک رہن رضائی

تخلیقِ کائنات کا نقشہ کھینچتے ہوئے گورو نانک صاحب فرماتے ہیں کہ اربوں کھربوں سال پہلے زمین پر کچھ بھی نہیں تھا نہ سورج نہ چاند نہ تارے۔ حکم خداوندی کے امر کن سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ یہ ساری چیزوں کی کوئی اہمیت نہ رہتی اور بے کار ثابت ہو جاتیں اگر اس سرزمین پر اللہ کے نیک بندے اللہ کے بندوں کو سیدھے راستے پر ڈالنے کے لیے نہ آتے۔ فرماتے ہیں:

اربد نربد دھندو کارا
دھرن نہ رگنا حکم اپارا

نہ دن رین نہ چند نہ سورج
سن سمادھ لگائی دسا

(مارو سولے محلہ:۱)

گورو نانک صاحب نے لوگوں میں پیدا ہوئی برائیوں کو مٹانے کے لیے ہمہ تن کوششیں کی ہیں۔ جنیو اور جٹاں رکھ کر اکتفا کرنا کافی نہیں بلکہ پیغام دیا ہے کہ رحم و کرم کی کپاس لے کر۔ صبر و شکر کا سوت کات کر عبادت ریاضت کی گانٹھوں کو سچائی و پاکدامنی کے بیچ دے کر زندگی کامیاب ہو سکتی ہے فرماتے ہیں:

دیا کپاہ، سنتوکھ سوت جت گنڈھی ست وٹ
ایہہ جنیو جی کا ہئی تاں پانڈے گھت

(وار آسا محلہ:۱)

چونکہ گورو نانک صاحب توحید پرست تھے آپ نے توحید پرستوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اکیلا نام رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ کام سے زندگی بنتی ہے۔ اللہ کے احکام اور اپنے نبی کے طریقے کو زندگی کا نصب العین بنا کر انسان دنیا و آخرت کی کامیابی کا مستحق بن سکتا ہے فرماتے ہیں:

مسلمان کہاون مشکل جا ہوئے تا مسلمان کہاوے
اوّل علاؤ الدین کر میٹھا، مسلمان مان مال مساوے

گورو نانک صاحب نے انسانی جسم اور دل کو برتن اور اللہ کے نام کا ذکر کرنا دودھ سے تعبیر فرمایا ہے۔ آتما اور پرماتما کا رشتہ مچھلی اور پانی کی طرح فرمایا ہے جس طرح پانی بغیر مچھلی کا جینا محال ہے اسی طرح آتما کا پرماتما بغیر جینا مشکل ہے۔ آپ لوگوں کی اصلاح ایسے نرم و نازک انداز سے فرماتے ہیں جیسے ایک اچھا سرجن آپریشن تھیٹر میں ناسور کا آپریشن کر رہا ہو۔ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں انسان ناقدرہ ہے اس نے نہ اپنے آپ کو پہچانا ہے نہ اپنے خالق کو۔ یہ اس بات کو بھی بھول گیا کہ میں اس دنیا میں کیوں آیا اور کیا کرنا ہے؟ فرماتے ہیں:

پیکڑوے دھن کھری سیانی
تس سہہ کی میں سار نہ جانی

(محلہ:۱)

گورو نانک صاحب کی زندگی کا عروج اور توحید پرستی کا پیغام اس بات کی تائید کرتا ہے کہ ان کے نزدیک دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں ہیچ ہیں۔ اللہ کی پہچان اور مالک کے احکام ان کی زندگی کا مقصد حیات ہیں۔ اللہ کے کرم و نظر سے ہی بیڑا پار ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

ساہو میرا ایک دوجا ناہیں کوئی
نظر کرے مولاوا ہوئی (رہاؤ)

(راگ آسا محلہ:۱)

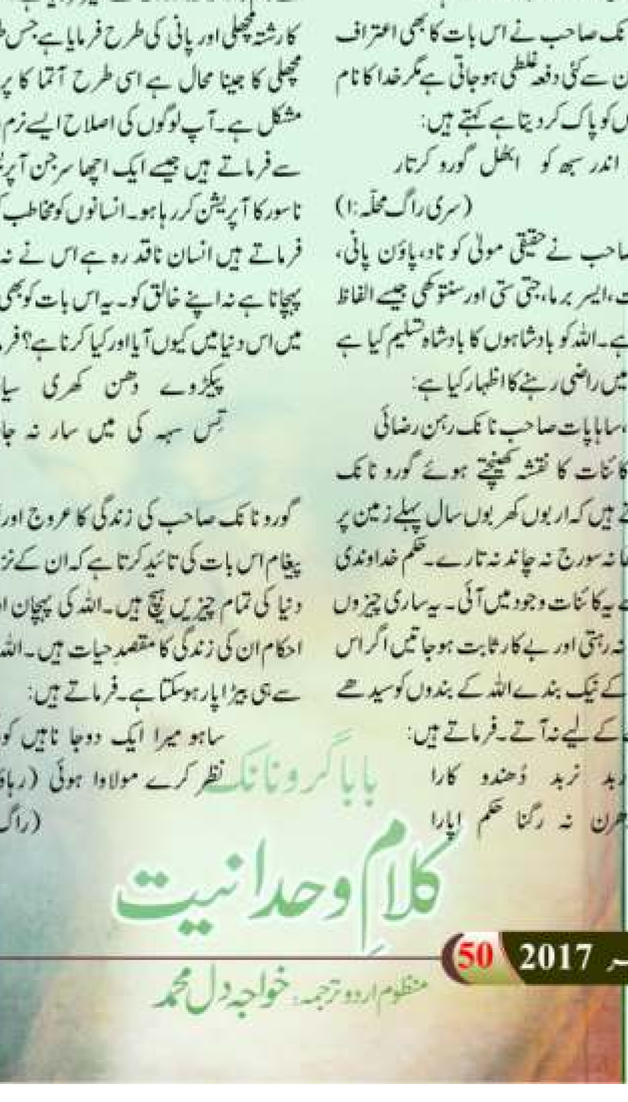

گورو نانک صاحب اپنے خالق دو جہاں کے آگے اپنی عرضداشت عجیب انداز سے پیش کرتے نظر آتے ہیں کہتے ہیں اے مالک میری عرض سن لیجیے تو حق کو جاننے والا، کرم فرمانے والا اور تیرے علاوہ کوئی اور پروردگار نہیں ہے فرماتے ہیں:

یک عرض گفتم پیش تو درگوش کن کرتار
حقا کبیر کریم تو عیب پروردگار

(محلہ:۱)

آخر میں گورو نانک صاحب بڑے اچھے انداز میں دنیا والوں کو ایک پیغام دے کر اپنی بات سمیٹنا چاہتے ہیں کہ یہ دنیا ایک خواب ہے پانی کا بلبلہ ہے۔ ریت کی دیوار ہے یا خوشبو کی مانند ہے جو جلد فنا ہونے والی ہے۔ اس کی ہر چیز مٹنے والی ہے۔ قرآن پاک میں بھی سورۃ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُلُّ من عَلَيهاَ فَانٍ وَّيَبقىٰ رَبكَ ذوالجَلاَلِ والاكرام. (سورۃ رحمٰن آیت نمبر 26 تا 27)

مذکورہ آیت کے ضمن میں گورو نانک صاحب نے یہ ساری کائنات کو مٹنے والی اور جلد ختم ہونے والی فرمایا ہے کہتے ہیں:

دنیا مقام فانی تحقیق دل جانی
ہم سر موئے عزرائیل گرفتہ دل ہیچ نہ دانی 11 رہاؤ 11

گورو نانک صاحب نے تمام انسانیت کو متنبہ کر دیا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ پیغمبروں، پیروں، اوتاروں، اور بہادروں کو ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر جانا ہے۔ اپنے جان و دل کو بھی مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے موت کا فرشتہ تیری روح قبض کرنے آجائے پھر تو روئے پچھتائے اور کہے 'اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیا چگ گئیں کھیت' اُس سے پہلے نیک اعمال کا ذخیرہ جمع کر لے۔ شیخ سعدی بھی فرماتے ہیں:

خبر کن اے فلا نے بغنیمت شمار عمر
زاں پیشتر بانگ بر آید کہ فلاں نماند

المختصر کلام نانک میں عربی فارسی کے الفاظ کی آمیزش نے کلام میں مزید شیرینی اور حلاوت بھر دی ہے۔ الفاظ کو انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ کیا ہے جو کلام اور صاحب کلام کی خوبی ہے۔ اپنے تمام کلام میں گورو نانک نے عاجزی و انکساری کا دامن چھوٹنے نہیں دیا ہے۔ بار بار مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں اپنے رب کو یاد فرمایا ہے۔

■

Dr. Mohd Jameel
Dept of Persian, Urdu & Arabi, Punjabi University
NH 64, Urban Estate Phase II, Patiala District, Patiala- 147002 (Punjab)

تذکرۂ گلزار ابرار کے اہم قلمی نسخوں کا تعارف

روبینہ اختر

قلمی یا خطی نسخے کا عربی نام مخطوطہ ہے مگر فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں یہ قلمی یا خطی نسخے کے نام سے معروف ہے۔ سنسکرت اور ہندی دونوں زبانوں میں یہ پانڈولپی اور انگریزی میں مانوسکرپٹ کہلاتا ہے۔ گلزار ابرار کے جن قلمی نسخوں کا یہاں ذکر ہوگا، ان میں سے اکثر و بیشتر کو راقمہ نے ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں جا کر دیکھا ہے اور چند کی اطلاعات فہرست مخطوطات سے حاصل کی گئی ہے۔ اس سے قبل کہ گلزار ابرار کے قلمی نسخوں کا تعارف پیش کیا جائے۔ محمد غوثی حسن موسی گجراتی مانڈوی کے احوال پر مختصراً نظر ڈالی جائے۔

آپ کے والد کا نام شیخ حسن بن موسی احمد آبادی تھا جن کا شمار اپنے عہد کے اعلی ترین صوفیا میں ہوتا تھا۔ 1534 میں ہمایوں کی گجرات مہم کے بعد جو حالات پیش آئے اس کے نتیجے میں شیخ حسن ترک وطن کر کے مالوہ چلے گے اور انھوں نے مانڈو میں سکونت اختیار کی۔ محمد غوثی شطاری شیخ حسن کے منجھلے صاحب زادے تھے۔ ان کے نام کے سلسلے میں اکثر علما کی اختلاف رائے ہیں کتاب بحر زخار میں ان کا نام شیخ محمد غوثی سندی تحریر ہے جبکہ کتاب تذکرہ الوجیہ [2] میں آپ کا نام مولانا محمد غوثی شطاری ہے غوثی کی ولادت ۱۱رجب 926ھ/ 1554 میں منڈو میں ہوئی تھی۔ انھوں نے قرآن مجید کی تعلیم کمال الدین قریشی سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد فارسی زبان کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوئے۔ جب گیارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد فوت ہوئے۔ مگر انھوں نے والد کی وفات کے بعد بھی حصول تعلیم کے سلسلے کو منقطع نہیں کیا۔ علم نحو اور علم عربی کی تعلیم شیخ برہان الدین کالپوی سے پائی اور کشف و منار تلویح جیسی اصول فقہ کی کتابوں کو سید شاہ محمد سے پڑھا۔ سترہ سال کی عمر میں ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا اور وہ 20 سال کے ہوئے تو ان کے خانوادے کو معاشی بدحالی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر انھوں نے آگرہ کا سفر کیا۔ وہاں پر پانچ سال قیام کیا اس کے بعد 990ھ/ 1582 میں گجرات کا سفر کیا اور 994ھ/ 1585 میں مانڈو واپس آئے۔ احمد آباد سے واپس آنے کے چار سال کے بعد موصوف نے گلزار ابرار کی تالیف کا ارادہ کیا۔ چنانچہ 1602 میں انھوں نے اس کام کا آغاز کیا اور 1613 میں مکمل کیا۔ اس میں صرف 1599 ۔ 1008ھ تک کی معلومات پیش کی گی۔ محمد غوثی شطاری 1027ھ میں فوت ہوے۔[3]

اس تذکرہ میں ہندو پاک کی 13 ویں صدی سے لے کر سترہویں صدی کے اوائل تک کے 612 معروف صوفیا علما اور مختلف سلسلوں کے احوال و آثار درج ہیں۔ یہ تذکرہ جہانگیر بادشاہ کے نام معنون کیا گیا ہے

اس کے علاوہ گلزار ابرار اپنے دور کی تہذیبی، ثقافتی، تاریخی اقدار کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عہد وسطی کے ہندوستان میں مختلف سلسلوں کے صوفیا و علما کے قائم کردہ تعلیمی اداروں، دینی درسگاہوں کا تفصیلی ذکر بھی اس تذکرہ میں موجود ہے۔ اس میں مشائخ کے مناقب کے علاوہ تصوف و سلوک کے رموز و نکات اور وحدت الوجود سے متعلق صوفیا کے اقوال بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اس تذکرے کی اہمیت بڑھ گی ہے کہ اس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تذکرہ اخبار الاخیار پر بھی کئی مفید اضافے ہوئے ہیں اور معروف علما و مشائخ کے سنین وفات بھی درج ہیں جن سے بعض تذکرے خالی ہیں۔ اس کتاب میں گجرات کی تاریخ اور وہاں کی اہم جنگوں کے واقعات کو بھی مصنف نے ضبط تحریر کیا ہے۔ نیز اس میں صوفیا کے اقوال بھی جابہ جا نقل کیے ہیں۔

مصنف نے اپنے تذکرہ کی ابتدا اسماء الہی کی داستان سے کی ہے۔ پھر یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار چمن پر مشتمل ہے اور ہر چمن کو 'یاذ' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جس کی ترتیب حسب ذیل ہے:

* اول چمن میں ساتویں صدی کے 54 صوفیا کے احوال درج ہیں
* دوم چمن آٹھویں صدی ہجری کے 89 مشائخ پر مشتمل ہے۔
* سوم چمن میں نویں صدی ہجری کے 69 علما کا تذکرہ ہے۔
* چہارم چمن گلزار ابرار کا سب سے طویل اور اہم چمن ہے۔ جس میں دسویں صدی ہجری کے جن 400 مشائخ کا تذکرہ ہے ان میں سے بیشتر مصنف کے ہمعصر اور سلسلہ شطاری سے منسلک تھے۔

مولف نے اولیاء اللہ کے حالات ہر ایک صدی کے جداگانہ چمن میں درج کیے ہیں۔ 22 سال کے احوال چوتھے چمن میں اور اس کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے، جس میں بقیہ صوفیا کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز کتاب کے آخر میں ایک فہرست ہے جس میں تمام صوفیا کا ذکر الفبائی ترتیب کے ساتھ کیا ہے۔

مؤلف نے اس میں پانچ قسم کے لوگوں کی سوانح پیش کی ہے:

1. اصحاب تحقیق (ظاہری و باطنی پاکیزگی حامل)
2. دانشمندان (علما، حضرات)
3. سلوک (تارک الدنیا حضرات)
4. زہاد (صوفیا و درویش)
5. مجذوب (خدا کے عشق میں گم حضرات)

گلزار ابرار کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے گلزار ابرار کے ماخذ کے لیے دیگر مستند ملفوظات، مکتوبات، تذکروں سے بھی استفادہ کیا ہے مثلاً کشف المحجوب (ابو علی عثمان ہجویری جلابی)، عوارف المعارف (شیخ شہاب الدین سہروردی)، سیر الاولیاء (میر خورد)، فوائد الفواد (امیر حسن سنجری)، سیر العارفین (شیخ جمالی)، نفحات الانس (جامی)، اخبار الاخیار (عبدالحق محدث دہلوی)، سرور الصدور (شیخ فرید)، خیر المجالس (حمید قلندر)، کتاب جامع (میر عبدالحی)، سلسلۃ العارفین (مولانا محمد قاضی)، تکملہ (مولانا عبدالغفور)، جامع الحکایات (شیخ نور الدین)، اصول انوار (شیخ کمال الدین حسین)، رسالہ محمدیہ قادریہ (شیخ ابوالمعالی)، تذکرہ اولیا (پیر

محمد حسن)، تحفۃ الابرار (عزیز الدین صوفی) وغیرہ۔ ان کے علاوہ متعدد صوفیا و مشائخ کے ملفوظات واقوال سے بھی فیضیاب ہوئے نیز چند تاریخی کتابوں، طبقات ناصری (منہاج سراج)، تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی)، طبقات محمود شاہی (مولانا عبدالکریم)، مآثر محمود شاہی (مولانا شمس الدین محمد زیرک) سے بھی استفادہ کیا ہے۔

آپ نے دیگر متعدد تصنیفات مثلاً علی پیرو اور سید زین العابدین کے رسائل، گیسو دراز کی تصنیفات معدن المعانی، جواہر خمسہ، اورد، کلید مخازن، ضمایر بصایر اور محمد غوث شطاری بحرالحیات، تفاسیر، مثلاً تبصرہ ربانی (شیخ علی پیرو)، بحر مواج (قاضی شہاب الدین عمر دولت آبادی)، نور النبی (شیخ کمال الدین حسینی)، سیر النبی (مولانا معین الدین واعظ)، مجمع البحار (شیخ طاہر سندھی برھانپوری) سے متعدد اقتباسات بھی جابجا نقل کیے ہیں۔

علاوہ ازیں مولف نے متعدد صوفیا اور دیگر متعدد اشخاص سے اس کے متعلق بھی اطلاعات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے مختلف مقامات مثلاً آگرہ اور احمد آباد کے سفر کیے اور سفر کے دوران اپنی تالیف کے لیے مواد فراہم کیا۔

ان بزرگوں کے حالات قلمبند کرنے میں مستند و مفید کتابوں، تذکروں اور ملفوظات کے علاوہ خود ان مشائخ کی متعدد تصنیفات بھی مصنف کے زیر مطالعہ رہیں اور مصنف نے ان کے متعلقین اور اعزہ سے بھی حالات دریافت کرکے قلمبند کیے ہیں۔

گلزار ابرار کی دیگر اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مصنف ہر طرح کے نسلی اور فرقی تعصب سے پاک ہے۔ اس نے مختلف سلسلوں کے صوفیا کی خوبیوں اور کارناموں کا جائزہ غیر جانب داری سے لیا ہے۔ یہ تالیف اگرچہ بنیادی طور پر شطاری سلسلے کا اہم ماخذ ہے۔ اس میں ہندوستان کے ان تمام اہم تہذیبی اور ثقافتی مراکز کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جہاں مختلف سلسلوں کے صوفیا اور علما نے اپنی تعلیمی اور دینی درسگاہیں قائم کیں تھیں مثلاً دہلی، ملتان، احمد آباد، چپانیر، نہروالہ، اجودھن، اجین، مانڈو، برہان پور، دیوگیر، گلبرگہ، جونپور، آگرہ، بدایوں، کالپی، منیر، پنڈوہ وغیرہ۔

اس تالیف میں صوفیا اور علما کی عوامی اور نجی زندگیوں پر عوام کے ساتھ ان کے روابط پر حکمرانوں اور امرا کے ساتھ ان کے تعلقات پر ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر، ان کے ادبی کارناموں پر، روحانی مدارج پر، گجرات، مالوہ، جونپور، کالپی وغیرہ کی نوزائیدہ حکومتوں کی تہذیب وثقافت کو مالا مال کرنے کے سلسلے میں ان کے کارناموں پر اور ہندو بیرون ہند ان کی مقبولیت اور حلقہ اثر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

وسیع سماجی تعلقات اور امرا، علما، صوفیا، تجار اور عوام ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ مولف کے روابط نے اسے جو وسیع النظری بخشی تھی وہ اپنے معاصرین کی زندگی کو سمجھنے اور ان کا بغور مطالعہ کرکے ان کی زندگی کی صحیح عکاسی کرنے میں اس کے لیے بڑی مددگار ثابت ہوئی، حقیقتاً اس تالیف کا یہ حصہ نہایت ہی اہم، مفید اور مستند ہے جو اس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔

علماء وصوفیا کی سوانح کے علاوہ گلزار ابرار میں کچھ مغل امراء مثلاً مرزا عزیز کوکا اور عبدالرحیم خان خاناں کے کردار اور ان کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولف نے ہمایوں، اکبر اور دیگر حکمرانوں کی عام زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کی تفصیلات بھی پیش کی ہیں۔

اس تذکرہ کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے جسے فضل احمد جے پوری نے 1908 میں کیا اور اس کا عنوان اذکار ابرار رکھا جو تاریخی نام ہے۔ یہ مطبع مفید عام (آگرہ) سے شائع ہوا ہے۔ اس ترجمے کی اشاعت ثانی 1975 میں اسلامک فاؤنڈیشن لاہور سے ہوئی ہے جس پر پیش لفظ ارشد قریشی نے لکھا ہے۔

گلزار ابرار کے متن فارسی کو ڈاکٹر ذکی صاحب نے ایڈٹ کیا ہے۔ جو پہلی مرتبہ خدا بخش لائبریری پٹنہ سے 1994 اور دوسری مرتبہ 2001 میں شائع ہوا۔ اس تذکرہ میں 579 صفحات موجود ہیں۔

اس تذکرے کی زبان نہایت فصیح اور سلیس ہے عبارت کا ایک ایک جملہ انوکھے استعارات وتشبیہات سے مزین ہے۔ لیکن بعض اوقات وضاحت کے لیے کہیں کہیں کافی لمبی عبارتیں لکھیں ہیں، جبکہ محض چند جملے اظہار مطلب کے لیے کافی ہوتے۔

مخطوطات

گلزار ابرار کے مندرجہ ذیل نسخے دستیاب ہیں:

(1) پہلا نسخہ Bibliotheca Lindesiana میں موجود ہے۔ جو اب جون ریلنڈس لائبریری (مانچسٹر) میں منتقل ہوگیا ہے۔ اس نسخے کی کتابت خط نستعلیق میں 1078ھ/ 1667 میں کی گئی تھی۔ اس کا مخطوطہ نمبر 185 ہے۔ اس کی ایک روٹوگراف کاپی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سیمنار لائبریری میں روٹوگراف نمبر 174 میں موجود ہے۔ یہ تمام روٹوگراف سیاہ رنگ کے اوراق پر سفید سیاہی سے تحریر ہیں۔ اس کے ابتدائی صفحے پر یہ عبارت لکھی ہے ''نسخہ گلزار ابرار تصنیف محمد حسن غوثی درعلم سلوک اولیاء است''۔ اس نسخے میں 147 اوراق ہیں اور ہر ورق میں 17 سطور میں ہیں۔ گلزار ابرار کے اس مخطوطے کے شروع اور آخر کے صفحے پر شعبہ تاریخ کی مہر لگی ہوئی ہے۔ اس نسخے کی شروعات ان اشعار سے ہوتی ہے:

این خطبہ من سکہ شاہی دارد
این شاہی من شان الٰہی دارد

(یہ میرا خطبہ شاہی سکہ کی طرح حیثیت رکھتا ہے، مجھے یہ شان وشوکت خدا کی طرف سے عنایت کردہ ہے)

کاری نکشاید ز ہو ای نگہبان
کین نامہ من بہی ژرف نگاہی دارد

(کوئی مشکل کام حل نہیں ہوتا نگاہوں کی ہوس سے، اس لیے کہ میرا نامہ بہت زیادہ گہری نگاہ رکھتا ہے۔)

اس کا آخری صفحہ نہیں ہے۔ یہ نسخہ اچھی اور واضح حالت میں ہے اس کو بآسانی پڑھا جاسکتا ہے۔4

(2) ایک اور نسخہ مخطوطہ نمبر R1990 برٹش میوزیم (لندن) کی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ چند اقتباسات پر مشتمل ہے۔5

(3) اس کا ایک مخطوطہ نمبر 94 کتب خانہ (بخارا) میں بھی موجود ہے۔ اس نسخے کی کتابت 1078ھ/ 1667-68 میں کی گئی تھی۔6

(4) اس کا مخطوطہ نمبر 359 ایشاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کی کتابت 1155ھ/ 1742 میں کی گئی تھی، اسلوب تحریر 12 صدی کے اندازہ تحریر سے ملتا ہے اس میں 192 اوراق ہیں۔ اس کا کاتب مدینہ بیگ ہے۔ اس نسخے کے شروع کے صفحے پر فورٹ ولیم کالج کی مہر لگی ہے۔ یہ مکمل نسخہ ہے۔

(5) اور ایک مخطوطہ نمبر 74 ایشاٹک سوسائٹی (کلکتہ) میں موجود ہے جو صرف تین اوراق پر مشتمل ہے جس میں صرف حضرت معین الدین چشتی کے حالات دیے ہوئے ہیں، سنہ کتابت درج نہیں ہے۔8

(6) سالار جنگ میوزیم لائبریری (حیدرآباد) میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ جس کا مخطوطہ نمبر T-S 27 ہے۔ اس مخطوطے کے شروع کے صفحے پر یہ عبارت لکھی ہوئی:

آطفی عاقبت باخبر کروان
(آخرت کی آگ بجھانے والے کو باخبر کر،)
بحق احمد آن سردار دوران
(دونوں جہاں کے سردار یعنی محمد کے واسطے)

''چند روزی بعنایت از ماست۔ کتاب گلزار ابرار فی سیر الاخیار تصنیف محمد غوثی بن حسن موسیٰ شطاری ساکن قلعو ماند در سال 1157 ہزار و یک صد و پنجاہ وہفت در شہر سیکا کل مضاف صوبہ حیدرآباد منقول گوید بخط ولی محمد کاتب سوای جزاول سفید کہ چہار سال پیش از تحریر کتاب مذکورہ احقر العباد مرقوم ساختہ بود ظاہراً اخیر اصل کہ

بسیار غلط هم هست کتابت نا تمام مانده تا جای که بود فیض توساینده شد الله"۔

(چند دن پہلے کی بات ہے کتاب گلزار ابرار فی سیر الاخیار جو محمد غوثی بن حسن موسی شطاری قلو ماند کے رہنے والے کی کتاب ہے، انھوں نے یہ کتاب 1157 میں سیکا کل شہر میں جو صوبہ حیدر آباد کے اطراف میں ہے نقل کی۔ ولی محمد کاتب کے خط میں پہلے جز کے علاوہ جو سفید ہے اس کتاب کے چار سال لکھنے سے پہلے لکھی گئی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے، بعد کی اصل میں بہت زیادہ غلطیاں ہیں اس کی کتابت بھی نا تمام ہے)

پھر اس پر میر عباس علی خاں بہادر اور اعتصام الملک فدوی ان تینوں کی تین مہریں ثبت ہیں۔

یہ نسخہ خط نستعلیق میں 195 اوراق پر مشتمل ہے اور ہر ورق پر 25 مسطر شامل ہیں۔ اس مخطوطے کی تمام ہیڈنگ سرخ رنگ کی سیاہی سے لکھی ہیں۔ یہ نسخہ کرم خوردہ ہے لیکن اس کو Repair کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ پڑھنے میں صاف ستھرا اور اچھا ہے۔ یہ نسخہ مکمل نہیں ہے بلکہ اس کے آخری 60 صفحات ناقص ہیں۔ اس کا خاتمہ ان لائن پر ہوتا ہے:

''کہ بطالع سلیمانی ومیعلاج اسکندری''[9]

گلزار ابرار کے اس نسخے کے آخر میں ایک فہرست ''فہرست اسامی برگزیدہای درگاہ الہی ودین پروران حضرت رسالت پناہی'' جس میں مختلف سلسلوں کے صوفیا کے نام دیے ہیں۔

(7) آصفیہ لائبریری (حیدر آباد) میں بھی اس کا ایک مخطوطہ نمبر 177 موجود ہے۔ اس نسخے کے شروع میں فہرست دی ہے جس میں مختلف صوفیا کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ کس سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر ان کی جائے پیدائش اور جائے وفات کے ساتھ تاریخ وفات بھی لکھی ہے۔ اس کے بعد ورق نمبر ہے کہ کس صوفی کا ذکر کس ورق پر کیا گیا ہے۔

اس نسخے کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے:

بی تجابانہ خلوت دارند
چون بزرگان دین چهار چمن

(بغیر کسی حجاب کے میل جول رکھتے ہیں، چار چمن بزرگان دین کی طرح سے)

خلوت بے حجاب گشت ازان
سال تاریخ این حدیقہ من

(اس سے خلوت بے حجاب ہو گی، میرے اس حدیقہ کی سال تاریخ یہ ہے)

تمت تمام شد کار من نظام شد فقط

(میرا کام تمام ہو گیا اور میرا نظام بھی)

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زانکہ من بندہ گناہگارم

(جو کوئی اس کو پڑھے گا اس سے میں دعا کی امید رکھتا ہوں، اس لیے کہ میں گناہ گار بندہ ہوں)

الہی عاقبت بخیر باد بحرمت تعالی والہ الامجاد

(اے اللہ میری آخرت اچھی فرما)

اس نسخے میں 194 اوراق شامل ہیں، ہر ورق پر تعداد سطور 25 ہیں۔ اس میں کاتب کا نام اور سنہ کتابت دونوں موجود نہیں ہے۔

(8) گنج بخش لائبریری اسلام آباد میں اس کا ایک مخطوطہ نمبر 12799 موجود ہے جس کا احمد منزوی نے اپنی فہرست مشترکہ میں ذکر کیا ہے۔ یہ خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے اور سنہ کتابت اور کاتب کا نام موجود نہیں، اس تذکرے کی شروعات ان اشعار سے ہوتی ہے۔

(9) ایک دیگر مخطوطہ منشی اللہ یار خاں (اجین) کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے[12]

(10) ایک اور نسخہ سخاوت علی خسرو کے ذاتی گلگشن (کراچی) میں موجود ہے۔[13]

(11) مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) حبیب گنج گلگشن میں بھی اس کا مخطوطہ نمبر ۵/۲۲ خط نستعلیق میں موجود ہے۔ اس تذکرے کی ابتداء میں ایک فہرست ''ہذا فہرست اسامی بزرگان رحمہم اللہ اجمعین کتاب مستطاب گلزار ابرار غوثی'' کے عنوان سے دی ہے جس میں مختلف صوفیا کے نام سرفہرست آئے ہیں۔ اس میں تمام صوفیا کے نام کی ہیڈنگ، قرآن کی آیات، عربی quaotation اور حدیث کی باتوں کی شروعات سرخ روشنائی سے ہوئی ہے۔

یہ 148 اوراق پر مشتمل ہے اس کے ہر ورق میں 25 لائنیں ہیں۔ گلزار ابرار کے درمیان کے دو صفحات (286-287) موجود نہیں ہے۔ اس کے ورق زرد رنگ کے ہیں۔ یہ اچھی اور صاف حالت میں ہے اور آسانی سے اس کو پڑھا جا سکتا ہے اس تذکرے کا خاتمہ بھی انھی اشعار پر ہوتا ہے جو پہلے درج کیے جا چکے ہیں۔

''بتاریخ بیست وہفتم رجب المرجب روز چہارشنبہ باتمام رسیدن 1283ھ نبوی صلی اللہ وآلہ وصحبہ وسلم است''

مولانا آزاد لائبریری کے نسخے کے ابتدائی اور آخری اوراق پر حبیب گنج گلگشن کی مہر ثبت ہے[14]

(12) رضا لائبریری (رامپور) میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے، جس کا شمارہ کتاب نمبر 2687 اور ردیف کتاب خانہ 6287 ہے۔ اس میں تعداد اوراق 389 ہے جبکہ ہر ورق میں 17 سطریں ہیں۔ اس کے کاتب ابوالکارم ہیں۔ انھوں نے 1093ھ/ 1681 میں شہر ٹھٹھہ میں اس کی کتابت کی ہے۔ یہ نسخہ خط نستعلیق میں مکمل نسخہ ہے اور اس نسخے کے شروع کے صفحہ (Fly leaf) پر نیشنل آرکائیو کی مہر لگی ہوئی ہے۔

شروعات کے اشعار وہی ہیں جبکہ اس کا خاتمہ اس لائن پر ہوتا ہے:

"والمسلمات برحمتك يا ارحم الراحمين"[15]

ماخذ

1. وجیہ الدین اشرف، بحر ذخار (قلمی نسخہ)، ج دوم (یونیورسٹی گلگشن، علی گڑھ، شمارہ نمبر 257)، کتابت حصہ دوم، ورق 2186
2. سید حسنی پیر علوی، تذکرہ اولیاء، گاندھی نگر، 1990، ص 163
3. میر غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، دہلی، 1910، دفتر اول، ص 23
4. محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ص 13

5.Catalogue of the Persian Manuscripts in the British,Charles Rieu Museum، برٹش میوزیم، ج 3، ص 1041

6. سی۔اے۔اسٹوری، پرشین لٹریچر، لندن، 1936، ج اول، حصہ دوم، ص 986

7.Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscript,Ivanow in the collection of Asiatic of Society of Bengal, Calcutta, 1924, P. 96.

8. سی۔اے۔اسٹوری، پرشین لٹریچر، لندن، 1936، ج اول، حصہ دوم، ص 986

9. محمد اشرف

Catalogue of the Persian Manuscript, Biographies, Geography and Travels, Salar Jung Museum and Library, Hyderabad, A.P. 1965 Vol. II, P. 46

10. فہرست کتب عربی وفارسی واردو، مطبوعہ دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدر آباد دکن، 1344ھ، ج سوم۔ ص 162
11. احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد 1408ق / 1987م، ج 11، ص 880
12. فضل احمد جھپوری، اذکار ابرار، اسلامک بک فاونڈیشن لاہور، 1326ھ، ص 3
12. ایضاً، ص 5

14.Catalogue of the Persian Manuscripts in Azad Library the Maulana ,M.H.Rizvi Aligarh Muslim University, Aligarh,A.M.U Aligarh,1985,vol 1,part 2,page no.282

15. فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، رامپور، 1417ھ/ 1996م، ج اول، ص 677

■

Dr. Rubeena Akhtar

H.No.: 4/21A, Gali No.: 12, Loco Colony

Aligarh - 202002 (UP)

خواجہ حسن ثانی نظامی کی اردو خدمات

عبدالرحمن جمال الدین

خواجہ حسن ثانی نظامی کا تعلق درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ، نئی دہلی سے ہے۔ان کے والد کا نام خواجہ حسن نظامی اور والدہ کا نام خواجہ بانو تھا۔ وہ اپنے ایک سوانحی مضمون میں لکھتے ہیں:

''میری پرورش، اپنے بزرگوں کی طرح، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے نمک اور لقموں سے، انہی کی دیوار کے سائے میں ہوئی۔ زندگی حضرت امیر خسرو کے ایسے جوار میں گزری کہ جو پھول اور عطر وہاں چڑھتا اس کی خوشبو ہمارے حصے میں آتی۔ حضرت خواجہ حسن نظامی اور حضرت خواجہ بانو جیسے ماں باپ ملے۔''

ان کا شجرۂ نسب سینتیس (37) نسل پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اڑتیسویں نسل میں آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے چشم و چراغ تھے۔

اردو زبان سے خواجہ حسن ثانی نظامی کا رشتہ موروثی ہے اور اردو کے تئیں ان کی جو خدمات ہیں انھیں اردو زبان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی، بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اردو زبان کے فروغ میں سلسلۂ چشتیہ کا ذکر کیے بغیر اس کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی؛ جس کی ایک اہم کڑی خواجہ حسن ثانی نظامی بھی ہیں۔ آپ اپنے والد بزرگوار خواجہ حسن نظامی کی طرح تصنیف و تالیف پر بہت زیادہ توجہ تو نہ دے سکے؛لیکن سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے روح پرور ملفوظات پرمبنی حضرت خواجہ امیر حسن علی سجزی دہلوی کی کتاب 'فوائد الفواد' کا اردو ترجمہ اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا سے ماہانہ شائع ہونے والے مجلّہ 'منادی' کی تاحیات ادارت دو ایسے اہم کارنامے ہیں جو انھیں اردو کے بہی خواہوں میں شامل کرنے کے لیے کافی ہیں۔اس کے علاوہ ان کا ایک اور کارنامہ مشہور انشاپرداز خواجہ حسن نظامی صاحب کی حیات وخدمات پر مبنی سیمنار میں پڑھے گئے مقالات کی ترتیب ہے،جس کی وجہ سے آپ کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔

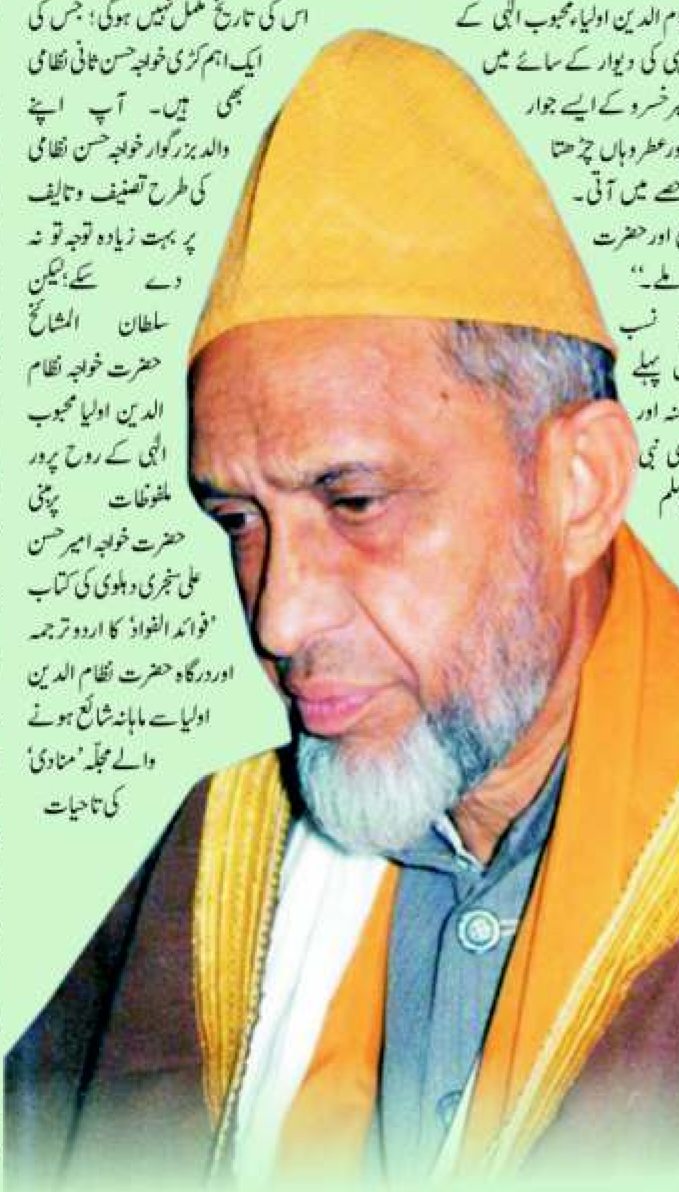

حضرت خواجہ حسن نظامی کی وفات کے بعد آپ درگاہ حضرت نظام الدین کے متولی اور سجادہ نشین ہوئے اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا سے ماہانہ شائع ہونے والے رسالہ 'منادی' کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی اور اس کے ذریعے زبان اردو کی قولی اور عملی آبیاری کی۔ آپ نے اس مجلّے کے ادارتی صفحات میں زبان اردو اور اس کے متعلقات کو بھی جگہ دی، جب کہ اس رسالے کا اصل مقصد مسلک صوفیہ کی تشہیر و تبلیغ اور اس کے متعلق اٹھنے والے سوالات کا دفاع ہے۔لیکن خواجہ صاحب نے اپنے اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خانقاہوں کی بیٹی 'زبان اردو' کی پرورش میں کسی قسم کا دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ بلکہ اس رسالے کی ادارت کے ذریعے وہ سارے فرائض سرانجام دیے،جس کی ایک مدیر سے توقع کی جاسکتی ہے۔'کسی بھی اخبار یا رسالے کا ایک مخصوص منہج فکر، مقصد اور زاویہ نگاہ ہوتا ہے، جو اس کے اجرا کا باعث ہوتا ہے۔ عموماً ان میں سب سے بڑا مقصد عوام اور بعض صورتوں میں خواص کی ملّی، قومی، سیاسی، مذہبی اور علمی مسائل پر رہنمائی ہوتی ہے۔' موصوف کی ادارت میں نکلنے والے اس رسالے کا بھی یہی حال تھا،اس کا اول مقصد صوفی تحریک اور عقیدۂ صوفیہ کا فروغ اور ترویج تھا۔لیکن اردو زبان میں ہونے کی وجہ سے زبان اردو کو اس سے ایک عملی پلیٹ فارم میسر تھا جہاں سے اسے لہلہانے کا موقع ملا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کے نام اداریوں اور مضامین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے رسالے کے ذریعے اردو کے مسائل کو عوام تک پہنچانے

اور ازسرنو اسے زندگی بخشنے کی جدوجہد کی۔ اس رسالے میں انھوں نے محض خانقاہی مسائل یا مسلکی بحث وتکرار ہی نہیں بلکہ قومی، ملی مسائل کے ساتھ ساتھ زبان اردو کے مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا ہے، جس کا ہونا ضروری بھی تھا کیوں کہ خسرو کے تبرکات کی حفاظت کی ذمے داری دوسروں کی بنسبت ان پر زیادہ عائد ہوتی تھی اور روح خسرو کی توقعات بھی ان سے زیادہ تھیں جسے خواجہ ثانی نظامی نے بحسن خوبی انجام دیا ہے۔ ذیل میں زبان اردو کے مسائل پر مبنی ان کے چند اداریوں کے عناوین اور ان کے مرکزی خیال ملاحظہ ہوں:

(1) اردو کا جادو

فروری 1958 کا اداریہ 'اردو کا جادو' کے نام سے لکھا جس کے عنوان سے ہی واضح ہے کی اردو نے کسی کو اپنا گرویدہ بنالیا ہوگا اور حقیقت بھی یہی ہے، کہ آندھراپردیش کے کسی وزیر نے اردو زبان کو بطور علاقائی زبان تسلیم کیے جانے کی بات کی تھی اور اس کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی اسے ثانوی زبان کا درجہ دینے کا چرچہ عام تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اندھرا کے ایک وزیر نے اس قسم کا بیان دیا ہے، جس سے امید پیدا ہوئی ہے کہ وہاں اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرلیا جائے گا، اسی طرح دوسرے علاقوں میں بھی امید افزا اطلاعات آرہی ہیں۔ یہ چیز ہماری حکومت، ہمارے ملک اور ہماری قوم کے لیے بڑی نیک فال ہے۔''

اس مضمون میں بڑے مختصر اور بلیغ انداز میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے زبان اردو کی وکالت کی ہے اور صاف ستھرے الفاظ میں واضح کیا ہے کہ حکومت نے آزادی کے بعد سے اب تک ہماری مشترکہ زبان اردو کے ساتھ حسد کی وجہ سے ناانصافی اور سوتیلا برتاؤ کیا تھا، تاکہ صوفیوں اور خانقاہوں میں پلنے بڑھنے والی زبان کی شیرینی اور مٹھاس کو ختم کیا جاسکے، اور اس کا گلا گھونٹا جاسکے، جس کی بنیاد سراسر ناانصافی پر مبنی تھی۔ لیکن زبان خسرو کی شیرینی نے حکومت آندھراپردیش کو اس کا قانونی حق دینے پر مجبور کردیا۔

(2) آکاش کی اردو وانی

جنوری 1958 کے شمارے میں 'آکاش کی اردو وانی' نام سے اداریہ لکھا جس میں انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے چینل 'آکاش وانی' سے اردو سروس کی ازسرنو شروعات پر آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروڈیوسر ساغر نظامی، موجودہ حکومت اور عوام کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کے اس عمل کی تحسین بھی کی ہے۔ جس سے زبان اردو سے ان کی والہانہ ہمدردی اور محبت کا بین ثبوت ملتا ہے۔

(3) اردو کانفرنس

جنوری 1958 ہی کے شمارے میں 'اردو کانفرنس' کے نام سے ایک مختصر مضمون لکھ کر خواجہ موصوف نے انجمن ترقی اردو ہند کے ذریعے منعقد کی جانے والی 'اردو

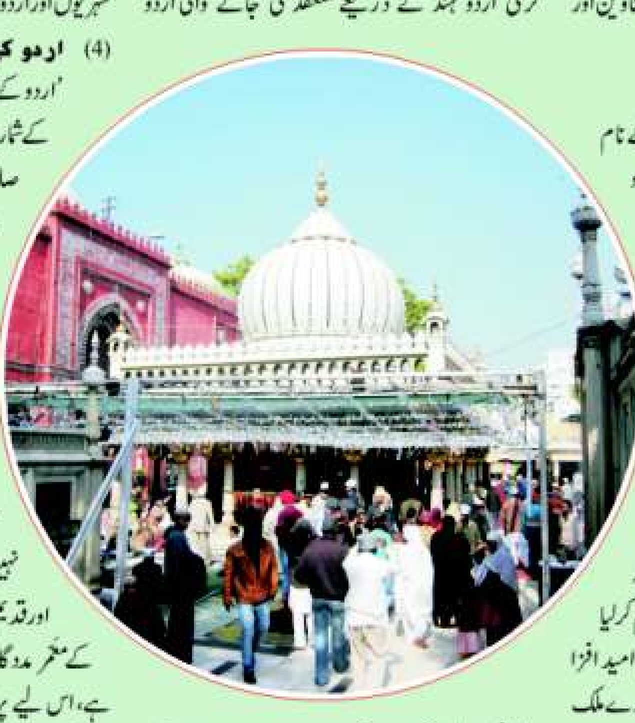

کانفرنس دہلی' کی حمایت کرتے ہوئے عوام الناس کے ایک بڑے طبقے کو حکومت سے اردو کا قانونی حق مانگنے اور اس کی ترویج کے لیے خود عملی اور ذاتی طور پر انتظام کرنے کی طرف رغبت دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بات صحیح ہے کہ حق چھپائے نہیں چھپتا۔ لیکن ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے والوں کے لیے حق ذرا کم ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی اردو کے لیے کوئی مطالبہ کرتے وقت حکومت سے زیادہ زور اپنے اوپر دینا چاہیے۔ ہمیں خود پرائیویٹ طور پر اردو کی بقا اور ترویج کے انتظامات کرنے چاہئیں اور وقتاً فوقتاً حکومت کے سامنے پرامن طور پر اپنے مطالبات پیش کرتے رہنے چاہیے۔ اگر صرف حکومت کے سامنے ہی فریاد یا ایجی ٹیشن ہوتی رہی تو اس کا اول تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ حکومت ہماری کوئی بات نہیں سنے گی.... دوسری طرف اس قسم کے تعصب اور ضد کے دوبالا ہوجانے کا اندیشہ ہے، جس نے اردو کو اور ملک وقوم کو اب تک بہت نقصان پہنچایا.... اس لیے میری گذارش یہ ہے کہ اس اہم موقع پر جبکہ سارے ہندوستان والے ہندوستان کے دل دلی میں جمع ہوں گے۔ محض حکومت سے مطالبہ کرنے ہی کو کافی نہ سمجھا جائے بلکہ اس چیز کا بھی جائزہ لیا جائے کہ خود ہم نے اپنے طور پر اب تک اردو کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ اس وقت کیا کرنا چاہیے اور ہم کیا کیا کرسکتے ہیں.... خدا حکومت کو بھی توفیق عطا فرمائے کہ وہ ہم جیسے حق شناس شہریوں اور اردو جیسی مشترکہ زبان کی قدر کرنی سیکھ لے۔

(4) اردو کے تین ستون گر گئے

'اردو کے تین ستون گر گئے' یہ اداریہ فروری 1957 کے شمارے کا ہے، جس میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، پنڈت ہری چند اختر اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کی تعزیت میں اظہار خیال کیا ہے۔ جن میں رام بابو سکسنہ اور پنڈت ہری چند کا تعلق اردو دنیا سے اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کا تعلق ادب اور سیاست سے تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کے پاس نوجوان حمایتیوں کی کمی نہیں ہے، لیکن ان نوجوانوں میں علم وادب اور قدیم وجدید روایات کی وہ سمائی نہیں ہے جو اس کے معمّر مددگاروں اور سرپرستوں کو اللہ نے عطا فرمائی ہے، اس لیے پرانے لوگوں کا جلدی جلدی رخصت ہونا اردو کے لیے موجودہ نازک دور میں واقعی بہت نقصان اور صدمے کا باعث ہے۔''

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور پنڈت ہری چند اختر سے خواجہ صاحب کا رشتہ زبان اردو کے بہی خواہی کا ہے، جس کا انھوں نے اظہار بھی کیا ہے۔

اس کے علاوہ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے مجلہ ''منادی' میں شائع ہونے والے اپنے دیگر مضامین کے ذریعے زبان اردو کی ترویج کو عملی جامہ پہنایا اور اپنے پیروں اور مرشدوں کے طریقے کو اختیار کرتے ہوئے اپنے خیالات وعقائد کی تبلیغ اردو اور عوامی زبان ہی میں جاری رکھی جس سے زبان اردو کو مستقل تقویت ملتی رہی۔

■

Abdur Rahman
E-18, 2nd Floor Shaheen Bagh, Jamia Nagar,
New Delhi - 110025

مصنف: عبدالخالق رشید
مترجم: محمد حیات الدین

پاگل خانہ

(پشتو کہانی)

ان ایام کو گزرے ہوئے برسوں بیت گئے کہ جب ایک نام سنتے ہی میں سوچ میں ڈوب جایا کرتا تھا۔ اگر میں چل رہا ہوتا تو رک جاتا تھا، اور اگر بیٹھا ہوتا تو پھر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اسی طرح، اگر سو رہا ہوتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ پہروں جگا رہتا، اور گھڑیوں اسی فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ پھر خود کو مطمئن کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل ذہن میں لایا کرتا تھا۔ ایک طرف سے دوسری طرف اس کے تانے بانے ملاتا رہتا تھا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ میں اپنی جگہ تبدیل نہ کر لیتا تھا یا پھر کسی شخص سے محو گفتگو نہ ہو جاتا تھا۔ یہ بہت دلچسپ نام ہے۔ انتہائی دلچسپ اور سننے کے لائق۔ یعنی پاگل خانہ یا دارالمجانین!

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اس جگہ کو پہلی دفعہ اپنے اُن روز و شب میں دیکھا تھا جب میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس زمانے میں جب ہم لوگ اپنے ایک دوست کی عیادت کے لیے اسپتال جایا کرتے تھے تو ایک مرتبہ راستہ بھٹک کر اُس طرف بھی پہنچ گئے تھے۔ وہاں ہم نے بہت سے ایسے افراد کو دیکھا جنھیں لوگ پاگل کہتے تھے۔ وہ سب کے سب بہت دلچسپ لوگ تھے۔ اپنی کھڑکیوں میں بیٹھے رہتے تھے، لوگوں پر ہنستے رہتے تھے، اور ساتھ ہی ان سے فریاد بھی کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے چند تو سگریٹ کے لیے بھی لوگوں سے فریاد کر رہے ہوتے تھے۔ مگر ان میں سے چند افراد لوگوں کو محض دیکھتے رہتے تھے۔ ان میں کچھ تو ایسے بھی تھے جو نہ صرف لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے تھے، بلکہ دیکھتے دیکھتے یا تو کچھ کہتے تھے یا پھر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ جب ہم لوگ ان کا نظارہ کر رہے تھے تو ان میں سے ایک نے ہمیں بھی پکارا:

یہاں آیئے! کیا آپ ہمارے مہمان بنیں گے؟ چاول ہے، گوشت ہے، انڈا ہے اور...

اس وقت ہمارے احباب میں سے کسی نے، جو اس کی باتوں کو پوری دلچسپی سے سن رہا تھا، اور ایسے لوگوں کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا، اس سے پوچھا:

اور کیا چیز ہے؟

اس نے جواب دیا:... بھی ہے

اس کی باتوں پر ہم لوگ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ جس کے بعد وہ بھی ہنسنے لگا۔ اور پھر جب وہاں سے ہم لوگ واپس ہونے لگے، تو اس نے پھر پکارا:

مت جایئے، مت جایئے! میں نے مذاق کیا تھا۔ وہ نہیں ہے۔ بخدا! کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو یہاں آ کر خود دیکھ لیجیے۔

اس کی ان باتوں پر اور بھی ہنسی آنے لگی۔ وہ جتنا بھی اصرار کرتا رہا اور قسمیں کھاتا رہا کہ ''نہیں ہے، نہیں ہے''، لیکن نہ ہی ہم لوگ اس کی طرف گئے، اور نہ ہی ہم نے پھر پیچھے مڑ کر اسے دیکھا۔

پاگل خانے کی طرف جانا اور ان لوگوں سے ملنا تقریباً ہمارے معمول کا حصہ بن گیا تھا۔ اس طرح ان لوگوں سے متعلق ہم نے بہت سی باتیں سنیں۔ بہت ہی دلچسپ باتیں۔ بہر حال جب ہم کالج کے دوسرے اور تیسرے سال میں داخل ہوئے تو ہمیں علم نفسیات پڑھنے کا موقع ملا۔ جس کے بعد تو ہم لوگ ان لوگوں کی طرف اور بھی متوجہ ہوئے، اور یہ سمجھ میں آنے لگا کہ ان کے ساتھ صرف تفریح نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ یہاں تو ہم لوگ ایسے لوگوں کی زندگی کے پس منظر، اسرار و رموز اور تاریک پہلوؤں کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو پاگل خانے کے ایک بوڑھے ملازم نے، جسے ان لوگوں کی زندگی کے

مختلف پہلوؤں کی جانکاری تھی، ہمیں ان لوگوں سے متعلق ایک واقعہ سنایا۔ گرچہ ہمیں اس پر یقین نہ آیا، تاہم یہ ان لوگوں کی دنیا سے متعلق ایک اہم اور دلچسپ قصہ تھا۔ بوڑھے ملازم نے قصہ کچھ یوں سنایا کہ: ایک دفعہ یہاں ملک کا بادشاہ آیا۔ اس کے ساتھ عالی رتبہ افراد بھی تھے۔ جب بادشاہ پاگل خانے میں پہنچا تو وہ سب کی طرف متوجہ نہ ہوا، اور صرف ایک سے یہ پوچھا:

کیسے ہو؟ یہاں آرام ہے؟

وہ شخص بادشاہ کی طرف صرف دیکھتا رہا، اور کچھ بھی جواب نہ دیا۔

بادشاہ نے پھر اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا:

مجھے پہنچانتے ہو کہ نہیں؟ میں بادشاہ ہوں، بادشاہ!

جس کے بعد اس شخص نے اسے تھوڑا غور سے دیکھا۔ چند لمحے اس کے اوپر نیچے دیکھتا رہا۔ پھر تھوڑا مسکرایا اور کہا:

تو بادشاہ ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا: ہاں، میں، میں!

جس پر اس شخص نے زوردار قہقہہ لگایا، اور پھر ہنسنے لگا۔ اس کے بعد بادشاہ کو وہ مسلسل اسی طرح دیکھتا رہا، اور پھر جواب دیا:

ٹھیک ہے۔ یہ تمہارا قصور نہیں ہے۔ یہاں جو بھی پہلی بار آتا ہے، وہ اسی طرح کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں، بادشاہ!

ہم نے وہاں اس طرح کے اور بھی واقعات سنے جن سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ہماری دنیا سے مختلف وہاں ایک چھوٹی دنیا آباد تھی۔ ایک ایسی چھوٹی دنیا جس پر ہم لوگ کسی سے بات نہیں کرتے۔ وہ بھی زندہ لوگ تھے اور ہم لوگ بھی۔ بظاہر ایک ہی دنیا میں، اور ایک ہی سلطنت کے رہنے والے تھے۔ مگر کچھ اس طرح کہ نہ ہم ایک سلطنت کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے، اور نہ ہی ایک دنیا کے۔ حالانکہ ہم لوگ ان سے آشنا تھے۔ وہ بھی ہمیں اچھی طرح پہنچانتے تھے۔ انھیں ہماری نیتوں، خودغرضیوں، کارستانیوں اور مظالم سے بھی پوری طرح آگاہی تھی۔ مگر ہم لوگ نہ ہی ان لوگوں کو پہنچانتے تھے، اور نہ ہی ان کی چھوٹی سی دنیا سے ہمیں آگاہی تھی۔ اس لیے وہ لوگ ہمیں ناآشنا دکھائی دیتے تھے، اور ہم لوگ وہاں محض نظارے کے لیے جاتے تھے، اور قہقہوں سے لالہ زار ہوتے تھے۔ اب سمجھ پائے کہ ہم لوگ انھیں پہچان نہیں پائے۔ افسوس کہ ہم لوگ اور بھی بہت دنوں تک اس طرح کے لوگوں کو نہیں پہچان پائیں گے!

موجودہ سال تو کچھ اور ہی طرح کا سال تھا۔ پاگل خانے کی دنیا کی ہیئت، سرگرمیوں اور حالات میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اب تو شہر اور اس کے اطراف میں دریائے خوں جاری تھے۔ اب خوف اور وحشت کے خونخوار پنجے دوسرے ملک کی ایک چھوٹی سی دنیا پر بھی بڑھتے جارہے تھے۔ ایسا سال تو ان لوگوں پر کبھی نہ گذرا تھا۔ جب بھی پاگل خانے کے قرب وجوار میں دھما کا خیز گولے پھٹتے تو وہ لوگ یا تو خوف سے کسی پر روتے، کسی کے ہاتھوں کو زور سے پکڑتے، یا پھر کسی کمرے کے کونے میں بوریوں کی مانند تہہ بہ تہہ ڈھیر ہوکر ایک دوسرے پر اپنے سر رکھ دیتے، اور پھر سراسیمگی کے عالم میں کسی کی زبان سے کوئی بھی لفظ نہ نکلتا۔ صرف ایک دوسرے کو سہمے سہمے تکتے رہتے۔ ایک دن جب ان کے قرب وجوار میں بہت زوردار حملے ہوئے، اور ایک بچے کا خون آلود پیر کا کوئی ٹکڑا ان کی کھڑکی سے گزرا، تو سبھی نے اسے حیرت واستعجاب سے دیکھا۔ باوجود اس کے کہ جب کوئی ان کی کھڑکی کے پاس سے گزرتا تو وہ گذرنے والے پر ہنستے تھے۔ مگر آج اس واقعے پر سب حیران وششدر تھے۔ ان میں سے ایک نے تو شدید تکلیف اور غصے کے عالم میں اپنے سر کو کھڑکی کے لوہے میں زور سے مار دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ کئی دن نازک حالت میں رہا، اور کوئی بات اس کے منہ سے تب نکلی تھی جب اس کے چہرے کی سوجن تھوڑا کم ہوئی تھی۔ سب سے پہلے الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے:

خون، خون، لال خون، بچہ، ... پیر ٹکڑا!

اب تو لڑائی کی آگ کم وبیش پاگل خانے کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی۔ پاگل خانہ قدیم اور بڑے اسپتال کے ایک گوشے میں واقع تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہر روز اسپتال کے پاس ایک دو لوگ گولیوں سے ہلاک ہوجاتے تھے۔ اب یہاں کوئی مریض کو بھی نہیں لاتا تھا۔ اب یہاں زندگی کی امید موت سے وابستہ ہوگئی تھی۔ ایسے بیمار جو یہاں پہلے سے بھرتی تھے، اب انھیں بھی اقارب نکال لے گئے۔ اس بڑے اسپتال میں اب خوف اور وحشت کے علاوہ کوئی اور چیز نہ تھی۔ ایک رات جب جنگجوؤں کے کمانڈر نے اسپتال میں خالی بستریں اور کھاٹیں پڑیں دیکھیں، تو اسی رات ایک گاڑی طلب کی اور یہاں کی تمام چیزیں مال غنیمت سمجھ کر اٹھا لے گئے۔ جس کے بعد تو اسپتال مزید خوف اور وحشت کی منہ بولتی تصویر بن کر ایک بھوت بنگلہ میں تبدیل ہوگیا۔ اسی رات جنگجو کمانڈر بھٹکتا ہوا پاگل خانہ میں بھی آدھمکا۔ یہاں اس نے لوگوں کو دیکھ کر حیرت سے کہا:

یہاں کون ہے؟

کسی نے جواب دیا:

دیوانا صاحب! یہ سب پاگل ہیں صاحب!

کمانڈر اندر داخل ہوا۔ لوگوں کو بغور دیکھا۔ تاہم سب سے پہلے اس نے ان پاگلوں کو اسی کھڑکی سے دیکھا۔ سبھی لوگ ایک کمرے کے کونے میں ایک دوسرے کے پاس سہمے اور سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے دیواروں کی طرف تھے۔ کسی نے بھی کمانڈر کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ صرف ایک دو لوگ ان میں سے ایسے تھے کہ جب دروازہ کھلا تو ان کی نظریں دروازے کی طرف گئیں، اور جیسے ہی کمانڈر اور اس کے جنگجوؤں پر ان کی نظریں پڑیں تو پھر سے اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپالیا، اور آنکھیں بند کرلیں۔ اب ان میں سے کوئی بھی کمانڈر اور جنگجوؤں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن کمانڈر نے ان میں سے ایک لاچار اور بے کس کو آواز دی، اور پھر اسے اوپر اٹھایا۔ جو کچھ بھی اس سے پوچھا گیا، جواب میں ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ پورے کمرے میں ایسی خاموشی طاری تھی جہاں ایک چیونٹی کی بھی آواز سنی جاسکتی تھی لیکن ان لوگوں کی نہیں!

سردی بھی برفیلی ہوگئی تھی۔ وہاں نہ ہی تیل کا کوئی انتظام تھا اور نہ ہی لکڑی بچی تھی۔ دن تو کسی طرح سردی کی دھوپ میں گزر جاتا تھا، مگر شام ہوتے ہی سبھی ٹھنڈ کے مارے گھبراہٹ کے عالم میں کانپتے ہوئے چاقوؤں کے موٹھوں پر ہاتھ مارا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے اب کھانا بھی بڑی مشکل سے ان تک پہنچتا تھا، اور کبھی کبھی وہ بھی نہیں پہنچتا تھا۔ شہر میں ایک طرف سے دوسری طرف جانا اتنا مشکل ہوگیا تھا جیسے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا۔ ایک دن تو باورچی بھی نہیں آیا۔ دوسرے دن کے کھانے کے لیے وہاں کچھ بھی نہ بچا تھا۔ مزید یہ کہ کبھی کبھی جنگجو بھی ان کے حصے کا کھانا اچک لیتے تھے۔ کیونکہ اب تو یہاں کوئی مریض بھی باقی نہیں رہ گیا تھا، اس لیے اب ان لوگوں کے متعلق یہ جنگجو بھی کہتے تھے کہ:

پاگل بھی کیا کھانا کھاتا ہے!

ارے اس کمرے میں سب پاگل تین تین کمبل لیے ہوئے ہیں! کمانڈر کو یہاں کوئی اور چیز ہاتھ نہ لگی تو حکم دیا کہ دو دو کمبل ان سب کے بدن سے اتار لیا جائے، یہ لوگ ٹھنڈ کیا سمجھیں! یہ عمل بھی گزر گیا، مگر پاگلوں نے تب بھی کچھ ردعمل نہ کیا، اور نہ ہی اپنی نظریں اٹھائیں۔ جب کمانڈر اور اس کے جنگجو کمرے سے چلے گئے، اور ان کے

پاؤں کی چاپ بھی نہ سنائی دی تب کہیں جاکر ان لوگوں نے اپنے سر اوپر اٹھائے۔ پہلے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھا اور پھر اپنے چہار سو نظر دوڑائی۔

پاگل خانے کی وہ چھوٹی دنیا بھی لوٹ پاٹ کی شکار ہوگئی تھی۔ ہاں، وحشیانہ لوٹ پاٹ! جس کے بعد تو ان کے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔ ان کے لیے تو اب آسمان کمبل تھا اور موسم سرما کا یخ بستہ فرش تو شک تھی۔ سب نے حیرت واستعجاب سے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی، اور پھر ایک دوسرے کو افسردگی سے دیکھنے لگے۔ ان میں سے صرف ایک کی زبان سے سہمے ہوئے جملے کچھ یوں نکلے:

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سائیں سائیں کرتی سرد ہوا، اور یہ تیز بارش جو شروع ہوئی تو برستی ہی جارہی ہے، اور وحشت وخوف تو اب ہمارے ذہن میں گھر کر گئے ہیں۔ کیا ہم اس وحشت سے باہر آسکتے ہیں؟ اگر ان لوگوں کو بھی ان یخ بستہ ہواؤں، بارشوں اور برف باریوں سے دوچار ہونا پڑتا جیسا کہ ہمیں ہونا پڑ رہا ہے تو انھیں کیسا لگتا؟ وہ لوگ خدا کے بھی مقرب ہیں اور بندوں کے بھی!... (ہنسی)، افسوس کہ اب نہ ان کا دین بچا اور نہ دنیا!... وہ لوگ بھی خوش ہورہے تھے کہ... (ہنسی)

جس کے بعد تو عالم یہ تھا کہ وہاں مسلسل گھمسان لڑائیاں ہورہی تھیں۔ بڑے اسپتال کا کوئی بھی حصہ ایسا نہ بچا تھا جو گولیوں سے چھلنی نہ ہوگیا ہو۔ یہ بڑی عمارت اب دور سے ہی لوگوں کو اپنی زبوں حالی کی تصویر دکھا رہی تھی۔ ہاں یہ بھی دکھا رہی تھی کہ وہ کبھی لوگوں کی امیدوں اور آرزوؤں کی آغوش تھی، لیکن اب پوری طرح غم، خوف اور وحشت کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ یہ اب خود اپنے زخموں کو دیکھ کر اشکبار تھی:

کوئی ایک زخم نہیں ہے کہ مندمل ہوجائے گا...

تقریباً ایک ہفتہ اتنی شدید لڑائیاں ہوئیں کہ پاگل خانے کی طرف کوئی جھانک بھی نہ پایا۔ اس علاقے میں اتنی گولی باری ہوئی کہ اگر وہاں گیہوں کی بالیاں بھی بکھیر دی جاتیں تو ہر طرف سے انھیں بھی بھاری اسلحوں سے چن چن کر نشانہ بنا دیا جاتا۔ لیکن سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ پاگل خانہ پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ اس لیے پہاڑ کے اوپر سے یہاں کی تمام چیزیں عیاں تھیں۔ پہاڑ پر مستعد لڑاکوں نے سوچا کہ یہ کوئی دشمن کا ٹھکانہ ہے۔ اس لیے موقع ملتے ہی اسے نذر آتش کردیا۔

آج دوسرا دن تھا اور تیسری رات تھی کہ پاگل خانے کے بیماروں کے لیے نہ کوئی کچھ لایا اور نہ ہی کسی نے ان کی خیریت دریافت کی۔ وہاں سب کے سب بیمار

تقریباً ایک ہفتہ اتنی شدید لڑائیاں ہوئیں کہ پاگل خانے کی طرف کوئی جھانک بھی نہ پایا اس علاقے میں اتنی گولی باری ہوئی کہ اگر وہاں گیہوں کی بالیاں بھی بکھیر دی جاتیں تو ہر طرف سے انہیں بھی بھاری اسلحوں سے چن چن کر نشانہ بنا دیا جاتا۔ لیکن سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ پاگل خانہ پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ اس لیے پہاڑ کے اوپر سے یہاں کی تمام چیزیں عیاں تھیں۔ پہاڑ پر مستعد لڑاکوں نے سوچا کہ یہ کوئی دشمن کا ٹھکانہ ہے۔ اس لیے موقع ملتے ہی اسے نذر آتش کردیا۔

تھے، اور انھیں غذا کی سخت ضرورت تھی۔ حالانکہ اس مشکل گھڑی میں ان بدنصیبوں نے خوردنی اشیا کے حصول کے لیے حتی المقدور کوششیں بھی کی تھیں۔ مگر وہاں ایسا کوئی شخص کہاں تھا جو ان کی فریاد کو سنتا اور ان کے درد کا مداوا بنتا۔ کیونکہ یہ تو خیر و بھلائی کی بات تھی۔ وہاں تو اسلحوں کی گھن گرج میں انسانی صدا بھی اجنبی بن گئی تھی۔ ہر طرف آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے، اور چہار سو گھروں کی تباہی وبربادی کے مناظر تھے۔ یعنی اب تو وہاں صرف تباہی، بربادی اور کشت وخون کا ننگا ناچ تھا۔ وہاں اب انسان کی چیخ وپکار اور آہ وفریاد پر کون دھیان دیتا؟ وہاں تو آدمی ہی آدمی کے لیے بھیڑیا بنا ہوا تھا، اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا تھا!

واقعی وہ بہت ٹھنڈی رات تھی۔ تمام بیماروں کے دانت اس کڑکڑاتی سردی میں قینچی کی طرح بج رہے تھے۔ بھوک تو ان کے لیے ایک دوسری ہی آفت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا اب کسی کے بدن میں خون بھی نہ بچا ہو۔ ان بیماروں کے کئی دن اسی بیچارگی میں گذر گئے۔ اب نہ تو کسی کو ان کے کھانے پینے کی فکر تھی، اور نہ ہی کسی نے ان کی خیریت دریافت کی تھی۔ اس طرح بھوک اور ٹھنڈ نے ان میں اب یہاں ٹھہرنے کے لیے کوئی توانائی بھی نہ چھوڑی تھی۔ وہ رات بہت تاریک وخوفناک بھی تھی، اور ایسی یخ بستہ ٹھنڈ تھی کہ اب محض ان کی جان ہی نکلنی باقی رہ گئی تھی۔ وہاں کل آٹھ لوگ تھے جو وقت کی ستم ظریفی سے تنگ آکر اور گھبراہٹ کے عالم میں آٹھ طرف بھاگے۔ ہر شخص ایک نادیدہ راہ کا راہی ہوگیا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے کے آگے پیچھے چل رہے تھے، اور بالآخر رات کی مہیب تاریکی میں گولیوں سے چھلنی چھلنی ہوگئے۔ گولی چلانے والے جب تک انھیں پہچان پاتے تب تک وہ سب کے سب خون میں لت پت ایک دوسرے کی آغوش میں پڑے موت کے آرزومند تھے۔ جس دم وہ ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے، تو انھی میں سے ایک شخص راہ بھٹک کر عام شاہراہ پر چلا گیا جہاں وہ مذہب کے جاں نثاروں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ ان تمام لوگوں میں صرف ایک دو ہی زندہ بچ پائے تھے، اور باقی سب اسی رات ہلاک ہوگئے۔ ہاں اسی ٹھنڈی اور بدقسمت رات میں!

طلوع صبح کے بعد پتہ چلا کہ اس یخ بستہ رات میں ہی وہ سب کے سب برف کی مانند منجمد ہوگئے تھے۔ اس یخ بستہ شب میں وہاں تمام چیزیں منجمد ہوگئی تھیں۔ شاہراہ اور درختوں کے درمیان انسان بھی منجمد برف کی آغوش میں پڑے تھے۔ ہاں ایسے انسان، پاگل! جن کے بارے میں پچھلے چند دنوں میں نہ تو کسی نے پرسشِ احوال کی تھی، اور نہ ہی ان کے بھوک اور نہ پیاس کے بارے میں کچھ دریافت کیا تھا۔

آدم زادوں (!) نے ان کا خون گولیوں سے بہا دیا تھا۔ تاہم ان کا خون اب منجمد برف کے شیشے نما دل میں محفوظ ہوکر اوپر نیچے متحرک تھا۔ وہ لوگ جو موت کی آغوش میں چیڑ کے درخت کی شاخوں کی طرح برف میں منجمد پڑے ہوئے تھے، انھیں مذہب کے جاں نثاروں نے انتہائی بے غیرتی سے کسی لکڑی کی مانند اٹھا کر ٹرالی میں پھینک دیا جس کے بعد اس بیچارے زخمی شخص، جسے شاہراہ عام کے کنارے ایک سنسان جگہ پر گولیوں سے چھلنی کردیا گیا تھا، کے پاس بھی وہ آدم کش پہنچے۔ جہاں ایسا گمان گزر رہا تھا جیسے کہ وہ شخص ابھی زندہ ہو۔ کیونکہ اس کا خون آلود دایاں ہاتھ زمین پر لفظ 'اللہ' لکھنے کے بعد اسی جگہ پلٹا پڑا تھا۔ لیکن جاہلوں نے اس دلسوز منظر کو بھی نہ دیکھا اور اسے بھی اٹھا کر اسی ٹرالی میں لاشوں کے درمیان پھینک دیا۔ جس کے بعد ٹرالی حرکت کرنے لگی۔ میں نے خون سے لکھے ہوئے لفظ 'اللہ' کا مشاہدہ کیا جو دیکھنے میں ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ اس شخص نے برف کے شیشے میں اپنے پیچھے ایک چراغ روشن کیا ہو۔ جس کے بعد دفعتاً میری آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

■

Mohd Hayatuddin
146-E, Brahmapautra Hostel
JNU, New Delhi - 110067

ٹماٹر
ایک دوائی غذا

شمیم احمد صدیقی

صحت

یونانی مرکبات کی کیمیاوی معیار بندی (standardisation) کے تحقیقی کام میں پچیس برس تک مصروف رہتے ہوئے راقم السطور کو اُن مرکبات میں شامل بیشمار اجزائے ترکیبی (ingredients) یعنی نباتی، حیوانی اور معدنی اجزا کے خواص اور اُن کے طبی فوائد کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اطبائے قدیم یعنی حکیم اور وید صاحبان نے مختلف امراض کے علاج کے لیے دنیا میں پھیلی ہوئی تمام قدرتی اشیاحتیٰ کے جانوروں کے بول و براز (excreta) کو بھی استعمال کیا ہے لیکن یہ جان کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ٹماٹر جیسی بہ آسانی دستیاب سبزی جس کے نام اور مزے سے بچہ بچہ واقف ہے اس کے افعال وخواص اور طبی افادیت کا کوئی ذکر صدیوں سے ہندوستان میں رائج دیسی طریقہ ہائے علاج یعنی طب یونانی اور آیورویدک کی انیسویں صدی تک شائع ہوئی کتب میں نہیں ملتا۔ دونوں دیسی طریقوں کی گذشتہ صدی میں شائع چند کتب میں ٹماٹر کے افعال و خواص اور طبی فوائد کا جو تھوڑا بہت ذکر ہے اس میں بھی خاصا تضاد ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس لذیذ اور خوشنما سبزی کے طبی فوائد کو ہمارے ملک کے حکما اور وید صاحبان نے نظر انداز کیا ہے۔ اس بے اعتنائی کی وجہ جاننے کے لیے ہم نے کئی اطبا سے مذاکرہ کیا اور علم نباتات سے متعلق کتب وانسائیکلوپیڈیا کو کھنگالا نیز انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا۔

مذکورہ بالا تگ ودو کے بعد یہ پتہ چلا کہ ٹماٹر کے پودے کی دریافت زیادہ پرانی نہیں ہے اور یہ کہ انیسویں صدی تک اٹلی کے علاوہ دیگر ملکوں میں ٹماٹر کو بطور غذا استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ آرائشی پودوں کی طرح گملوں اور کیاریوں میں اُگایا جاتا تھا۔ حالانکہ ٹماٹر کی خوبصورت بناوٹ اور چمکدار و دیدہ زیب رنگ کی بنا پر اس کو محبت کے سیب (Love apples) کہہ کر پکارا گیا لیکن بہت عرصے تک اس کو زہریلا تصور کرتے ہوئے اس کو کھانے سے گریز کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نباتی سائنس کے لحاظ سے ٹماٹر کا خاندان وہی ہے جو لُفّا یا بیلا ڈونا نام کے زہریلے پودے کا ہے۔ ہندوستان میں اس کی باقاعدہ کاشت انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی۔ فی الوقت ٹماٹر کی کاشت دنیا کے تمام معتدل آب وہوا والے خطوں میں کی جاتی ہے اور یہ ہماری غذا کا اہم جز بن چکا ہے۔

2013 میں اکٹھا کیے گئے اعداد وشمار (جدول-I) سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ٹماٹر کی مجموعی پیداوار سولہ سو چونتیس (1634) لاکھ ٹن تھی جس میں چین پہلے نمبر پر اور ہندوستان دوسرے نمبر پر تھا۔

جدول 1: مختلف ممالک میں ٹماٹر کی پیداوار (2013)

شمار	ملک	پیداوار (لاکھ ٹن میں)
.1	چین	506
.2	ہندوستان	183
.3	متحدہ امریکہ	126
.4	ترکی	118
.5	مصر	85
.6	ایران	62
.7	اٹلی	56
.8	اسپین	49
.9	پرتگال	14
.10	یونان	10

دنیا میں ٹماٹر کی بیشمار قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اندرونی گودے کا رنگ لال کے علاوہ سفید، پیلا، نارنجی اور گلابی بھی ہوتا ہے لیکن عموماً لال رنگ والے پھل پسند کیے جاتے ہیں۔ سائز میں انتہائی چھوٹا ٹماٹر مٹر کے بڑے دانے کے برابر محض 2 سینٹی میٹر حجم کا ہوتا ہے جس کو برطانیہ میں ٹائنی ٹام (Tiny Tom) کہہ کر پکارتے ہیں جبکہ انتہائی بڑی سائز کا پھل جس کا حجم 15 سینٹی میٹر تک اور وزن نو سو (900) گرام تک ہوتا ہے بگ بوائے (Big Boy) نام سے پکارا جاتا ہے۔ ٹماٹر سلاد کے طور پر بغیر پکائے بھی کھایا جاتا ہے نیز مختلف سبزیوں اور گوشت کے ساتھ پکا کر بھی کھایا جاتا ہے۔ اس کا جوس، چٹنی، کیچ اپ اور ساس بھی اکثر دسترخوانوں پر دکھائی دیتے ہیں۔ بیج اور چھلکے سے پاک خشک ٹماٹر پاؤڈر پوری (Puri) نام سے بکتا ہے۔

نباتی سائنس کے لحاظ سے ٹماٹر ایک پھل ہے لیکن دنیا بھر کے عوام اس کو سبزی ہی مانتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں 1887 میں یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حکومت نے سبزیوں کی فروخت پر محصول عاید کردیا لیکن پھلوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا گیا لہٰذا ٹماٹر کے تاجروں نے اس کو پھل کہہ کر ٹیکس ادا کرنے سے منع کیا۔ وہاں کی سپریم کورٹ نے پانچ سال تک چلنے والے اس مقدمہ میں بالآخر یہ فیصلہ سنایا کہ ٹماٹر کو سبزی کے زمرے میں ہی رکھا جائے کیونکہ اس کا تمام تر استعمال ایک سبزی کی مانند ہی ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دیگر پھلوں کی مانند یہ زیادہ میٹھا نہیں ہوتا، اس میں مٹھاس برائے نام ہوتی ہے۔

جہاں تک ٹماٹر کے کیمیاوی اجزا کا تعلق ہے اس میں پروٹین تو صرف ایک فیصد اور شکری اجزا چار فیصد (4%) ہیں لیکن وٹامن سی اور دیگر وٹامن نیز پوٹیشیم، فاسفورس، میگنیشیم، مینگنیز، فولاد، جستہ اور آیوڈین کے حامل نمکیات کی مقدار اس قدر ہوتی ہے کہ کوئی دوسری سبزی یا پھل ٹماٹر کے ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ ان اجزا کے علاوہ اس میں موجود رنگین مادے لائیکوپین (Lycopene)، بیٹا کیروٹین (b-carotene) اور ذی زینتھین (Zeazanthin) امراض قلب ومعدہ کے علاوہ کینسر جیسی موذی بیماری کی روک تھام میں بڑے موثر ثابت ہوئے

ہیں۔ پروٹین اور سکری اجزا کے انتہائی کم ہونے کی وجہ سے ٹماٹر کا بطور غذا استعمال شکر (diabetese) کے مریضوں کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔

دیسی طریقۂ علاج خصوصاً آیورویدِ میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں اور دیگر قدرتی اشیا کے افعال اور خواص پر گذشتہ صدی میں شائع کے اہم تذکرنی کی انڈین میٹریا میڈیکا (تیسرا ایڈیشن) میں ٹماٹر کی خوبیوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

1. تمام اشیائے خوردنی میں سب سے زیادہ وٹامن ٹماٹر میں ہوتے ہیں۔

2. تمام اشیائے خوردنی میں ٹماٹر سب سے بہتر مصفّی خون ہے۔

3. قدرتی تیزابی مادے، جو ہمارے معدے اور آنتوں کی درستگی کے لیے ضروری ہیں، وہ دوسری تمام سبزیوں کی بہ نسبت ٹماٹر میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔

4. گردوں کے فعل کو درست رکھنے اور ان میں موجود سمی مادوں کے اخراج میں ٹماٹر دوسرے تمام قدرتی وسائل کی بہ نسبت اعلیٰ ترین صفات کا حامل ہے۔

حکیمی علاج یعنی طبِ یونانی میں مستعمل قدرتی اشیاء سے متعلق حکیم مظفر حسین اعوان کی 'کتاب المفردات' میں ٹماٹر کے مزاج کو معتدل خشک بتاتے ہوئے اس کو ہاضم، قبض کشا نیز مرض کساح، یرقان، ورم گردہ، قلت خون، ذیابیطس اور سمن مفرط کے ازالے میں مفید بتایا گیا ہے۔ حکیم دلجیت سنگھ نے 1974 میں شائع اپنی 'یونانی درویہ گن آدرش' میں ٹماٹر کو بادی اور سوداوی خون پیدا کرنے والا تصور کرتے ہوئے اس کے فوائد کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ یورپ میں اس کا جوس اوپر کا دودھ پینے والے بچوں، اسکروی (Scurvy) کے مریضوں نیز عام جسمانی کمزوری والوں کے لیے مفید پایا گیا ہے۔ ٹماٹر کے مزاج کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں کہا ہے۔ ڈاکٹر بلیغ الدین جاوید نے 1983 میں شائع اپنی کتاب 'سبزیوں سے علاج' میں مظفر حسین صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے ٹماٹر کا مزاج سرد تر بتایا ہے اور دلجیت سنگھ سے اتفاق کرتے ہوئے بادی تو تسلیم کیا ہے لیکن سوداوی تاثیر کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کو بلغم اور تفخ پیدا کرنے والا بیان کیا ہے، ٹماٹر کے فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ مصفّی خون، معدے کے نظام کو درست رکھنے والا، دانتوں کی مضبوطی کا ضامن اور قوت باہ میں اضافہ کرنے والا ہے۔

یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہم ہندوستانی گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ٹماٹر کو بطور لذیذ غذا استعمال کرتے آرہے ہیں لیکن اس کے حیرت انگیز طبی فوائد کا علم ہوجانے کے بعد بھی دیسی علاج کے طریقوں یعنی طب یونانی اور آیورویدک میں اس کو اس طرح سے دوائی حیثیت حاصل نہ ہوسکی جس طرح سے مکو کو حاصل ہے جب کہ نباتی سائنس کے لحاظ سے یہ دونوں پودے ایک ہی خاندان یعنی سولے نیسی فیملی (Solanacae family) سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کے پھلوں میں بڑی یکسانیت بھی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں کئی درجن سرکاری ادارے طب یونانی اور آیورویدک سے متعلق تحقیقاتی کاموں میں مصروف ہیں۔ کاش کسی ادارے میں ٹماٹر پر بھی توجہ کی جاتی اور اس کو باضابطہ طور پر ان طریقہ ہائے علاج میں شامل کیا جاتا۔

گذشتہ صدی کے آخر تک پیدا ہونے والے ٹماٹروں میں یہ عیب پایا جاتا تھا کہ تیار حالت میں پودے سے توڑے جانے یا چوٹ کھا جانے کے بعد بہت جلد سڑ جاتے تھے لیکن 1992 میں نباتی سائنس انجینئروں نے ٹماٹر میں ایسی جینیاتی تبدیلی (Genetic modification) کی کہ پوری طرح تیار ٹماٹر بھی کافی دنوں تک خراب نہیں ہوتے لیکن اس تبدیلی کے بعد ٹماٹر کے ترش مزے میں خاصی کمی واقع ہوگئی۔

جسمانی صحت کی درستگی اور تھکے ہوئے دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے ورزش اور کھیل کود کی اپنی اہمیت ہے۔ چونکہ کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال جیسے کھیلوں کے لیے بڑے میدان اور خاص قسم کے ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اسپین کے باشندوں نے اپنے لیے ایک انوکھا کھیل ایجاد کیا ہے۔ ماہِ اگست میں وہاں ٹماٹر کی فصل اپنے شباب پر ہوتی ہے اور ٹماٹر کو زیادہ وقفہ تک محفوظ رکھنا مشکل ہوتا ہے (جو کہ 1992 کے بعد خاصا آسان ہوگیا ہے) اس لیے کھلاڑی ایک چھوٹے میدان میں جمع ہوکر ایک دوسرے پر ٹماٹر پھینک کر مارتے ہیں۔ جو شخص اس لڑائی میں تھک جاتا ہے وہ میدان سے باہر ہوجاتا ہے یعنی اپنی ہار تسلیم کرلیتا ہے۔ کھیل کا نام 'لاٹو ماٹینا' (La tomatina) رکھا گیا ہے اور یہ اگست کے آخری بدھ کو کھیلا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے ملک کا ایک طبقہ بغیر سوچے سمجھے مغربی ملکوں کی نقالی کرتا ہے لہٰذا کچھ عرصہ قبل بنگلور اور دہلی میں کچھ کھلنڈرے مزاج کے لوگوں نے اس کھیل کو رائج کرنا چاہا تھا لیکن ان ریاستوں کے سمجھدار حکمرانوں نے اس پر پابندی عائد کردی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی جنس جو انسانوں کی غذا کے طور پر استعمال ہوتی ہے اس کو محض دل بہلانے کے لیے ضائع کرنا حماقت ہی ہے۔

حوالہ جات:

(1) کتاب الجامع لمفردات الادویہ والاغذیہ، ابن بیطار، اردو ترجمہ، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی، 1999

(2) محیط اعظم، محمد اعظم خاں، مطبع نظامی، کانپور، 1868

(3) مخزن الادویہ، سید محمد حسین، منشی نول کشور پریس لکھنؤ، 1911

(4) مخزن الادویہ، مولوی نور کریم، منشی نول کشور پریس لکھنؤ، 1921

(5) ڈکشنری آف اکانومک پروڈکٹس آف انڈیا، جارج واٹ، جلد 5، صفحہ 100، 1891

(6) یوزفل پلانٹس آف انڈیا اینڈ پاکستان۔ جے ایف دستور، ڈی بی تاراپوروالا اینڈ سنس پرائیویٹ لمیٹڈ، 1985

(7) ہمدرد فارماکوپیا آف ایسٹرن میڈیسن، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، 1969، صفحہ 158، 1956

(8) گلاسری آف انڈین میڈیسنل پلانٹس، آر این چوپڑہ و دیگر۔ سی ایس آئی آر، نئی دہلی، صفحہ 158، 1956

(9) دی اسٹنڈرڈ انسائیکلو پیڈیا آف ہارٹیکلچر، دی میکملن کمپنی، نیویارک، جلد 3، صفحات 3353 تا 3359، 1953

(10) میک گراہل انسائیکلو پیڈیا آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی، جلد 13، صفحات 665,666، 1960

(11) ویلتھ آف انڈیا، سی ایس آئی آر، نئی دہلی، جلد 6، صفحہ 187، 1962۔

(12) کمپینڈیم آف انڈین میڈیسنل پلانٹس۔ آر پی رستوگی و بی این مہروترا، جلد 3، صفحات 399، 400، پی آئی ڈی، نئی دہلی، 1993

(13) انڈین میٹریا میڈیکا۔ کے ایم نڈکرنی۔ باہے پاپولر پرکاشن، بمبئی [طبع سوم] جلد اول۔ صفحات 756 تا 758، 1954

(14) کمپینڈیم آف انڈین میڈیسنل پلانٹس۔ پی ایس واریر، آر بیدسالے۔ کوٹاکل اورینٹ لانگمین۔ جلد 3، صفحہ 354، 1995

(15) کتاب المفردات، مظفر حسین اعوان، شیخ غلام علی اینڈ سنس، لاہور [طبع سوم] صفحات 193، 194، 1960

(16) یونانی درویہ گن آدرش، دلجیت سنگھ، آیورویدک ایوم طبی اکاڈمی، لکھنؤ، صفحات 254,355، 1974

(17) سبزیوں سے علاج، ڈاکٹر بلیغ الدین جاوید، مرکزی ادارۂ تبلیغ دینیات، نئی دہلی، صفحات 65 تا 68، 1983

(18) یونانی ادویہ مفردہ۔ سید صفی الدین علی، نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج، نئی دہلی، 1997

(19) کوانٹی ٹیوٹ اسسمنٹ آف اینٹی آکسیڈنٹ پراپرٹیز آف نیچرل کلرینٹس اینڈ فائٹو کیمیکلس۔ جنرل آف سائنس آف فوڈ اینڈ اگریکلچر، جلد 81، صفحات 559 تا 568، 2001

(20) ٹماٹر: تاریخی حیثیت اور طبی افادیت' سہ ماہی جہان طب' صفحات 26 تا 31، جنوری-مارچ 2002

(21) انٹرنیٹ سروس ''وکی پیڈیا'' سے ماخوذ۔

■

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui
C-2, Naseem Manzil
Madah Ganj, Police Chowki
Lucknow - 226020 (UP)

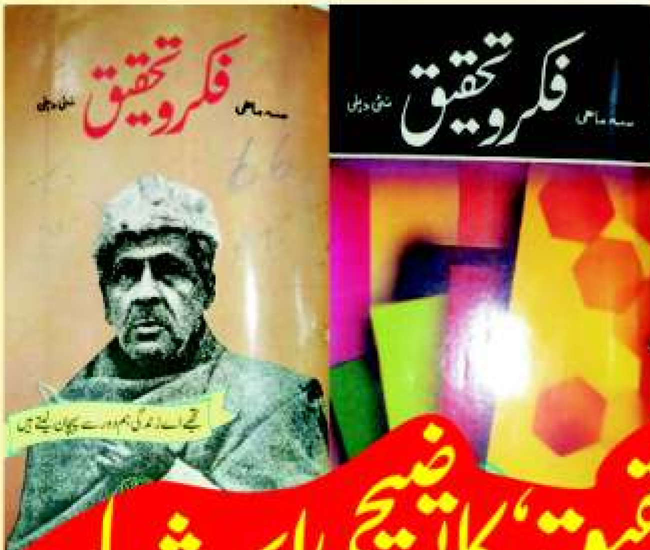

ارشاد قمر

'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ

(جنوری تا مارچ، اپریل تا جون، جولائی تا ستمبر اور اکتوبر تا دسمبر 1999)

قسط 5

جنوری تا مارچ

(1) ہندو فلسفہ اور مذہب پر پہلی معلوم فارسی کتاب: پروفیسر نذیر احمد

فارسی میں ہندو فلسفہ اور مذہب پر پہلی دریافت شدہ کتاب 'حوض الحیات' ہے جو ایک سنسکرت کتاب 'امرت کنڈ' کا ترجمہ ہے لیکن اس کتاب کے مترجم کا نام مذکور نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ابتدائی دور میں مسلم علما ہندوؤں کے علمی و مذہبی افکار میں دلچسپی رکھتے تھے۔ پروفیسر نذیر احمد کا یہ مضمون ایک ایسی کتاب کا مختصر مگر جامع مطالعہ ہے جس پر شاید پہلے کبھی نہیں لکھا گیا۔

(2) عالم عرب 1914 سے 1978: ڈاکٹر عبدالعلیم/ عابد سہیل

یہ مقالہ مشہور دانشور ڈاکٹر عبدالعلیم کا ہے جو ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں اور ممبروں میں سے تھے۔ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ممالک کے مختلف قسموں کی سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی اور ان کے تاریخی پس منظر کا صحیح تناظر میں مطالعہ ضروری ہے۔ اس کمی کو یہ مضمون، جو انگریزی میں تھا جس کو مشہور افسانہ نگار عابد سہیل نے ترجمہ کیا ہے اور ترجمے کا حق بھی ادا کیا ہے، پورا کر سکے گا۔

(3) اردو شاعری کا علامتی نظام: پروفیسر سیدہ جعفر

پروفیسر سیدہ جعفر ایک باسند محقق کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کا یہ مقالہ مختلف اصناف سخن اور خاص طور پر غزل میں علامت و تشبیہ کی تہہ داری، رمزیت و کنایہ نئے نئے مفاہیم و براہین کے دروازے وا کرتا ہے۔ علامت اچھے شعر کی پہچان بھی ہے اور قدر و قیمت کی کسوٹی بھی۔ ان باتوں کی وضاحت و تصریح بڑی ہی سنجیدگی اور خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(4) قدیم ہندوستان کا فن تعمیر: ڈاکٹر خلیق انجم

برصغیر ہند و پاک کی تاریخ کا قدیم عہد، ابتدائی زمانے سے لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد تک کا زمانہ ہے، جو تقریباً چار پانچ ہزار سال کی طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق ہندوستان کی قدیم تہذیب وہ ہے جسے ہم 'وادی سندھ تہذیب' یا 'ہڑپا تہذیب' کہتے ہیں۔ اس تہذیب کا شمار انسانی تاریخ کی عظیم تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ خلیق صاحب کا یہ مضمون ایک طویل موضوع کا نچوڑ ہے جس میں مندرجہ بالا باتوں کی پوری وضاحت ہے۔

(5) میتھلی شرن گپت بحیثیت قومی شاعر: ارشد سراج ارشد

میتھلی شرن گپت ہندی کے بہت اہم شاعر ہیں اور تاریخ کے جس دور میں وہ تھے وہ سماجی، سیاسی اور ادبی تحریکوں اور نئے نئے خیالات منظر عام پر آ رہے تھے۔ رومانوی اور چھایاوادی سے کرانتی وادی تک سب ایک ہی وقت میں پنپ رہے تھے۔ میتھلی شرن گپت کی شاعری کا ایک اہم باب ان کی وطن پرستی پر بھی ہے۔ ارشد سراج ارشد نے اس زاویے کو ملحوظ خاطر رکھ کر ایک تنقیدی مطالعہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

(6) وحشت اور غالب: مظہر امام

وحشت نے جس زمانے میں اپنی شاعری شروع کی اس وقت داغ اور امیر کے نغمے فضا میں گونج رہے تھے۔ ایسے حالات میں وحشت نے اپنے اسلوب شاعری کے لیے غالب کی شاعری کو رول ماڈل کے طور پر اختیار کیا۔ اپنے کلام میں انھوں نے غالب کے رنگ کو بحسن وخوبی انجام دینے کی کوشش کی۔ مظہر امام نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔

(7) خواجہ احمد فاروقی: رفعت سروش

رفعت سروش نے اپنے اس مضمون میں خواجہ احمد فاروقی کے بارے میں ان تمام پہلوؤں اور گوشوں کو اجاگر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ چونکہ فاروقی صاحب دلی کی ادبی زندگی میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے اور یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ انھوں نے آزادی کے بعد علمی حلقوں میں اردو کورس کا جائز مقام دلانے میں پیش پیش رہے اور اس کو سرخروئی بھی عطا کی۔

(8) راس کبیر سے راس شکیل تک: رضوان احمد

رضوان احمد بے باک صحافی اور قلمکار ہیں، لکھنا پڑھنا ان کی عادتوں میں ہے۔ انھوں نے راس کبیر سے راس شکیل تک کے عہد کو ایک محققانہ اور تنقیدانہ رویے کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں کے کلام میں یکسانیت تلاش کر کے ادبی حلقوں کو روشناس کرایا ہے یہ ان کا علمی کارنامہ ہے جس سے دیگر لوگ بھی بہرہ ور ہوئے ہیں۔

(9) انتخاب دواوین (تحقیق و تنقید کے آئینے میں): ڈاکٹر رئیس احمد

اردو میں تنقید کی ابتدا تذکروں سے ہوتی ہے۔ انتخاب دواوین امام بخش صہبائی کا مرتب کیا ہوا ایک انتخاب ہے جس میں ان کے سب سے اہم ہم عصر غالب کا کلام نہیں ہے۔ انھیں اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے رئیس احمد نے اس انتخاب کے مختلف نسخوں کی چھان بین کر کے صحیح صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(10) عہد سرسید میں مضمون نگاری کے موضوعات: محمد شمس اقبال

محمد شمس اقبال اپنے اس مضمون میں سرسید کے عہد میں مضمون نگاری کی کیا حیثیت تھی اور مضمون نگار اپنے مضامین کے ذریعے کیا انقلابات لائے اور ساتھ ہی

ساتھ سرسید نے اپنے ہم عصروں اور دیگر قلمکاروں سے مضامین کی شکل میں جو خدمات لی ہیں ان تمام کو بڑی ہی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(11) منٹو کافن: ڈاکٹر نگار عظیم

ہر فنکار ذاتی طور پر اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اس کے بعد اپنے انداز میں اس کو بیان کرتا ہے۔ کبھی کبھی فنکار کا انداز بیان اس کے لیے وبال جان ثابت ہوتا ہے۔ جیسے کہ منٹو کے ساتھ ہوا۔ نگار عظیم نے انھیں پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(12) محشر خیال: قارئین کے خطوط

اس کے تحت قارئین کے خطوط ہوا کرتے ہیں جس میں قاری کی رائے ومشورے اور ان کے دلی جذبات ہوا کرتے ہیں اور عام طور سے قارئین کی آرا رسالے کے آخیر میں ہوا کرتی ہے۔

اپریل تا جون

(1) جام جہاں نما: پروفیسر سید امیر حسن عابدی

ملا محمد خطا شوستری نے 'جام جہاں نما' لکھ کر ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کی تھی اور اس کا شمار ایک اہم سفرنامے کے طور پر ہوتا ہے۔ پرفیسر سید امیر حسن عابدی نے بڑی جانفشانی کے ساتھ اس پر خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کی چونکہ یہ ایک ایسا سفرنامہ ہے جس کا صرف ایک مضمون کی شکل میں خلاصہ پیش کرنا ذرا مشکل امر ہے لیکن عابدی صاحب نے اہم اہم نکات کی جانب اشارہ کرکے ایک اہم کام کیا ہے۔

(2) کلاسیکی متون کی تدوین کیسے ہوگی؟: رشید حسن خاں

متون کی تدوین کا کام بہت اہم ہے۔ اس جوکھم بھرے کام کو رشید حسن نے بڑی سنجیدگی اور عمدگی سے انجام دیا ہے۔ کیا آج کے دور میں ہمارے اسکالرس اس طرح کا کام کرتے ہیں جبکہ کلاسیکی متون کی تدوین ایک اہم مسئلہ ہے اس کی جانب توجہ دینے کی خاص ضرورت ہے۔

(3) البیرونی: پروفیسر ظفر احمد نظامی

پروفیسر ظفر احمد نظامی نے برہان الحق ابوالریحان محمد بن احمد خوارزمی البیرونی کی علمی لیاقت وقابلیت کا ذکر اپنے اس مضمون میں کیا ہے اور ان کی گوناگوں خدمات کو

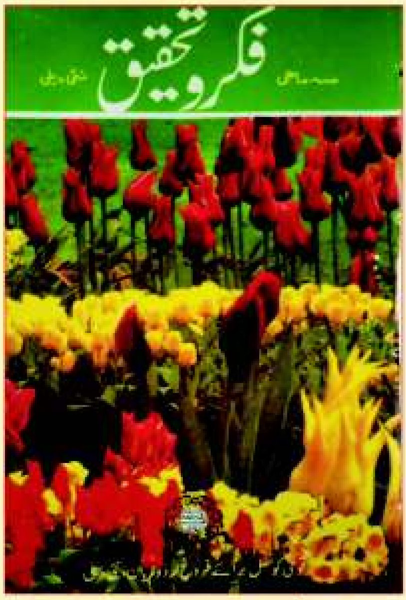

یکجا کرکے قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

(4) فرقہ واریت کے خلاف پریم چند کا جہاد: ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

منشی پریم چند اردو کہانی کا ایک عہد ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''انھوں نے واقعہ نگاری نہیں کی، حقیقت نگاری کی ہے۔ وہ ہر واقعہ کے مرکز میں اترے اور واقعہ کو اس طرح پیش کیا کہ اس کا ہر روپ، ہر رنگ اور اس کا پس منظر سب میں قاری شریک ہو، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے اس مضمون میں پریم چند کے فن کے ساتھ ان کے نظریے کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

(5) سحرالبیان: کمال احمد صدیقی

آج کی صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ متن اور تنقید میں متن کی تدریس کو لوگوں نے پس پشت ڈال دیا ہے اور صرف تنقید کے سہارے ادب سے واقفیت حاصل کرنے کا عام چلن ہوتا جارہا ہے جو کہ ادب کے لیے مضر ثابت ہوگا۔ انھیں تفصیلات اور اہمیت کی جانب کمال احمد صدیقی نے توجہ دی اور اپنے اس بیش بہا مضمون میں عقدہ سمجھانے کی کوشش کی ہے اور پوری توجہ قرأت متن پر دیا ہے۔

(6) چہار بیت کا تاریخی پس منظر: ڈاکٹر شکیل جہاں گیری

شاعری اور موسیقی ساتھ ساتھ چلنے والی چیز ہے اور دونوں کا شمار فنون لطیفہ میں ہوتا ہے اور دونوں کی اپنی الگ الگ اہمیت ہے۔ ہمارے بہت سے ادیبوں نے چہار بیت کی ایجاد کا سہرا افغانستان کے سرحدی پٹھانوں کے سر باندھا ہے۔ انھیں اختلاف کو شکیل جہانگیری نے اپنے مطالعے کا موضوع بنا کر ساری چیزوں کو سامنے لانے کی ایک کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

(7) ہندوستانی جمالیات کشمیر اور اردو: نریندر لوتھر

نریندر لوتھر نے اپنے اس مضمون میں کشمیر کی خوبصورتی اور قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ اردو پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے اور علم و ادب کے متوالوں نے اس سے کیا کیا سیکھا اس جانب بڑی سنجیدگی اور گہرے مطالعے سے اسے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

(8) میر خلیق کے مراثی: ڈاکٹر انوار رضوی

ڈاکٹر انوار رضوی نے نہ صرف میر خلیق کے مراثی پر تحقیقی مقالہ لکھا بلکہ مرثیہ کے بارے میں جو باتیں مدتوں سے کہی جارہی تھیں ان کو بھی باطل قرار دیا۔ عرف عام میں یہ چلن تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوا کرتا ہے اس کی تردید کرتے ہوئے انھوں نے اسے حالات حاضرہ سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔

(9) دوصد سالہ جشن غالب: ڈاکٹر علی احمد فاطمی

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے پوری دنیا میں جو دو برسوں میں غالب سے متعلق جشن منایا گیا ان تمام جشنوں کے بارے میں ایک سرسری مگر معلوماتی مضمون پیش کیا ہے تاکہ ساری چیزیں یکجا ہو جائیں۔

(10) عصمت چغتائی کا فن: ڈاکٹر شمع افروز زیدی

شمع افروز زیدی نے عصمت چغتائی پر پی ایچ ڈی کی تھی اور اس میں جو عصمت کے فن سے متعلق باتیں کہی گئی ہیں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

جولائی تا ستمبر

(1) جدوجہد آزادی میں اردو ادیبوں کا حصہ: عبدالقادر سروری (مرحوم)

پروفیسر عبدالقادر سروری نے بڑے وسیع دائرے میں قابل ذکر کام کیا ہے۔ دکنی کے ادبی ذخیرے کے علاوہ اردو مثنوی، زبان اور علم زبان اور کشمیری ادیبوں کے کام پر بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ان ادیبوں اور شاعروں کا اپنے اس مضمون میں ایک تعارف پیش کیا ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔

(2) احمد گلچین معانی: دور جدید کا سب سے بڑا ایرانی ہند شناس: نذیر احمد

احمد گلچین معانی کا شمار نامور ایرانی محققین میں ہوتا ہے اور یہ ایک ایسے محقق ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا کافی حصہ ہند شناسی کے موضوع کی تحقیق پر صرف کیا ہے اور بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مشرق و مغرب کے کسی فاضل نے ہندوستانی فارسی کی تحقیق پر اتنا قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ نذیر احمد نے احمد گلچین کے تحقیقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ایک سعی کی ہے۔

(3) اردو کا ابتدائی دور پانچواں باب: شمس الرحمٰن فاروقی

زبان، سماج اور کلچر میں جو گہرا رشتہ ہے اس سلسلے میں امریکہ میں، شکاگو یونیورسٹی نے ایک جامع پروگرام مرتب کیا اور ہندوستان کی قدیم اور جدید زبانوں کے ماہروں سے مضامین لکھوائے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی فاروقی صاحب ہیں جنھوں نے اس موضوع پر سات جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

(4) ڈاکٹر گیان چند اور قاضی عبدالودود: حنیف نقوی

گیان چند اور قاضی عبدالودود اپنے دور کے پائے کے محقق رہے ہیں۔ حنیف نقوی صاحب نے ان دونوں محققوں کی تحقیقی کاوشوں کو اپنے اس مضمون میں پیش کیا ہے اور دونوں کی تحقیقی سرگرمیاں اور طرز کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔

(5) غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ: شمیم حنفی

غالب کی سب سے اہم اور خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنے عہد میں جاری روایات سے کھل کر بغاوت کی اور اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی اور نئی ادبی روایات کی داغ بیل ڈالی وہ آج بھی پھل پھول رہی ہے۔ غالب کے سماجی شعور ان کے احساس اور ان کی فکر پر شمیم حنفی صاحب کا یہ مضمون خاصے کی چیز ہے۔

(6) اردو کی ایک نایاب مثنوی، جواہر البیان: فیروز احمد

ڈاکٹر فیروز احمد نے جس جانفشانی اور محنت سے جواہر لعل کی مثنوی جواہر البیان پر خامہ فرسائی کی ہے وہ قابل داد ہے چونکہ میرے ناقص مطالعے کے پیش نظر اس پر شاید پہلے کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ جواہر لعل نے اپنی مثنوی لکھتے وقت سحر البیان کے نمونے کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

(7) غالب سلک تحریر: انصار اللہ

مرزا اسداللہ خاں غالب کے بعض کمالات تو اکتسابی تھے لیکن کچھ امتیازی خصوصیات بھی تھیں جسے ہم خداداد کا نام دے سکتے ہیں۔ انصار اللہ صاحب نے انھیں کمالات و امتیازات کو اپنے اس مضمون میں اجاگر کر کے لوگوں تک پہنچانے کی ایک سعی کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

(8) جوش ملیح آبادی، لفظا یا غزل کا نباض: مظفر حنفی

جوش کی لفظیات کا دائرہ نظیر اکبرآبادی اور میر انیس کی طرح بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال کا ہنر جوش کے پاس ہے وہ کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔ مظفر حنفی کا یہ مقالہ انھیں موضوعات پر مشتمل ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مظفر حنفی صاحب جشن جوش ملیح آبادی کی تقریبات میں شرکت کرنے لندن گئے تھے اس مناسبت سے انھوں نے یہ مقالہ پڑھا تھا۔

(9) آصف جاہ کی شادی پر وہم کی مثنوی: اکبر حیدری کشمیری

نوابوں کے دور میں جو شادیاں ہوا کرتی تھیں

(خاص طور سے نوابوں کی) اسے بھی قلم کار حضرات مثنوی کی شکل میں پیش کر دیا کرتے تھے اس کی ایک مثال آصف جاہ کی شادی پر وہم کی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں بھی اس وقت کی شادی کے جو رسم و رواج ہوا کرتے تھے ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ اکبر حیدری کشمیری نے اسے مضمون کی شکل میں پیش کیا ہے۔

(10) اقبال شناسی اور جمالیات: قدوس جاوید

اقبال کی کشمیر سے اور اہل کشمیر کی اقبال سے قربت ایک روایت و درایت کا درجہ رکھتی ہے اور اقبال نے اپنی شاعری میں کشمیر کا جابجا ذکر بھی کیا ہے۔ اقبال شناسی اور جمالیات کے موضوع پر قدوس جاوید کا یہ مقالہ پر مغز اور معلومات افزا ہے۔

(11) ٹیلی ویژن اور اس کا ارتقا: محمد شاہد حسین

ٹیلی ویژن نے ہر فرد اور شخص کو ایک ایسے گاؤں میں لا کر بسا دیا ہے جسے ہم دنیا کے نام سے جانتے ہیں۔ شاہد حسین صاحب نے اپنے اس بیش بہا مضمون میں ٹیلی ویژن کے ارتقا وغیرہ پر بڑی سنجیدگی سے گفتگو کی ہے اور اس کے کیا مد و جزر رہے ہیں ان سب کی تفصیلات اس مضمون میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

اکتوبر تا دسمبر

قومی اردو کونسل جو اردو کے فروغ کے لیے ہمہ جہت کوشاں ہے الہ آباد میں 'فراق گورکھپوری: عہد اور فن' کے عنوان پر اترپردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد ہوا تھا اس سمینار میں جو مقالے پڑھے گئے 'فکر و تحقیق' کا یہ شمارہ انہی مقالوں پر مشتمل ہے۔

(1) فراق گورکھپوری: فن اور عہد (افتتاحی خطبہ): ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی

فراق اردو کے بلند پایہ شاعر ہی نہیں بلکہ ایک روشن خیال دانشور بھی تھے۔ شاعر کی حیثیت سے انھوں نے جہاں اردو شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا وہیں دوسری طرف ان کی خیال انگیز نثری تحریروں نے اردو کے تہذیبی کردار اور متحدہ قومی تشخص کو خصوصیت سے نمایاں کیا۔ انھیں خصوصیات کی جانب مرلی منوہر جوشی نے اشارہ کیا۔

(2) فراق گورکھپوری: فن اور عہد (دو روزہ قومی سمینار): رپورٹ

اس کے تحت دو روزہ قومی سمینار کی پوری تفصیلات اور رپورٹ ہے۔

(3) فراق: کمال احمد صدیقی

کمال احمد صدیقی نے اس مضمون میں فراق کے حالات زندگی کو پیش کیا ہے اور ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جو فراق کی زندگی میں پیش آئے تھے۔

(4) فراق، ان کے ہم عصر اور نئی غزل کی روایت: شمیم حنفی

شمیم حنفی صاحب نے فراق ان کے ہم عصر اور نئی غزل کی روایت کی کڑی کو پوری محنت سے پیش کیا ہے اور کیا صورت حال تھی ان سب کا ایک اجمالی جائزہ بھی لیا ہے۔

(5) فراق اور اس کے معاصرین: لئیق صلاح
فراق کے معاصرین میں یگانہ، حسرت، فانی اور جگر کے علاوہ اور بھی حضرات ہیں۔ لئیق صاحب نے ان کے کلام کی خصوصیات پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔

(6) فراق اور ہندوستانی تہذیب و تشخص: محمد زماں آزردہ
اردو شاعری کی مقبولیت کا بڑا راز اس کا مقامی اور عام ہونا ہے۔ چاہے کوئی بھی صنف سخن ہو ہمارے شعراء نے اسے مقامی رنگ میں رنگ کر اس کی اہمیت و افادیت میں چار چاند لگائے ہیں۔ زماں آزردہ نے بھی اسی جانب اشارہ کیا ہے۔

(7) فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی شناخت: غلام نبی خیال
اردو شاعری میں فراق کا نام ہندوستان کی تہذیبی میراث اور ثقافتی ورثے کے حوالے سے ایک منفرد حیثیت اور مقام کا حامل ہے۔ غلام نبی خیال نے انھیں نکات کی جانب اشارہ کیا ہے۔

(8) فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور اس کا تشخص: افغان اللہ خاں
فراق کی شاعری ایک ایسا دریا ہے جس میں کئی فکری اور تہذیبی دھارے مختلف سمتوں سے آکر ملتے ہیں۔ انھیں سمتوں کو افغان اللہ خاں نے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

(9) فراق کی غزل کے امتیازات تعین قدر کا مسئلہ: ابوالکلام قاسمی
فراق کے شاعرانہ امتیازات کی نشاندہی کرنا ایک ذمے داری کا کام ہے چونکہ بڑے شاعر کے کلام کے ساتھ انصاف کر پانا اور اس کے تعین قدر کا مسئلہ ذرا اہم ہے۔ اسی نکتے کی جانب قاسمی صاحب نے مضمون قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔

(10) فراق کی عشقیہ شاعری: ہربھجن سنگھ دیول
فراق کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں لیکن جس جہت کو کلیدی اہمیت حاصل ہے وہ ہے محبت کا جذبہ، ہربھجن سنگھ نے اپنی توجہ کا مرکز فراق کی عشقیہ شاعری پر ہی رکھا ہے اور اپنے مضمون میں اسے برتا بھی ہے۔

(11) فراق کی رباعی گوئی: سیدہ جعفر
سیدہ جعفر نے اپنے مضمون میں فراق کی رباعی کے بارے میں لکھا ہے اور رباعی گوئی کی جو روایت معدوم ہوگئی تھی اسے زندگی بخشنے میں فراق نے کیا کیا جتن کیے اسے بڑے ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

(12) فراق کی شاعری تخلیقی ارتفاع کے تناظر میں: ابوالفیض سحر
ابوالفیض سحر نے فراق کی تہہ دار شخصیت اور ان کے برگزیدہ فکر و فن کے مختلف پہلوؤں کا جن میں ہماری قومی، سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور تہذیبی جھلکیاں نظر آتی ہیں انھیں مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔

(13) اردو شاعری کو فراق کی دین: شمیمہ رضوی
شمیمہ رضوی کا یہ مضمون فراق کے ان اہم کاموں پر ہے جس پر اردو دنیا ناز کرتی ہے جیسے فراق نے اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور اردو شاعری کے آسمان کو کچھ اور وسعتیں بخشیں۔

(14) شعر و نقد فراق- نئے عہد کی تخلیقیت کے آئینہ خانے میں: نظام صدیقی
نظام صدیقی نے فراق کو ہند ایرانی ثقافت کا ایک اہم رول ماڈل مانا ہے اور صحیح معنوں میں فراق مغرب و مشرق کے سنگم کی حیثیت رکھتے تھے اس بات کا بھی انھوں نے اعتراف کیا ہے۔

(15) اردو تنقید کو فراق کی دین: قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
قاضی صاحب نے اس مضمون میں فراق کو ایک نقاد کی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی ہے چونکہ فراق ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید سے بھی ان کا واسطہ رہا ہے۔

(16) اردو تنقید کو فراق کی دین: آزاد گلاٹی
آزاد گلاٹی بھی اپنے مضمون کو فراق کی تنقیدی بصیرت کے ارد گرد ہی رکھ کر انھیں نقاد کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

(17) نقد فراق کی نارسائی (اقبال کے حوالے سے): عبدالحق
عبدالحق صاحب نے فراق کی شخصیت کو اقبال کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ فراق نے اقبال کی کون کون سی چیزوں کو اپنی زندگی اور کلام میں برتا ہے اسے واضح کیا ہے۔

(18) فراق اور اسلامی ادب: ڈاکٹر صادق
ڈاکٹر صادق کے بقول فراق کو اردو ادب میں جو ممتاز مقام ملا ہے اس کے علاوہ ان کی ایک اور حیثیت ہے وہ اسلامی ادب سے ہمنوائی بھی ہے۔ انھیں خصوصیات اور امتیازات کو صادق صاحب نے پیش کیا ہے۔

(19) فراق صاحب اور ایک افسانہ نگار: کشمیری لال ذاکر
کشمیری لال ذاکر نے اپنے اس مضمون میں فراق کو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے چونکہ فراق کی شخصیت شاعری کے طور پر زیادہ معروف ہے۔

(20) فراق اور اردو: امیش چندر دویدی شوق
امیش صاحب نے فراق کو ایک محب اردو کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ فراق نے اردو میں کھل کر لکھا جبکہ دیگر حضرات کے یہاں یہ بے باکی کم نظر آتی ہے۔

(21) فراق اور فروغ اردو زبان: چودھری ابن النصیر
اردو کے ساتھ ہمیشہ ہی حالات کچھ نہ کچھ ہوتے رہے ہیں۔ فراق کے زمانے میں بھی اردو کے ساتھ سوتیلا رویہ برتا گیا لیکن فراق نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور اس مخالفت کو اپنا فرض سمجھا۔

(22) فراق اور فروغ اردو زبان: اشفاق حسین
شاعر حساس دل ہوتا ہے۔ وہ زبان اور الفاظ کی خارجی شکل وصورت تک خود کو محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ وہ نئے نئے الفاظ اور اس کی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے برتتا ہے۔ انھیں نکات کی جانب اشفاق صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

■

Mr. Irshad Qamar
AB 452, First Floor, Amarpuri
Ram Nagar, Nabi Karim, Pahar Ganj
New Delhi - 110055

پرسنل کمپیوٹر کیا ہے؟
(What is a Personal Computer?)

کی-بورڈ (Keyboard)

پی سی کے جس حصے کے ذریعے ہم اس تک اپنی بات پہنچاتے ہیں، وہ وی ڈی یو کے ساتھ جڑا ہوا کی-بورڈ ہے۔ اس پر ہم اپنی انگلیوں سے الگ الگ بٹن یا کنجی (Key) دبا کر کوئی ہدایت یا ڈاٹا ٹائپ کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہم ٹائپ کرتے ہیں، اگر وہ دکھانے لائق ہوتا ہے، تو ٹائپ کرتے وقت ہی وہ اسکرین پر دکھائی بھی دیتا ہے۔ ہدایت یا ڈاٹا پوری طرح ٹائپ ہوجانے پر ایک خاص بٹن، رٹرن (Return) یا انٹر (Enter) کو دبا کر وہ ہدایت یا ڈاٹا پی سی میں بھی دیا جاتا ہے۔ کی-بورڈ کی مدد سے ہی ہم کمپیوٹر کی تمام طاقتوں اور صلاحیتوں (Capacity) کا استعمال کرسکتے ہیں۔ اس لیے کی-بورڈ جتنا آسان اور سہل ہوگا، کمپیوٹر بھی اتنا ہی زیادہ صارف دوست (User-friendly) ہوگا۔

یوں تو کی-بورڈ الگ الگ طرح کے پی سی اور ان کو بنانے والی کمپنی کے مطابق کئی طرح کے ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر دو قسم کے کی-بورڈ دستیاب ہیں۔ 101 کنجیوں والا یا پھر 104 کنجیوں والا۔ تصویر C-5.5 میں پی سی کا ایک اسٹینڈرڈ کی-بورڈ دکھایا گیا ہے۔ اس میں 104 بٹن یا کنجیاں ہیں۔ ان بٹنوں کو کام کے مطابق کئی گروہوں (Groups) میں بانٹا گیا ہے۔ ہر گروہ اور عام طور پر استعمال کیے جانے والے بٹنوں کا تعارف آگے پیش کیا گیا ہے:

(a) بنیادی کی-بورڈ (Main Keyboard): یہ ایک عام انگریزی ٹائپ رائٹر کے کی-بورڈ جیسا ہوتا ہے۔ اس میں رومن رسم الخط (انگریزی) کے سبھی حروف، عدد، کچھ خاص کریکٹر (Special Character)، رموز و اوقاف (Punctuation Marks) اور دو شفٹ کنجیاں (Shift Keys) ہوتی ہیں۔ بنیادی کی-بورڈ لگ بھگ سبھی کی-بورڈوں میں ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

(b) فنکشن کنجیاں (Function keys): ان بٹنوں پر F1 سے F12 تک نام لکھے ہوتے ہیں۔ کسی کسی بورڈ میں 20 فنکشن کنجیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بٹن حقیقت میں ایک پورے حکم (Command) کے برابر ہیں۔ ان سب میں ایک ایک ایسا حکم بھر دیا جاتا ہے، جس کی ہمیں بار بار ضرورت پڑتی ہے۔ کئی کی-بورڈوں میں ہم اپنی مرضی سے کوئی بھی حکم بھر سکتے ہیں اور جب چاہیں بدل بھی سکتے ہیں۔ ان کا استعمال عموماً کمپیوٹر پر اس وقت چل رہے پروگرام پر بھی منحصر کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں الگ الگ پروگراموں کے لیے ان کا الگ الگ استعمال ہوتا ہے۔

(c) نمبری کی-پیڈ (Numeric Keypad): کی-بورڈ کے دائیں حصے میں کیلکو لیٹر جیسا ایک کنجی گروپ ہوتا ہے۔ اس میں 0 سے 9 تک سبھی عدد، نقطہ اعشاریہ، جمع (+)، ضرب (-)، تارا (*) اور سلیش (/) کے بٹن بھی ہوتے ہیں۔ کچھ بٹنوں پر عدد کے نیچے کچھ اور بھی چھپا ہوتا ہے جیسے 1 والے بٹن پر 'END' 2 والے بٹن پر نیچے کی طرف جانے والے تیر کا نشان (↓) وغیرہ۔

اس گروپ کے بٹنوں کے عددی ڈاٹا بھرنے کا کام کیا جاتا ہے۔ ہم کمپیوٹر میں جو ڈاٹا بھرتے ہیں، اُن میں 90 فیصد سے زیادہ ڈاٹا عددی نمبری ہوتا ہے۔ لہٰذا، عددی ڈاٹا کو جلدی اور اچھی طرح ٹائپ کرنے کے لیے الگ کی-پیڈ بنایا گیا ہے۔ ویسے ان کا اثر ٹھیک وہی ہے، جو بنیادی کی-بورڈ میں لگی کنجیوں کا ہے۔

اس کی-پیڈ سے عدد ٹائپ کرنے کے لیے ہمیں نمبر لاک (NUMLOCK) نامی بٹن کو دبانا پڑتا ہے۔ جب یہ بٹن دبا رہتا ہے، یعنی آن (On) ہوتا ہے، تو اس کی-پیڈ کی کنجیوں سے ان پر اوپر لکھے عدد یا نشان ٹائپ ہوتے ہیں اور اگر بٹن اٹھا ہوا، یعنی آف (Off) ہو، تو ان بٹنوں پر نیچے لکھے ہوئے کام ہوتے ہیں۔ کسی کسی کی-بورڈ میں NUMLOCK کے آن یا آف ہونے کا پتہ اس میں لگی ایک لائٹ سے چلتا ہے۔

(d) کرسر کنٹرول کنجیاں (Cursor Control Keys): ان بٹنوں پر تیر کے نشان بنے رہتے ہیں، جن سے کرسر کو دائیں (→) بائیں (←) اوپر (↑) اور نیچے (↓) لے جایا جاسکتا ہے۔ ان بٹنوں کو ایک بار دبانے سے کرسر ان پر چھپی تیر کی سمت میں ایک قدم دائیں یا بائیں یا پھر ایک لائن اوپر یا نیچے چلا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ کرسر کو کنٹرول کرنے کی چار کنجیاں اور ہوتی ہیں، جن پر Home، End، Pg Up اور Pg Dn لکھا رہتا ہے۔ ان میں سے ہوم (Home) بٹن دبانے سے کرسر اسکرین کے اوپری بائیں کونے پر یا کسی دستاویز (یا فائل) کے شروع میں چلا جاتا ہے۔

اسی طرح اینڈ (End) کنجی دبانے سے کرسر اسکرین کے نچلے دائیں کونے پر یا کسی دستاویز (Document) کے اخیر میں پہنچ جاتا ہے۔ پیج اَپ (Pg UP) کنجی کسی دستاویز یا فائل کے پچھلے صفحے پر کرسر کو لے جانے کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح پیج ڈاؤن (PG Dn) کنجی کرسر کو دستاویز کے اگلے صفحے پر لے جاتی ہے۔ اگر فائل یا دستاویز کا کوئی پچھلا یا اگلا صفحہ نہیں ہے، تو پیج اَپ اور پیج ڈاؤن بٹنوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(e) کیپٹل لاک کنجی (CAPS Lock Key): جب بنیادی کی-بورڈ پر ہم کسی انگریزی حرف والے بٹن کو دباتے ہیں، تو زیادہ تر کی-بورڈوں میں وہ حرف چھاپے کے چھوٹے حروف (Small letters) میں ٹائپ ہوتا ہے، لیکن اگر کیپٹل لاک کنجی کو ایک بار دبا دیا جائے، تو سبھی حروف چھاپے کے بڑے حروف (Capital Letters) میں ٹائپ ہوں گے۔ اس کنجی کو دوبارہ دبا

دینے پر یہ اثر ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی حرف پھر سے چھاپے کے چھوٹے حروف میں آنے لگتے ہیں۔ دراصل، اس بٹن کا اثر حروف والی کنجیوں پر ان کے ساتھ شفٹ کنجی کو دبائے رکھنے کے برابر ہوتا ہے، لیکن دوسرے بٹنوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(f) شفٹ کنجیاں (SHIFT Keys): ٹائپ رائٹر کی طرح اگر کسی شفٹ کنجی کو دبائے رکھ کر کسی حرف کو ٹائپ کیا جائے، تو وہ چھاپے کے بڑے حروف میں آتا ہے، لیکن اگر کیپٹل لاک کنجی پہلے سے دبی ہوئی ہے، تو شفٹ کنجی کا اثر الٹا ہو جاتا ہے، یعنی اس کنجی کے ساتھ کوئی حرف ٹائپ کرنے پر چھاپے کے چھوٹے حروف آتے ہیں۔

جن بٹنوں پر دو نشان لکھے ہوتے ہیں، انھیں شفٹ کے بغیر دبانے پر نیچے لکھا نشان آتا ہے اور شفٹ کے ساتھ دبانے پر اوپر والا نشان ٹائپ ہوتا ہے۔ ایسے بٹنوں پر کیپٹل لاک کنجی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(g) ٹیب کنجی (TAB Key): اس بٹن کی مدد سے ہم کرسر کو کسی لائن میں پہلے سے طے کیے ہوئے مقامات تک جمپ کرا کر لے جا سکتے ہیں۔ اس کی مدد سے ہم پیراگراف، کالم وغیرہ بنا سکتے ہیں۔ کچھ سوفٹ ویئر پیکجوں میں اس کنجی کا استعمال کسی مینو میں پسند چننے یا کوئی مدد لینے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ ورڈ پروسیسر میں اس کا استعمال الفاظ کے درمیان زیادہ اسپیس (Space) دینے میں کیا جاتا ہے۔

(h) بیک اسپیس کنجی (BACKSPACE Key): اس بٹن کو دبانے سے کرسر کے ٹھیک بائیں جانب والا نشان غائب ہو جاتا ہے اور کرسر ایک قدم پیچھے کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کنجی کا استعمال ٹائپنگ میں اسپیلنگ وغیرہ کی غلطیاں ہو جانے پر انھیں ٹھیک کرنے میں کیا جاتا ہے۔

(i) ریٹرن یا انٹر کنجی (RETURN or ENTER Key): یہ کنجی اسکرین پر تیار کیے گئے ڈاٹا یا حکم کو کمپیوٹر میں بھیجنے کا کام کرتی ہے۔ ریٹرن یا انٹر دبانے سے کمپیوٹر کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم نے ٹائپنگ کا کام پورا کر لیا ہے اور اب کمپیوٹر اپنا کام شروع کر سکتا ہے، یعنی ہماری ہدایت پر عمل کر سکتا ہے۔ ورڈ پروسیسنگ پروگرام میں ریٹرن یا انٹر دبانے سے نئی لائن یا پیراگراف شروع ہو جاتا ہے۔

(j) ڈلیٹ کنجی (DELETE Key): اس بٹن کو دبانے سے کرسر والا نشان غائب ہو جاتا ہے۔ اس کا استعمال ٹائپنگ کی غلطیوں کو ٹھیک کرنے میں کیا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔

(k) پرنٹ اسکرین کنجی (Print Screen Key) اس بٹن کو دبانے پر اس وقت اسکرین پر جو بھی ڈاٹا یا اطلاع ہو، وہ پی سی کے ساتھ جڑے پرنٹر پر ٹھیک اسی طرح چھپ جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ کنجی شفٹ کے ساتھ دبائی جاتی ہے۔ اگر پی سی میں پرنٹر نہیں لگا ہے، تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں کام کرتے وقت یہ کنجی دبانے سے اسکرین پر نظر آنے والی تمام چیزیں ایک جگہ پر اسٹور ہو جاتی ہیں، جسے کلپ بورڈ کہا جاتا ہے۔ آپ کلپ بورڈ کی چیزوں کو کسی فائل کی شکل میں بھی محفوظ کر سکتے ہیں اور پرنٹ کر سکتے ہیں۔

(l) پاز/بریک بٹن (Pause/Break Key): اس کنجی کو دبانے پر اسکرین جہاں ہے، وہیں رک جاتی ہے۔ اگر اسکرین پر کوئی اطلاع لمبی ہو اور وہ اتنی جلدی جلدی آ رہی ہو کہ آپ اچھی طرح دیکھ نہ پائیں، تو اس بٹن کو دباتے ہی معلومات کا آنا رک جاتا ہے، تاکہ آپ اسے پڑھ سکیں۔ کوئی دوسری کنجی دبا دینے پر وہ اطلاع پھر سے آنے لگتی ہے۔ اگر آپ کے کی-بورڈ میں پاز بٹن نہیں ہے، تو آپ کنٹرول کنجی کے ساتھ 'S' دبا کر بھی یہی کام کر سکتے ہیں۔

(m) اسکرول لاک کنجی (Scroll Lock Key): یہ کنجی پاز بٹن جیسا ہی کام کرتی ہے، لیکن اطلاع آنا پھر سے شروع کرنے کے لیے آپ کو کسی اور بٹن کی بجائے وہی بٹن پھر سے دبانا پڑے گا۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ اسکرین پر دکھائی گئی اطلاع کو آپ اپنے پرنٹر پر چھپوا سکیں گے۔ دوسرا بٹن دبانے سے وہ غائب نہ ہو جائے۔

(n) اسکیپ (Esc)، کنٹرول (Ctrl) اور آلٹ (Alt) کنجیاں: یہ بٹن کچھ خاص کاموں کے لیے دوسرے بٹنوں کے ساتھ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کنٹرول کے ساتھ "C" دبانے پر اُس وقت چل رہا ہمارا پروگرام وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ ان کنجیوں کا کام اور استعمال الگ الگ پی سی کے کی-بورڈوں میں الگ الگ ہوتا ہے۔ اس کی پوری اور صحیح جانکاری کے لیے پی سی کا مینوئل دیکھنا چاہیے۔ ان کا استعمال سوفٹ ویئر کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

(o) ری سیٹ (Reset): زیادہ تر کمپیوٹر میں اسکیپ (Esc)، کنٹرول (Ctrl) اور آلٹ (Alt) یہ تین بٹن ایک ساتھ دبا دینے پر پی سی میں چل رہے سبھی کام ختم ہو جاتے ہیں اور پی سی اپنی شروع کی حالت میں پہنچ جاتا ہے، جیسے آپ نے اسی وقت شروع کیا ہو۔ کبھی کبھی کمپیوٹر رک سا گیا معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں اس وقت کوئی ایسا پروگرام چل رہا ہوتا ہے، جو ختم نہیں ہوتا۔ یہ پروگرام کی غلطی سے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ری سیٹ کرنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ کمپیوٹر کا سوئچ بند کر کے پھر سے چلانا پڑتا ہے۔

104 کنجیوں والے کی-بورڈ میں اوپر بتائی گئی کنجیوں کے علاوہ ونڈوز میں کام آنے والی تین اور کنجیاں ہوتی ہیں، حالانکہ ان کا کوئی خاص استعمال نہیں ہوتا۔ آج

کل ایسے کی-بورڈ بھی دستیاب ہیں، جن پر انٹرنیٹ کے کام سے متعلق کئی دیگر بٹن لگے ہوتے ہیں۔

پرنٹر (Printer)

کمپیوٹر کے ذریعے ہمارے پروگرام پر عمل کرنے سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں یا رپورٹ تیار ہوتی ہے، انھیں اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کے لیے ہم ان نتائج یا رپورٹ کو کاغذ پر چھپوانا چاہتے ہیں۔ یہ کام پرنٹر کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ پرنٹر آؤٹ پٹ کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں پرنٹر وہ آلہ ہے، جس کے ذریعے ہم ٹیکسٹ اور گرافکس کو کاغذ پر چھاپتے ہیں۔ بازار میں دستیاب پرنٹرس کو ہم دو گروپ میں بانٹ سکتے ہیں۔

امپیکٹ پرنٹر (Impact Printer) اور نان امپیکٹ پرنٹر (Non Impact Printer): جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، امپیکٹ پرنٹر کاغذ پر سیدھے اثر ڈالتا ہے، یعنی پرنٹ ہیڈ پر لگے ہوئے چھوٹے تار سیاہی والی ربن کو چھوتے ہوئے کاغذ پر ٹیکسٹ یا گرافکس کو چھاپتے ہیں، جب کہ نان امپیکٹ پرنٹر کاغذ کو چھوئے بغیر اس پر ٹیکسٹ اور گرافکس کو چھاپتے ہیں۔ ڈاٹ میٹرکس پرنٹر امپیکٹ پرنٹر کے زمرے میں آتے ہیں، جبکہ انک جیٹ اور لیزر پرنٹرس، نان امپیکٹ پرنٹر ہیں۔

ڈاٹ میٹرکس (Dot-Matrix) پرنٹر کو کریکٹر پرنٹر بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ایک وقت میں صرف ایک ہی کریکٹر کو چھاپتا ہے۔ ایک کریکٹر چھاپنے کے بعد دائیں ہٹ کر

تصویر C-5.6: ڈاٹ میٹرکس پرنٹر

دوسرا کریکٹر چھاپتا ہے۔ اس طرح ایک ایک کر کے پوری لائن چھاپ دیتا ہے۔ یہ ایک سیکنڈ میں 200 سے 450 کریکٹر تک چھاپ دیتے ہیں۔ ڈاٹ میٹرکس پرنٹر کی چھپائی اچھی نہیں ہوتی، لیکن قیمت کم ہونے کے سبب 1970 اور 80 کی دہائی میں یہ کافی مقبول تھے۔ تصویر C-5.6 میں ڈاٹ میٹرکس پرنٹر کو دکھایا گیا ہے۔ بعد کے دنوں میں انک جیٹ پرنٹر نے اس کی جگہ لے لی۔

ڈاٹ میٹرکس پرنٹر میں چھاپنے کا طریقہ بہت آسان ہوتا ہے۔ اس کے چھاپنے والے چھوٹے سے

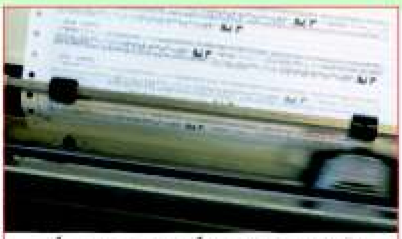

تصویر C-5.7: ڈاٹ میٹرکس پرنٹر کے ذریعہ چھپائی

حصہ، پرنٹنگ ہیڈ (Printing Head) میں ایک سیدھی لائن میں 9 پن لگی ہوتی ہے، جیسا کہ تصویر C-5.7 میں دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی پن آگے بڑھ کر ایک نقطہ (Dot) چھاپ سکتی ہے۔ یہ پرنٹنگ ہیڈ پرنٹر کے رولر کے اوپر بائیں جانب سے دائیں جانب اور دائیں جانب سے بائیں جانب چلتا ہے۔ رولر اور پرنٹر ہیڈ کے درمیان میں بالترتیب کاغذ اور ربن ہوتے ہیں۔ جب اسے کسی کریکٹر کو چھاپنا ہوتا ہے، تو یہ پن ٹھیک اسی کریکٹر کے مطابق آگے پیچھے ہو کر ربن سے کاغذ پر دباؤ ڈال کر چھپائی کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر مان لیجیے ہمیں انگریزی کا بڑا 'A' چھاپنا ہے۔ اس کا سائز تصویر C-5.7 میں دکھائے گئے میٹرکس کے مطابق ہوگا۔ پہلے پن نمبر 3 سے 9 تک کاغذ پر نقطے چھاپ دیں گی اور پرنٹنگ ہیڈ ایک نقطہ آگے کھسک جائے گا۔ تب پن نمبر 2 اور 5 آگے بڑھ کر نقطے چھاپیں گی اور پرنٹنگ ہیڈ پھر ایک نقطہ آگے بڑھ جائے گا۔ اسی طرح ایک ایک نقطہ آگے بڑھتے ہوئے پورا حرف چھاپ دیا جائے گا۔

کم قیمت اور چھوٹا ہونے کی وجہ سے بعد کے دنوں میں انک جیٹ پرنٹر (Inkjet Printer) کا استعمال گھر اور کاروبار کے لیے ہونے لگا۔ بعض لوگ اب بھی گھروں پر انک جیٹ پرنٹرس کا استعمال چھوٹے موٹے کاموں کے لیے کرتے ہیں۔ ڈاٹ میٹرکس پرنٹر میں جہاں چھپائی کے لیے کالی ربن کا استعمال کیا جاتا تھا، وہیں انک جیٹ پرنٹر میں سیاہی بھرے ہوئے ڈبے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاٹ میٹرکس پرنٹرس میں صرف کالے رنگ کا استعمال ہو پاتا تھا، جبکہ انک جیٹ پرنٹر سے کالے رنگ کے ساتھ ساتھ رنگین چھپائی کا بھی کام

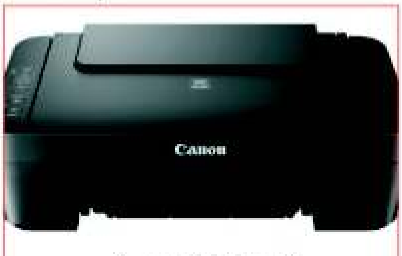

تصویر C-5.8: انک جیٹ پرنٹر

ہونے لگا۔ تصویر C-5.8 میں انک جیٹ پرنٹر کو دکھایا گیا ہے۔ اس پرنٹر میں کاغذ پر چھڑکاؤ کے ذریعے چھوٹے چھوٹے نقطے ڈال کر چھپائی کی جاتی ہے۔ ان کے چھاپنے کی رفتار 1 سے 4 صفحہ فی منٹ ہوتی ہے۔ ان کی قیمت ڈاٹ میٹرکس اور لیزر دونوں قسم کے پرنٹر سے کم ہوتی ہے، لیکن چھپائی کا خرچ ڈاٹ میٹرکس سے زیادہ اور لیزر پرنٹر سے کم ہوتا ہے۔ اس میں A4 سائز کے کاغذ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد لیزر پرنٹر (Laser Printer) کا دور شروع ہوا، جو اس وقت سب سے زیادہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ تیز رفتار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بھی ان دونوں پرنٹرس کے مقابلے زیادہ ہے، جن کا ذکر ہم نے پہلے کیا۔ اسی لیے ہر کوئی اس کا استعمال نہیں

تصویر C-5.9: لیزر پرنٹر

کر سکتا۔ یہ ہر طرح کی چھپائی تمام سائز کے حروف میں کر سکتا ہے اور تصویریں بھی اتنی صاف چھاپ سکتا ہے، جیسی کہ کتابوں میں ہوتی ہیں۔ یہ رفتار میں بہت تیز اور آواز کے بغیر کام کرتے ہیں۔ تصویر C-5.9 میں لیزر پرنٹر کو دکھایا گیا ہے۔ ان کی چھپائی کی رفتار 4 سے 20 صفحات فی منٹ تک ہوتی ہے۔ ان میں پیپر لگانا پوری طرح آٹومیٹک ہوتا ہے اور ربن وغیرہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس میں روشنائی کی جگہ ٹونر (کالے یا رنگین پاؤڈر) کا استعمال ہوتا ہے۔

کسی پی سی کے ساتھ عام طور پر ایک ہی پرنٹر جوڑا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں ایک ہی پرنٹر پورٹ ہوتا ہے۔ ایک سے زیادہ پرنٹر ہونے پر بھی ایک بار میں ایک ہی پرنٹر جوڑا جا سکتا ہے۔ ایم ایس-ڈاس آپریٹنگ سسٹم میں آپ سیدھے ہی چھپائی کر سکتے ہیں، لیکن ونڈوز آپریٹنگ سسٹم میں پرنٹر کو استعمال کرنے سے پہلے انسٹال (Install) کرنا پڑتا ہے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/ آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ

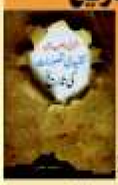

مصنف: محمد حسن

صفحات: 373، قیمت: 168، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: چودھری ابن النصیر، 9 کانپور روڈ، نیو فرینڈز کالونی، الہ آباد 211001

محمد حسن کو اپنے زمانے کی اردو کی ترقی پسند تنقید کا سرخیل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو ادب میں اتنی سلجھی ہوئی، متوازن اور متناسب شخصیت خال خال دیکھنے کو ملی ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف رہ چکے ہیں۔ تنقید کے علاوہ تخلیقی ادب سے بھی ان کا گہرا رشتہ تھا۔ محمد حسن کا تنقیدی شعور اپنے معاصرین میں ان معنوں میں ٹھوس اور پختہ تھا کہ انھوں نے اردو تنقید میں ایک نئی روایت کو قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

ان کی کتاب مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ پہلی بار 1990 میں شائع ہوکر ادبی حلقوں میں قبولیت حاصل کر چکی تھی۔ اب اس کی دوبارہ اشاعت سے مزید وسیع حلقے میں اس کی رسائی ممکن ہو سکے گی۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے میں باب قائم کیے ہیں جن کی تعداد اکیس بنتی ہے۔ مذکورہ کتاب محمد حسن کی محققانہ کاوش اور تنقیدی ادراک کا ایک اعلی نمونہ ہے۔ تنقید کے تین شعبے (نظریاتی تنقید، عملی تنقید، فنی تنقید) ہمیشہ سے تنقید میں کام کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں نظریاتی تنقید کے حوالے سے مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب تنقیدی ادراک کی ابتدا میں پروفیسر برنارڈ بوسان کے حوالے سے یہ صحیح لکھا ہے کہ ہومر کی شہرۂ آفاق تصنیف 'ایلیڈ' کے دو باب کے تجزیاتی مطالعے میں تنقیدی تصور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مشرق میں تنقیدی شعور کا آغاز چاروں ویدوں میں بلا واسطہ اور براہ راست دکھائی دیتا ہے۔ افلاطون کے یہاں تو چوتھی صدی قبل مسیح کی ایک تصنیف میں تنقیدی شعور کا بھرپور اظہار ملتا ہے اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہی رہا۔ مغربی تنقید میں افلاطون کا نظریہ زیادہ زیر بحث رہا ہے کیوں کہ اس نے فن اور شاعری کو بڑے سنگ دلانہ انداز میں موضوع تنقید بنایا ہے۔ 'افلاطون کے تنقیدی نظریے' کے باب میں محمد حسن نے بڑی تفصیل سے ان کے تصورات سے بحث کی ہے۔ اس طرح ارسطو کی بوطیقا کو مغربی تنقید کا ایک رہنما اصول مانا گیا ہے جس میں فن شاعری کے حوالے سے ارسطو نے بڑی کارآمد باتیں کی ہیں۔ محمد حسن نے یونان کے بعد تنقید کے سفر کا اگلا پڑاؤ روم کو بنایا ہے۔ حالاں کہ یونان کے علم و دانش کو روم کا تنقیدی رنگ نہ ملا۔ البتہ دو چار نام یہاں مل جاتے ہیں۔ اس طرح آگے بڑھتے ہوئے چین کے تنقیدی نظریہ پر بھی ان کی نظر پڑی اور تفصیل سے چینی تنقیدی نظریے کا ذکر کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ چینی ادب کی روایت زندہ روایات میں سب سے پرانی ہے لیکن یہ روایت جتنی قدیم اور مسلسل ہے اسی قدر دوسری روایات سے مختلف بھی ہے۔ موجودہ عہد میں تو چینی ادب نظر انداز کرنے کے لائق ہرگز نہیں۔ تو ظاہر ہے کہ تنقیدی شعور بھی ان کے یہاں یقیناً پختہ ہوگا۔ جاپان میں تنقید کے فروغ کے حوالے سے محمد حسن نے وہاں کے نظریات و تصورات کو وہاں کی تخلیقات کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جاپان کے بعد انھوں نے ہندوستانی شعریات میں تنقید کی ابتدا سنسکرت کی بھرت کے ناٹیہ شاستر کو بتائی ہے جس کے سنہ تصنیف پر اختلاف ہے۔ بعض پہلی صدی قبل مسیح اور بعض کے نزدیک پہلی صدی بعد مسیح یعنی تین سو عیسوی اس کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ سنسکرت شعریات میں تصورات کی بحث دراصل ڈرامے سے زیادہ کی جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ باب زیادہ تفصیل کا متقاضی تھا۔ عرب کے تنقیدی نظریات کے باب میں عربی تنقید کے اس بیان کو اہمیت دی ہے کہ مبالغہ فن کی تخلیقی آزادی کا اعتراف ہے جس کے ذریعہ اس کا اختیار اور اس کی خودمختاری اظہار پاتی ہے۔ یہ نظریہ کہ مبالغہ حقیقت کی گرفت اور بیان واقعہ کی حد بندی سے نجات کا وسیلہ ہے اور اسی کے سہارے فن کار اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے، آج بھی عربوں کے نزدیک اہمیت کا حامل ہے۔ اس باب میں ظہور اسلام سے پہلے اور ظہور اسلام کے بعد کے تنقیدی نظریات کو ابن سینا اور دیگر مفکرین کے ساتھ ابن رشد اور ابن خلدون کے نظریات کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ محمد حسن نے عرب و ایران کی طرف آتے ہوئے وہاں کے تنقیدی نظریات پر بھی اچھی خاصی بحث کی ہے اور تصوف کے اقداری نظام کے حوالے سے ایران کے تنقیدی سرمایے پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

پانچویں حصے میں وہ مغربی یوروپ میں تنقیدی نظریات کی تشکیل اور اس کے فروغ کی گفتگو بڑے ہی سلیس انداز میں کرتے ہیں اور اس ضمن میں تخیل کو تخلیقی عمل میں بہ طور خاص شامل گفتگو کرتے ہیں اور فن کی سماجی معنویت و افادیت کو کولرج اور دوسرے نقادوں کی روشنی میں جانچتے ہیں۔ ادب کی اہمیت تاریخ اور تہذیب کے حوالے آرنلڈ کے تصورات کے تناظر میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ فن کی گفتگو کرتے ہوئے عموماً ادب برائے ادب یا ادب برائے فن کی اصطلاح کا ذکر اردو میں 1960 کے آس پاس بڑے زور و شور سے ہوا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ادب برائے ادب کی اصطلاح 1833 میں ہی ولیم وسمارٹ اور بروکس کے ذریعہ آچکی تھی جس کے مرکزی موضوعات میں فن کی خودمختاری، فن کا فطرت یا حقیقت سے رشتہ فن کی افادیت اور اس کی معنویت بہ طور خاص تھے۔ اس موضوع پر لکھتے ہوئے محمد حسن نے اپنی بے پناہ علمی ذہانت کا ثبوت دیا ہے کیوں کہ انھوں نے ادب اور تہذیب کے رشتے کی ایک جہت نفسیات سے جوڑ کر فرائڈ اور یونگ کی مثالیں پیش کی ہیں۔ تنقیدی تصورات کے ضمن میں انھوں نے تنقید کے طریقہ کار میں تقابل اور موازنہ کو تنقید کا بنیادی طریقہ کار سمجھا ہے۔ اس ضمن میں ونکل مان کے نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے۔

روس میں تنقیدی شعور کے ارتقا کے تعلق سے بھی انھوں نے ایک باب قائم کیا ہے جس میں روس کے تنقیدی میلانات پر گفتگو کرتے ہوئے روس کو ادبی تنقید میں مارکسی تنقید کا اہم کردار بتایا ہے۔ اس طرح امریکہ میں نئی تنقید کا باب ان معنوں میں اہم ہے کہ بیسویں صدی میں اسپن گارن کی کتاب نیو کریٹیسزم (New Criticism) پر بحث

کرتے ہوئے امریکہ میں تنقید کے ایک نئے دبستان کا ذکر کیا ہے، جس میں کئی ناقدوں کے ساتھ ٹی ایس ایلیٹ کا بہ طور خاص ذکر ہے اور اس بات کا اعتراف ہے کہ 'نئی تنقید' فن کو فطرت کے علم و عرفان کا واحد مستند اور معتبر وسیلہ سمجھتی ہے اور فن کو نقل سمجھنے کے بجائے حسیات کے ذریعہ جمالیاتی عرفان فطرت کا ذریعہ جانتی ہے۔ یہ نئی تنقید ہی ہے جس نے متن کے گہرے باطنی مطالعے پر زور دیا ہے اور ہر فن پارے کو مکمل اکائی سمجھ کر تخلیق کار کی شخصیت، سوانح اور عصری سیاق و سباق سے الگ کرکے تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی وکالت کی ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے تشکیلیت اور ساختیت سے بھی بحث کی ہے۔ آخری باب میں انھوں نے تنقید کے الگ الگ طریقہ کار یا رجحانات سے بحث کی ہے جس میں ہیئتی تنقید، مارکسی تنقید اور تقابلی تنقید کے ساتھ ادبی سماجیات کے موضوع پر اپنے موقف کو مختلف مشرقی و مغربی نظریات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

مشرق و مغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ لکھتے ہوئے محمد حسن نے زیادہ جانب داری سے کام نہیں لیا ہے بلکہ تصورات و نظریات کے حسن و قبح پر بڑے مدلل انداز سے بحث کی ہے اور سوالات پیدا کیے ہیں۔ اردو تنقید میں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے تاکہ تاریخ سے واقفیت ممکن ہو سکے۔ ان کا یہ معلومات افزا کام ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے اس اہم کتاب کو دوبارہ شائع کیا اور 373 صفحے کی اس کتاب کی قیمت اتنی کم رکھی ہے کہ ادب کا ہر سنجیدہ قاری اسے خرید سکتا ہے۔

پنجاب میں انقلابی وطن پرستی کی تحریک

مصنف: کملیش موہن، مترجم: ڈاکٹر ہمت سنگھ سنہا

صفحات: 497، قیمت: 206 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ثاقب فریدی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر کملیش موہن کی تصنیف Millitant Nationalism in the Punjab ہے جسے ڈاکٹر ہمت سنگھ سنہا نے 'پنجاب میں انقلابی وطن پرستی کی تحریک' کے عنوان سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے 2016 میں ہوئی ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے تعلق سے صوبۂ پنجاب نے اہم رول ادا کیا ہے۔ تحریک آزادی ہند میں جہاں بہار و بنگال اور دیگر صوبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہیں پنجاب نے بھی اس تحریک میں حصہ لیا۔ اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور فرنگیوں کو منھ توڑ جواب دیا۔ اس تعلق سے بھگت سنگھ کا نام آج بھی زبان زد ہے اور اس ضمن میں پنجاب کی وطن پرست تنظیموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہار اور بنگال میں تو تحریک آزادی ہند کے موضوع پر تحقیق ہوئی لیکن پنجاب میں تحریک آزادی کے تعلق سے تشفی بخش تحقیق نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر کملیش موہن نے اپنے مقدمہ میں اس کی تین وجوہات بیان کی ہیں۔

اول تو اس موضوع کے تعلق سے جو کچھ مواد ہے اس پر چند افراد یا کچھ خاندانوں یا اداروں کی اجارہ داری ہے۔ دوسرے یہ کہ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں پنجاب سرکار نے ان دستاویزوں کی اشاعت پر پابندی لگا دی تھی۔ تیسری بات یہ ہے کہ 1947 میں تقسیم پنجاب کی وجہ سے یہ مواد بد انتظامی کا شکار ہو گیا۔ ان تین وجوہات کی بنا پر محققین کو اس موضوع کے تئیں غیر معمولی دشواری پیش آئی۔ یہی وجہ رہی کہ پنجاب میں تحریک آزادی کے تعلق سے اب تک کوئی خاطر خواہ کام سامنے نہ آ سکا۔ ڈاکٹر کملیش موہن پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ سے منسلک ہیں۔ اس موضوع پر ان کی یہ تصنیف قابل قدر ہے۔ انھوں نے بالتفصیل پنجاب میں انقلابی وطن پرستی کی تحریک کے موضوع پر گفتگو کی ہے۔ 13 اپریل 1919 میں جلیاں والا باغ کا حادثہ پیش آیا تھا جس نے تمام ملک میں فرنگیوں کے تئیں بغاوت کا بگل بجا دیا تھا۔ تمام ہندوستان سلگ رہا تھا۔ ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ امرتسر پنجاب جہاں یہ حادثہ رونما ہوا تھا تحریک آزادی سے بیگانہ رہتا۔ اس نے بہت شدت کے ساتھ اس جانکاہ حادثے کو محسوس کیا۔ تمام ملک میں کسی ایک تنظیم نے علم بغاوت بلند نہیں کیا بلکہ ہر صوبے میں مختلف تنظیمیں اپنی اپنی سطح پر مجاہدانہ کردار ادا کر رہی تھیں۔ صوبہ پنجاب میں بھی کئی تنظیمیں کارفرما تھیں جنھوں نے تحریک آزادی میں غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ کملیش موہن نے ان مجاہدانہ وطن پرست تنظیموں کی تین حصوں میں درجہ بندی کی ہے۔ اعتدال پسند تنظیم، انتہا پسند تنظیم اور دہشت گرد تنظیم۔ تنظیموں کی اس درجہ بندی سے ہی پنجاب کی باغیانہ روش اور مجاہدانہ رویہ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے پنجاب کی تمام چھوٹی بڑی تنظیموں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ان میں امرتسر کی رولٹ تحریک، ببر اکالی تنظیم، کیرتی کسان تحریک اور بھگت سنگھ کی انقلابی تحریک خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ انقلابی تحریک کی نظریہ سازی میں روس کا انقلاب اہم ترین ثابت ہوا۔ اس تعلق سے مصنف کملیش موہن کا خیال ہے کہ سوویت یونین کے بارے میں مارکسی ادب نے بھگت سنگھ اور سکھ دیو وغیرہ کے افکار و خیالات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ یہ لوگ سوویت یونین کو ایک ایسی مملکت سمجھنے لگے جو ان کے تصور سے قریب ترین تھی۔ ان تنظیموں کے سوا مصنف نے بہت سی چھوٹی چھوٹی وطن پرست تنظیموں کے متعلق سیر حاصل گفتگو کی ہے جنھوں نے پنجاب میں اپنی سطح سے بڑھ کر مجاہدانہ کردار نبھایا۔ مصنف کملیش موہن نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ پنجاب میں مجاہدانہ قومی تحریک کی روش اور طریقہ کار بنگال، بہار یوپی اور دہلی کی مجاہدانہ قومی تحریکوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ اس طرح کہ پنجاب میں قومی مجاہدانہ تحریک کسی روحانی یا مذہبی اساس سے بالکل بیگانہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مارکس اور لینن کے نظریات رائج ہوئے اور پنجاب میں قومی مجاہدانہ تحریک کے نقطۂ نظر میں ارتکاز پیدا ہوا۔ بعد میں سوہن سنگھ جوش (جو کہ پنجاب کیرتی کسان پارٹی کی روح تھے) نے مذہب کے نقصانات کی طرف نہ صرف اشارہ کیا بلکہ مذہب کو فرنگیوں کے ہاتھ میں ایک مہلک آلہ قرار دیا جسے وہ قومی یکجہتی کو کچلنے میں استعمال کرتے تھے۔ اس طرح پنجاب نے دوسرے صوبوں کے بالمقابل اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کی۔

مصنف نے پنجاب میں مجاہدانہ قومی تحریک کے فروغ اور ارتقاء کو جلیاں والا باغ قتل عام سے تلاش کیا ہے۔ اس تحریک کے تمام نظریات واضح کیے ہیں۔ خصوصاً اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں جو بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کے وجوہات تلاش کرنے کی انتھک کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر ہمت سنگھ سنہا نے اس تصنیف کا بہت متوازن اور متناسب ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف ہے اور معنی کی ترسیل میں فاصلہ قائم نہیں ہوتا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق وتنقید

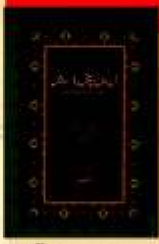

دکن دیس کی پیش رو غزلیں

تحقیق وتالیف: اسلم مرزا

صفحات: 284، قیمت: 275، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر حیدرآباد۔

مبصر: محمد حسین، E552/22، دوسری منزل، ذاکر نگر، نئی دہلی 25

کتاب کے عنوان 'دکن دیس کی پیش رو غزلیں' ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ایک تحقیقی کتاب ہے جس میں محقق نے دکن کے پیش روشعرا کی غزلیات کا انتخاب 'مشتے نمونہ از خروارے' کے بطور شائع کیا ہے۔ مولف اسلم مرزا نے سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک یعنی تین صدیوں کے 117 شعرا کو منتخب کیا۔ ان شعرا کی ایک دو غزلوں کے نمونوں کے ساتھ ان کے مختصر احوال وکوائف مستند حوالوں اور ماخذوں سے مستنبط کر کے شائع کیا ہے۔

اردو کی ابتدا کے حوالے سے ماہرین لسانیات نے مختلف تحقیقات پیش کی ہیں۔ مثلاً برج بھاشا، پنجابی، ہریانوی، کھڑی بولی وغیرہ میں اردو کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن میں مسعود حسین خان کی تحقیق کو زیادہ مقبولیت ملی ہے۔ اسی طرح دکن کو اردو کا مولد ثابت کرنے کی بھی زبردست تحقیق کی گئی۔ دکن کو اردو کا مولد قرار دینے والوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی وغیرہ اور دیگر ماہرین لسانیات ہیں۔ دکنی کو اردو کا اولین نقش قرار دینے والوں کو ایک سہولت یہ بھی حاصل ہے کہ منظوم اور نثری تخلیقات کے اولین نمونے بھی دکن کی سرزمین ہی سے ملتے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر اشفاق انجم نے اس موضوع پر ایک طویل بحث کی ہے جس میں شمالی ہندوستان کو اردو کا مولد قرار دینے والوں پر سخت اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کے ماہرین لسانیات کے اس قول کو سرے سے خارج کیا کہ خسرو کی تخلیقات ہندی، ہندوی، ہندوستانی سے ہوتی ہوئی اردو تک پہنچی ہے اور یہ اردو کے اولین نقوش ہیں۔ خسرو کی تخلیقات کو فاضل مقدمہ نگار 'خالص ہندی' قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے پروفیسر مسعود حسین کے قول (کھڑی بولی کے ادبی نمونے اردو کی شکل اور اردو رسم الخط میں سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اردو۔ اردو رسم الخط میں دکن میں لکھی جاتی تھی جبکہ شمالی ہند میں اس رسم الخط کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔'' ڈاکٹر صاحب کی یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن خسرو کی تخلیقات پر خالص ہندی ہونے کا لیبل چسپاں کرنا زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ امیر خسرو کی تخلیقات کی اردو رسم الخط میں عدم دستیابی کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں نکلتا کہ امیر خسرو کا کلام خالص ہندی میں ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال اسلم مرزا نے تین صدی کے منتخب شعرا کی غزلیات کے نمونوں سے اردو غزل اور دکنیات کے باب میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ اس انتخاب سے جہاں ہر عہد میں اردو کی لسانی ساخت سے واقفیت ہوتی ہے وہیں سرزمین دکن پر تین صدی کے عرصے میں وجود میں آنے والی اردو غزل کے رنگ ومزاج سے بھی آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ اسلم مرزا نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ ہر غزل میں وارد ہونے والے دکنی ہیئت کے الفاظ کی فرہنگ بھی شامل کی ہے۔ تا کہ دکن سے باہر کے محققین اور قارئین غزلوں کی دکنی لفظیات سے پریشان ہو کر سر کھجانے کے بجائے فرہنگ کی مدد سے معنی تک بآسانی رسائی حاصل کر سکیں۔ 117 شعرا کی فہرست میں چند ہی نام ایسے ہیں جن سے عام طور سے اردو کے طلبا واقف ہوں گے۔ مثلاً ابن نشاطی، غواصی، ملا وجہی، شاہ برہان الدین جانم، ہاشمی بیجاپوری، شاہ امین الدین اعلیٰ، نصرتی، محمد امین ایاغی، ملک خوشنود، ولی اورنگ آبادی، قاضی محمود بحری، سراج اورنگ آبادی، لطف النسا امتیاز۔ باقی تقریباً 100 شعرا کے نام سے عام طلبا تقریباً ناواقف ہوں گے۔ دوسری دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ معروف شعرا میں بھی جو نام ہیں ان کی شہرت عام طور سے کسی اور صنف کے باعث ہے، غزل گوئی کے حوالے سے کم ہی واقفیت ہوگی۔ مثلاً کمال خاں رستمی کو ہی لے لیجیے۔ عام طور سے انھیں مثنوی 'خاور نامہ' کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ لیکن اسلم مرزا کی اس تالیف سے پتہ چلا کہ وہ غزل بھی لکھتے تھے۔ تاہم ان کی صرف ایک غزل تک رسائی ہوئی جو کہ جمیل جالبی کی 'تاریخ ادب اردو' سے ماخوذ ہے۔ کتاب کی تدوین میں ایک کمی کھٹکتی ہے کہ اس کی ترتیب میں کسی بھی اصول کو بروئے کار نہیں لایا گیا۔ شعرا کی فہرست سازی اور ترتیب بندی نہ تو زمانی اعتبار سے کی گئی ہے نہ ہی حروف تہجی کے اعتبار سے۔ جبکہ کسی بھی ایک طریقے کو اختیار کر لینے سے کتاب کی اصول تحقیق کا حق بھی ادا ہو جاتا اور کتاب کو استنادی حیثیت ملنے کی راہیں بھی ہموار ہوتیں۔

بہر کیف کتاب چوں کہ تین صدیوں کے شعرا کی غزلیات کے نمونوں پر مشتمل ہے اس لیے تینوں صدی کی غزلوں سے ایک ایک شعر بطور نمونہ ضرور ملاحظہ کر لیں:

سولہویں صدی کے شاعر حسن شوقی کی غزل سے:

لئی دن ہوئے سریجن مج لک پتر نہ بھیجا
کچ رازکی نشانی مج یاد کر نہ بھیجا

سترہویں صدی کے شاعر شغلی بیجاپوری کی غزل سے:

پیا کے بچن کے گوہر، ہوئے ہے گنج کانوں بھر
سمائے ناسخن دیگر، تو گانا کیا بجانا کیا

اٹھارہویں صدی کی شاعرہ لطف النسا امتیاز کی غزل سے:

ہائے تصویریں مجھے کیوں اس قدر دکھلائیاں
دل پر اوس نقاش قدرت نے بلائیں لائیاں

کتاب میں کمپوزنگ کی خامیاں بہت ہی کم ہی البتہ صفحہ 86 اور 87 پر دکنی الفاظ پر نمبرنگ اور پھر ان کے معانی کی نمبرنگ میں ردو بدل ہو گیا ہے۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لسانیات، دکنیات اور اردو کے ابتدائی ادوار سے شناسائی کے لیے کتاب کا مطالعہ سودمند ہے۔ کتاب کا اردو دنیا میں خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔

راجستھان کے منتخب تحقیقی وتنقیدی مضامین (پہلی جلد)

مرتب: شاہد احمد جمالی

صفحات: 256، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت:

ناشر: راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور

مبصر: ڈاکٹر شبیر عالم، ستیہ وتی کالج، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'راجستھان کے منتخب تحقیقی وتنقیدی مضامین' راجستھان کی ادبی ولسانی صورت حال کا مرقع پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راجستھان میں اردو کی کیا صورت حال رہی ہے۔ کتاب کے مرتب شاہد احمد جمالی نے ایسے بہت سے مضامین کو باریک بینی کے ساتھ جمع کیا ہے جن کا تعلق راجستھان سے ہے۔ مضامین کی کثرت کی وجہ سے شاہد احمد جمالی نے عہد بعہد مختلف جلدوں میں کتاب کی ترتیب واشاعت کا فیصلہ کیا ہے، جس کی پہلی جلد سامنے ہے۔ یہ کتاب 1911 سے 1954 تک کی راجستھان کی اردو خدمات پر مبنی ہے۔ یوں تو کتاب سبھی کے لیے مفید ہے

مگر خاص طور سے ان لوگوں کے لیے اہم ذخیرے کی حیثیت رکھتی ہے جو راجستھان میں اردو کے حوالے سے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ مرتب شاہد احمد جمالی لکھتے ہیں:

''میری ناقص معلومات میں ابھی تک راجستھان میں اس طرح کا کوئی کام اس سے قبل نہیں ہوا ہے۔ منشا میرا وہی ہے جو میں شروع سے کہتا آ رہا ہوں کہ راجستھان کے مشاہیر کی تخلیقات کو اور ان کے ادبی کارناموں کو سامنے لانا ہی راقم کا نصب العین ہے۔''

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں متعدد اور متفرق مضامین پر مشتمل ترتیب شدہ اس کتاب کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ دیباچہ میں انھوں نے راجستھان کے مشاہیر قلمکاروں کو منظر عام پر لانے اور راجستھان میں اردو کی صورت حال کو سامنے لانے کے جس عزم کا اظہار کیا ہے، وہ قابل قدر و تحسین ہے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ اس کام کو خالصتاً کر رہے ہیں اور کسی ذاتی مفاد کی امید نہیں رکھتے بلکہ اس خدمت کے لیے خود ہی رقم بھی خرچ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''راجستھان کے مشاہیر کی خدمات پر راقم اپنی خوشی سے اپنا پیسہ خرچ کرتا ہے۔ خاکسار کبھی یہ تمنا نہیں کرتا کہ کوئی اکیڈمی یا انسٹی ٹیوٹ اس کی کتاب طبع کرائے۔'' لیکن حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک طرف دعویٰ مذکور اور دوسری طرف محض 256 صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت 500 روپے۔ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب ایسی معیاری نظر نہیں آتی کہ اس کی اتنی قیمت رکھی جاتی۔ صرف ٹائٹل پیج رنگین ہے، باقی پوری کتاب بلیک اینڈ وائٹ ہے۔ اردو قارئین بالعموم اتنی مہنگی کتاب کی خریداری کے متحمل نظر نہیں آتے۔ زیادہ لوگوں تک کتابوں کو پہنچانے کے لیے کتابوں کی مناسب قیمت رکھی جانی چاہیے۔ عہد حاضر میں کمپیوٹرائزڈ کتابت کے لیے فارمیٹنگ کی خاصی اہمیت ہوتی ہے، پیش نظر کتاب کی فارمیٹنگ معیاری نہیں ہے۔

کتاب میں شامل بعض مضامین بڑے معیاری اور تحقیقی ہیں۔ کچھ مضامین اوسط درجے کے بھی ہیں۔ شاہد احمد جمالی کا مضمون 'راجستھان کی اردو نثر پر ایک نظر' خاصا وقیع مضمون ہے۔ مولانا سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑی کا مضمون 'کلام خسرو پر اعتراضات کا تحقیقی جواب' بھی اچھا ہے۔ لیکن یہ اس سے پہلے ماہنامہ ہمایوں لاہور میں شائع ہو چکا ہے جس کا مرتب نے حوالہ دیا ہے۔ مولانا معشوق حسین کا ہی ایک اور مضمون 'غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط' بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ یہ بھی تحقیقی و انکشافی مضمون ہے۔ اسے ماہنامہ آج کل نے فروری 1947 میں شائع کیا تھا۔ مولانا کا ایک اور مضمون 'خیام مؤلفہ سید سلیمان ندوی پر ایک عروضی نظر' بھی تحقیقی، تجزیاتی اور تنقیدی مضمون ہے۔ متین اللہ خاں واثق ٹونکی کا مضمون 'خیابان خلیل پر ایک نظر' بڑا معلوماتی اور عمدہ مضمون ہے۔ سلیم جعفر کے دو مضامین 'ہندوستان کی مشترکہ زبان' اور 'نظر بے نظیر' شامل کتاب ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کا مضمون 'جے پور میں اردو کا تدریجی ارتقا' تحقیقی مضمون ہے۔ اُسے پڑھ کر راجستھان میں اردو کی ارتقائی صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔ اعظم خسروی جے پوری کا مضمون 'کلیم عجم پر ایک نظر' تنقیدی مضمون ہے اور بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے اور بھی کئی مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ مضامین سے پہلے مرتب نے قلمکاروں کے تعارف کا اہتمام کیا ہے تاکہ قارئین لکھنے والے سے واقف ہو سکیں۔ عام طور پر ترتیب شدہ کتابوں میں اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا، لیکن شاہد احمد جمالی نے اس کا اہتمام کر کے قابل مبارکباد کام کیا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب میں شامل اکثر مضامین عمدہ ہیں مگر مضامین کے موضوعات مختلف اور بے ربط ہونے کی وجہ سے قاری کے لیے پوری دلجمعی کے ساتھ مکمل کتاب سے استفادہ کرنا آسان نظر نہیں آتا۔ اس کتاب کے بعض مضامین یہ پتہ دیتے ہیں کہ ان کے لکھنے والے راجستھان کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض مضامین سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ راجستھان کی لسانی و ادبی صورت حال کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اگر مستقل ایک کتاب راجستھان کے قلمکاروں پر شائع کی جاتی کہ ان میں ان کا تعارف ہوتا اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جاتا تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی۔ ایسی ہی ایک کتاب راجستھان میں اردو ادب کی صورتِ حال پر ترتیب دی جاتی جس میں راجستھان میں اردو کے حوالے سے جو کوششیں ہوئیں، نثر یا نظم کے حوالے، سب کا احاطہ کیا جاتا۔ یا پھر ایک ہی کتاب کے دو حصے کیے جاتے۔ ایک حصے میں راجستھان کے مشاہیر نثر نگاروں اور نظم نگاروں وغیرہ کا تذکرہ ہوتا اور دوسرے میں اردو کے حوالے سے راجستھان کی مجموعی خدمات پر مضامین شائع کیے جاتے۔ مجموعی طور پر راجستھان میں اردو پر مواد کے اعتبار سے اس کتاب کو ایک ذخیرہ کہا جا سکتا ہے۔

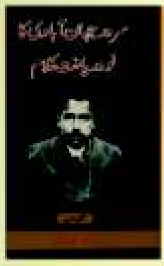

سرور جہان آبادی کا نودریافت کلام

تحقیق و ترتیب: الف ناظم

صفحات: 172، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: کتابی دنیا، دہلی

مبصر: ڈاکٹر قمر الحسن

شعبہ اردو ستیہ وتی کالج، (اشوک وہار، فیز تھری) دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

سرور جہان آبادی اردو کے عظیم شاعر ہیں، ان کی تخلیقی عظمت و انفرادیت ان کی نظمیہ شاعری سے نمایاں ہے۔ محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کی جدید اردو نظم کے فروغ کے لیے کی گئی کوششوں سے متاثر ہو کر سرور جہان آبادی نے قومی اور حب الوطنی کے جذبات سے مملو نظمیں کہیں، جس کی وجہ سے ان کا شمار جدید اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے محض تفنن طبع کے لیے شاعری نہیں کی، بلکہ ایک قومی جذبہ اور وطن دوستی کا احساس ان کی شاعری میں پنہاں ہے۔ انھوں نے قومی ترقی اور عوامی بھلائی کے لیے شاعری کو ایک وسیلہ بنایا اور اس باب میں انھوں نے فکری اور فنی انفرادیت کا ثبوت دیا۔ سرور نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے بھی کیے، انھوں نے حب الوطنی سے پر اور تاریخی موضوعات پر مبنی نظموں کا ایک قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے جس کی وجہ سے انھیں اردو ادب میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

'سرور جہان آبادی کا نودریافت کلام' جواں سال محقق ڈاکٹر الف ناظم کی نئی تحقیقی کاوش ہے، جس میں انھوں نے منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی کے ان کلام کو یکجا کیا ہے جن پر ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ ہر شاعر کا اپنا لہجہ اور اپنا اسلوب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اسے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ سرور کی شاعری کا بھی اپنا ایک رنگ و آہنگ ہے، ان کی اپنی لفظیات اور تشبیہات ہیں جن کی وجہ سے شعری اژدہام میں بھی ان کی نظمیں دور سے پہچان لی جاتی ہیں۔

اردو ادب میں سرقے کی روایت عام ہے، اس ضمن میں بہت سے لوگوں کے نام لیے جا سکتے ہیں، لیکن یہاں سر دست سرور جہان آبادی کی ان نظموں سے بحث ہے جن پر ان کے محب خاص پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنا قبضہ جما لیا اور دھڑلے سے اس زمانے کے مختلف اخبارات و رسائل میں انھیں اپنے نام سے شائع بھی کرائیں۔ خوشحال گھرانے میں آنکھیں کھولنے کے باوجود کثرت مے نوشی کی وجہ سے صحت کے ساتھ ساتھ سرور کی دولت بھی ختم ہو گئی، گھر میں عسرت نے ڈیرے ڈال دیے، شراب کے حصول کے لیے گھر کی رہی سہی چیز بھی ختم ہو گئی، تو خواہش کی تکمیل کے لیے اونے پونے دام میں دوسروں کو اپنی نظمیں دینے لگے۔ سرور کی تنگدستی اور سادہ لوحی کا فائدہ اٹھا کر شاکر

میرٹھی نے معمولی رقم میں ان کی بیش قیمت نظمیں خرید لیں۔ اس زمانے میں سرور کی نظموں کی بدولت شاکر کا شمار معروف نظم گو شعرا میں ہونے لگا لیکن جب بعد میں سرور کی شاعری کے تعلق سے تحقیق کی گئی تو یہ بات سامنے آئی کہ شاکر نے سرور کی نظموں کا ایک وقیع حصہ اپنے نام کرلیا ہے۔ سرور کے کلام کے ضائع ہوجانے اور دوسرے کے نام سے شائع ہونے کا ذکر بہت سے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے اور اب کئی لوگوں کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ پیارے لال شاکر میرٹھی نے سرور جہان آبادی کی درجنوں گراں قدر نظموں کو اپنے نام سے شائع کرایا۔ دیا نرائن نگم کے پاس بہت سے ایسے خطوط تھے جن میں شاکر کی چوری کا ذکر تھا، انھوں نے ان خطوط کو شائع کردیا جس سے شاکر کی شعری حقیقت کی قلعی کھل گئی، بدنامی کے خوف سے انھوں نے خاموشی اختیار کرلی اور انھوں نے اخبارات و رسائل کو کلام بھیجنا بند کردیا۔ ویریندر پرشاد سکسینہ لکھتے ہیں:

''شاکر میرٹھی سے میری ملاقات دہلی میں پانچ سات بار ہوئی، میں نے ان کے پاس سرور کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ دیکھا تھا، جس میں پانچ سو رباعیاں، اور ڈیڑھ سو نظمیں تھیں۔ اس میں سے تقریباً دو سو رباعیاں اور پچاس نظمیں شاکر نے اپنے نام سے شائع کرائیں۔''

اپنی تحقیق کی معتبریت کے لیے محقق نے ان مکاتیب کو مصدر و ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے جو سرور کے معاصرین نے لکھے ہیں۔ جن میں واضح طور پر اس بات کا تذکرہ ہے کہ سرور نے شاکر میرٹھی کو اپنی نظمیں دیں۔ اپنی تحقیق کی تصدیق کے لیے الف ناظم نے ان محققین کی آرا کو بھی جن میں اس علمی خیانت کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ حکم چند نیر نے سرور جہان آبادی پر سب سے پہلے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا، ان کا یہ مقالہ 1968 میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا جس میں حکم چند نیر نے سرور اور شاکر کے تعلقات پر تفصیلی روشنی ڈالی، سرور کے ایسے کلام کا تذکرہ بھی کیا جو شاکر کے نام سے اس عہد کے بہت سے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکا تھا۔

مذکورہ تحقیق سے تحریک پاکر الف ناظم نے سرور کے کلام کی تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور دنیائے شاعری کی مظلوم ترین شخصیت سرور جہان آبادی کے ساتھ ہوئی ناانصافیوں کے ازالے اور اس علمی خیانت کا پردہ چاک کرنے کے لیے انھوں نے تحقیق کی پرخطر وادیوں کی سیاحت کی۔ انھوں نے اس علمی بددیانتی پر محض متقدمین کی رائے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ تحقیق کے اصولوں پر کاربند ہوتے ہوئے مختلف یونیورسٹیوں اور تحقیقی مراکز سے رجوع کیا اس عہد کے بہت سے اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شاکر میرٹھی نے سرور جہان آبادی کی بہت سی نظمیں اپنے نام کرلیں اور نظموں کا ایک معتدبہ حصہ ان کے ہاتھوں ضائع ہوگیا۔ تحقیق کے دوران الف ناظم کو 'اکسیر سخن' کے ساتھ ساتھ سرور کی چوبیس نظمیں، 76 رباعیات اور تین قطعات حاصل ہوئے جو شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ سرور کو منظوم ترجمہ نگاری پر کمال تھا، انھوں نے بہت سے ترجمے بھی کیے ہیں جو ترجمہ نگاری کے باب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سرور جہان آبادی نے کالی داس کی مشہور تصنیف 'رتو سنگھار' کا اردو ترجمہ 'اکسیر سخن' کے نام سے کیا جسے حال فی الحال میں اردو کا باوقار ادارہ قومی کونسل نے شائع کیا ہے۔

'سرور جہان آبادی کا نودریافت کلام' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شاکر میرٹھی کی علمی بددیانتی اور خیانت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس نے دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرور جہان آبادی کی بیش بہا تخلیقات پر اپنا قبضہ جمایا اور ان کی نظمیں اپنے نام کرلیں، ساتھ ہی سرور کے کلام کا ایک وقیع حصہ شاکر سے ضائع بھی ہوگیا اگر وہ سارا کلام ان کے دست برد سے محفوظ رہتا تو اردو کی نظمیہ تاریخ میں سرور کا قد مزید بلند ہوتا اور ان کے فکر و فن کی راہیں مزید روشن ہوتیں۔ جبکہ کتاب کے دوسرے حصے میں ان نظموں کو جمع کیا گیا ہے جو مختلف اخبارات و رسائل میں شاکر میرٹھی کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ ان نظموں کی تعداد چوبیس ہے جبکہ رباعیات کی تعداد 76 اور قطعات کی تعداد تین ہے۔ سرور کی یہ نظمیں فکر اور فن کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں۔ ان میں روانی بھی ہے اور برجستگی بھی۔ ان میں بعض نظمیں تاریخی نوعیت کی ہیں جبکہ بعض حب الوطنی کے زمرے میں آتی ہیں۔

مقام مسرت ہے کہ الف ناظم نے تحقیقی ادراکات کو بروئے کار لاتے ہوئے سرور جہان آبادی کی ان بیش قیمت نظموں سے اردو قاری کو متعارف کرایا جن پر شاکر میرٹھی نے قبضہ جمالیا تھا۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی ادراکات کو پوری کتاب میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ الف ناظم کی اس سے پہلے بھی کئی تحقیقی کتابیں منظر عام پر ناقدین علم و ادب سے داد تحسین حاصل کرچکی ہیں۔

خسرو نامہ

مرتب: یوسف رامپوری، زیر نظر و فکر: مفتی افروز عالم قاسمی
صفحات: 260، قیمت: 300 روپے
ناشر: نور پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی
مبصرہ: شاہدہ شاہد، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں امیر خسرو بابا آدم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار ہندوستان کے برگزیدہ صوفیوں میں ہوتا ہے۔ تصوف، شاعری اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں پر امیر خسرو کی ذات کے مختلف پہلو روشن ہوں گے لیکن ان کی زندگی اور کارناموں سے متعلق دریافتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کی شخصیت کی بوقلمونی ہے۔ وہ بیک وقت صوفی، شاعر، موسیقار، مفکر اور دانشور تھے۔ ہندوی (ہندی اور اردو) میں ان کی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں سے بیشتر کو محققین نے منسوب قرار دیا ہے لیکن کچھ کلام خاص طور پر کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں کی حیثیت مسلم ہے۔ فارسی میں ان کے کلام کا ذخیرہ موجود ہے، ان کے مطالعے سے امیر خسرو کی شعری استعداد اور فکری بالغ نظری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 'خسرو نامہ' امیر خسرو کی دریافت اور بازیات کی ایک کاوش ہے، جسے ابتدائی کاوش کہنا مناسب ہوگا۔

امیر خسرو سے متعلق اردو میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن ان سب میں بات اسی نکتہ پر مرکوز ہے کہ زیر بحث کلام امیر خسرو کا ہے یا ان سے منسوب ہے۔ پچھلے برس نومبر میں 'الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے امیر خسرو کی حیات اور ادبی خدمات پر ایک سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ اس سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو یوسف رامپوری نے مفتی افروز عالم قاسمی کی نگرانی میں یکجا کر کے الہند تعلیم جدید فاؤنڈیشن نئی دہلی سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں دیباچہ (نظر و فکر) اور مقدمہ کے علاوہ امیر خسرو کی حیات اور کارناموں سے متعلق انیس مضامین شامل ہیں۔ کتاب کی اچھی بات یہ ہے کہ اس میں جن لوگوں کے مضامین کو جگہ دی گئی ہے ان میں ہر نسل کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ اس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قاری یہ محسوس کرسکتا ہے کہ بزرگ نسل کے لکھنے والے امیر خسرو سے کس قسم کا مکالمہ قائم کرتے ہیں اور نئی نسل کس طرح سے خود کو امیر خسرو سے قریب پاتی ہے۔ کتاب کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں پامال موضوعات کے بجائے کچھ نئے پہلو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ امیر خسرو کا بیشتر کلام فارسی میں ہے، ان کی فارسی تخلیقات کا جائزہ اہل زبان نے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں آذرمی دخت صفوی، شریف حسین قاسمی، عراق رضا زیدی کے مضامین بطور

خاص توجہ طلب ہیں۔ ڈاکٹر کلیم اشرف نے امیر خسرو کی مثنوی 'ہشت بہشت' کے سیاق میں بیٹیوں کی تعلیم و تربیت اور امیر خسرو کے تصور تعلیم نسواں سے بحث کی ہے۔ علیم اشرف خاں نے ان کی مثنوی 'مطلع الانوار' کا تجزیہ کیا ہے، انھوں نے اس مثنوی میں امیر خسرو کی زندگی کا عکس تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا سب سے تفصیلی اور کارآمد مضمون پروفیسر آذرمی دخت صفوی کا ہے۔ انھوں نے 'طوطی ہند خسرو دہلوی' کے عنوان سے امیر خسرو کی زندگی اور شعری و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے قاری امیر خسرو سے متعلق بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ امیر خسرو کی تخلیقیت سے متعلق حقانی القاسمی کی تحریر فکر انگیز اور دلچسپ ہے۔ انھوں نے امیر خسرو کے تعلق سے لکھا ہے:

''امیر خسرو کی طبیعت مجتہدانہ تھی۔ اس لیے انھوں نے نہ کبھی دوسروں کی خاک سے تیمم کیا اور نہ ہی دوسروں کی روٹی سے اپنا دسترخوان سجایا۔ انھوں نے اپنی ایک الگ راہ نکالی' قلب اللسانین، وصل الحرفین، ردیف المعتنین' جیسے تجربے کیے اور فکری سطح پر دیکھا جائے تو امیر خسرو آج بھی اپنے تکثیری تشخص کے ساتھ برصغیر کے اجتماعی حافظے میں زندہ و تابندہ ہیں۔''

اس میں شک نہیں کہ امیر خسرو اختراعی ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن کے علاوہ موسیقی میں بھی کامیاب تجربے کیے۔ جس طرح ہندی اور اردو کی ادبی تاریخ امیر خسرو کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اسی طرح ہندوستانی موسیقی اور تصوف کی تاریخ بھی ان کے ذکر کے بغیر ناقص ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ امیر خسرو ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہیں لیکن گزشتہ کچھ دہائیوں سے ان کا ذکر کم ہونے لگا ہے۔ تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کے نصاب سے بھی انھیں رفتہ رفتہ الگ کرنے کی کاوش ہوتی رہی ہے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ ان یادوں کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت ایک سمینار کا انعقاد ہوا اور جو لوگ اس سمینار میں شریک نہیں ہو سکے۔ ان کے لیے سمینار میں پڑھے گئے مقالوں کو اہتمام سے شائع کیا گیا۔

یوسف رامپوری نے اپنے مقدمے میں تمام مقالوں اور ان کے لکھنے والوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین امیر خسرو تک پہنچنے میں معاونت کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ یہ تمام مقالے اعلیٰ درجے کے ہیں۔ خود مرتب کو اس بات کا احساس ہے کہ کچھ مضامین اوسط درجے کے ہیں:

''یہاں اس بات کا اعتراف کرنا راقم کی ذمہ داری ہے کہ جو مقالات و مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ان میں زیادہ تر بڑے گراں قدر ہیں اور اپنے موضوعات کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ بعض مقالے اوسط درجے کے بھی ہیں۔''

اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے لیے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کے مطالعے سے قاری امیر خسرو کی زندگی اور ان کے کارناموں کی حد تک واقف ہو سکتا ہے۔ امیر خسرو ہماری تہذیبی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے ان سے واقف ہوئے بغیر ہم اپنی تہذیب سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ امیر خسرو سے آشنائی میں 'خسرو نامہ' کا اہم رول ہو سکتا ہے۔

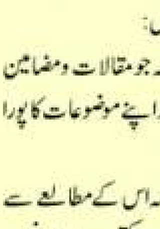

اردو کے چند فکشن نگار (تنقید و تجزیہ)

مصنف: ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی

صفحات: 344، قیمت: 181 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ملنے کا پتہ: عدلیہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ، مؤناتھ بھنجن 275101

مبصر: غلام نبی کمار،

مکان نمبر B-20، تیسری منزل، غفور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

'اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ' ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی کی چوبیس مضامین پر مشتمل کتاب ہے۔ اس میں بیسویں اور اکیسویں صدی کے چند معتبر اور اہم فکشن نگاروں کے فنی، فکری اور تکنیکی امتیازات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین کی ابتدا بیسویں صدی کے ایک ممتاز، ہردلعزیز اور سدا بہار افسانہ نگار پریم چند پر لکھے گئے مضمون سے ہوتی ہے جبکہ آخری مضمون دور حاضر کے معروف افسانہ نگار اشتیاق سعید پر ملتا ہے۔ شامل کتاب چوبیس مضامین میں صرف ایک مضمون بعنوان 'قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری اور شعور کی رو کی تکنیک' صنف ناول پر لکھا گیا ہے جبکہ باقی سبھی مضامین میں صنف افسانہ کو ہی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جن افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا پیش نظر کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے ان میں پریم چند، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، صالحہ عابد حسین، بلونت سنگھ، سریندر پرکاش، ڈاکٹر علیم مسرور، سعید فریدی، ساجد رشید، شفق، شاکر کریمی، ایس۔ ایم۔ عباس، شرافت حسین اور اشتیاق سعید قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے کتاب 'اردو کے چند فکشن نگار: تنقید و تجزیہ' کی ابتدا میں 'اردو افسانہ۔ منظر پس منظر' کے عنوان سے 67 صفحات کا ایک بھرپور اور مبسوط ابتدائیہ تحریر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے مختلف ذیلی عنوانات قائم کرکے اردو کی پوری افسانوی تاریخ کا احاطہ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔

زیر نظر کتاب کے اولین مضمون 'پریم چند کا سدا بہار افسانوی تشخص' میں پریم چند کی مجموعی افسانوی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں کے بنیادی محرکات اور موضوعات کو نمایاں کیا گیا ہے۔

دوسرے مضمون 'پریم چند کا نظریہ فن و ادب' میں انھیں ادب برائے زندگی کا اولین علمبردار قرار دیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر پر بھی دو مضامین قلمبند کیے گئے ہیں جس میں 'قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری اور بیوروکریٹ معاشرت' اور 'قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری اور شعور کی رو کی تکنک' شامل ہیں۔

اول الذکر مضمون بالکل ایک انوکھا مضمون ہے جبکہ اخر الذکر مضمون میں جس موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہے وہ ابتدا سے آج تک موضوع بحث بنتا رہا ہے۔ لیکن دونوں مضامین میں مصنف کی بہترین تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کرشن چندر بیسویں صدی کے عہد ساز افسانہ نگار کہلاتے ہیں اس کتاب میں ان پر بھی دو مضامین ہیں۔ پہلا 'زندگی کی حقیقتوں کا افسانہ نگار: کرشن چندر' جبکہ دوسرا 'تعلیم، سائنس و حکمت اور کرشن چندر' پر مشتمل ہے اور دونوں مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ منٹو پر تحریر کیے گئے مضمون 'سعادت حسن منٹو کی افسانوی انفرادیت' میں لکھا گیا ہے کہ منٹو کی افسانہ نگاری انوکھی بھی ہے اور نئی بھی۔ انھوں نے اردو افسانہ نگاری کے روایتی اور بنے بنائے پیمانوں کا حسب ضرورت استعمال بھی کیا ہے اور انحراف بھی۔ ان کا سماجی اور سیاسی شعور انتہائی بالیدہ ہے جس میں وسعت بھی ہے اور گہرائی و گیرائی بھی۔

اس کتاب میں شامل دیگر مضامین وہ چاہے ابتدائی افسانہ نگاروں کے بارے لکھے گئے ہیں یا عہد حاضر کے افسانہ نگاروں پر، سب کے سب رنگا رنگ، بے حد دلچسپ، معلوماتی، مفید اور معنی سے پُر ہیں۔ ان میں 'مجنوں گورکھپوری اور اردو فکشن'، 'عزیز احمد کے افسانوی امتیازات'، 'عصمت چغتائی اردو افسانہ اور کردار نگاری'، 'سہل ممتنع کا افسانہ نگار: سعید فریدی'، 'شفق کا افسانوی افق' اور 'اکیسویں صدی اردو افسانہ اور اشتیاق سعید' وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ الغرض یہ کتاب فکشن پر کام کرنے والے محققین کے لیے خوان نعمت ثابت ہو سکتی ہے۔

شخصیات

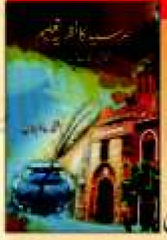

سرسید کا نظریہ تعلیم

مصنف: پروفیسر افتخار عالم خاں
پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
صفحات: 304، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2017
مبصر: پروفیسر ابوالکلام قاسمی، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں کے موضوع میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے کہ اس کو گرفت میں لینے کا حق محض دو چار مضامین یا معدودے چند کتابوں پر مبنی تحریروں سے پوری طرح ادا نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید احمد خاں ایک مؤرخ تھے، یا مفسر قرآن، وہ ایک ادیب یا صحافی تھے یا انشا پرداز یا وہ مجموعی طور پر ایک غیر معمولی دانش ور تھے یا اپنے دور کے عظیم مصلح، یہ تمام حیثیتیں اپنے اندر جزوی صداقتیں رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ سرسید سے متعلق متعدد کتابوں کی اشاعت کے باوجود، ان کے کارناموں کے ان گنت گوشے ہنوز تحقیق و تجسس کا موضوع نہیں بنائے جاسکے ہیں۔ اس ضمن میں اگر نمائندہ تحریروں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی جائے تو درجن دو درجن کتابوں سے آگے فہرست سازی بھی نہیں کی جاسکتی۔ تاہم اگر نہایت اعتدال کے ساتھ اور مبالغہ سے احتراز کرتے ہوئے، اس ضمن میں کسی ایک مصنف کی تصنیفات کو اب ممتاز ترین حیثیت حاصل ہوگئی ہے تو اس مصنف کا نام پروفیسر افتخار عالم خاں ہے، جنھوں نے گزشتہ دس پندرہ برسوں سے نہایت انہماک اور ارتکاز کے ساتھ اپنی ساری توجہ مطالعات سرسید پر مرکوز کر رکھی ہے۔

پروفیسر افتخار عالم خاں نے اس موضوع کے متعلقات پر اپنی تلاش و جستجو کا آغاز سائنٹفک سوسائٹی پر مبنی اپنی کتاب سے کیا تھا۔ اس کتاب کے بعد سرسید کے سوانحی احوال وکوائف، مدرسۃ العلوم اور ایم۔اے۔او۔ کالج سے متعلق شخصیات اور فن تعمیر پر مبنی سرسید کے اختراعات کے علاوہ اردو اور ہندی کے بارے میں لسانی مسائل و معاملات یا سرسید کی زرعی اصلاحات سے متعلق پروفیسر خان کی کتابیں اپنے اپنے موضوعات پر تحقیق و تلاش کا ایک معیار قائم کرچکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تنوع اور ہمہ گیری کے ساتھ اپنے دائرۂ تحقیق کو وسیع کرنے کے عمل میں انھوں نے مطالعات سرسید کے بیش تر گوشوں پر اپنی دست رس اور عالمانہ گرفت کو مزید مستحکم کرلیا ہے۔ شاید اسی باعث یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ پروفیسر موصوف اُس وقت تک کسی موضوع پر قلم ہی نہیں اٹھاتے جب تک متعلقہ موضوع کے تمام مالہ وماعلیہ پر ضروری شواہد فراہم نہ کرلیں اور اپنے مدعا کو مزید حتمی بنانے کے لیے ناگزیر دستاویزی حوالوں تک ان کو رسائی حاصل نہ ہوجائے۔

تعلیم، نظریۂ تعلیم اور تعلیم و تدریس کے عملی پہلوؤں پر پروفیسر افتخار عالم خاں کی زیر بحث کتاب نہ صرف یہ کہ متذکرہ علمی اور تحقیقی امتیازات کا عمدہ ثبوت فراہم کرتی ہے بلکہ اس موضوع پر اب تک رسمی اور روایتی انداز میں پیش پاافتادہ تفصیلات کو دہرانے کا جو عمل جاری تھا اس کے ابہام کو رفع کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سرسید احمد خاں نے چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کے سارے سماجی اور ثقافتی مسائل کی کلید کے طور پر تعلیم و تدریس کو پوری توجہ کا مرکز بنایا تھا، اس لیے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے بموجب انھوں نے ساری زندگی تعلیم اور تدریس کے مضمرات کو سوچنے، سمجھنے اور رائج طریق تعلیم کی اصلاح کرنے کے لیے وقف کردی تھی۔ سرسید تاریخ کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں ایک طرف روایتی مشرقی علوم اور نظام تعلیم کو ناگزیر تصور کیا جاتا تھا اور دوسری طرف مغربی علوم اور نظام تعلیم کی افادیت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا تھا۔

سرسید احمد خاں نے اپنے عنفوان شباب سے ہی قدیم علوم مثلاً معقولات، عربی، فارسی، علم فلکیات، منطق اور فلسفہ سے گہری وابستگی کے باوجود ان علوم کی افادیت اور مستقبل کے لیے ان کے احتساب اور نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک طرف ہندوستان میں رائج نظام تعلیم پر نہ تو انگریز دانش وروں کی یک طرفہ تنقید کو قبول کرنے کو تیار تھے اور نہ محض روایتی اور مشرقی طرز تعلیم کو من و عن قبول کیے رہنے اور آئندہ کے لیے اس کو اپنے وقت کے تقاضوں سے آشنا کرنے کے لیے آمادہ تھے۔

سرسید انیسویں صدی کے ہندوستان کے ان مفکرین اور دانش وروں میں سے ایک تھے جنھوں نے مستقبل میں ہندوستان کی سماجی اور تعلیمی ترقی کے تمام امکانات کو اپنی فکر کا محور بنایا تھا۔ انھوں نے ورنا کیولر طرز تعلیم کے سلسلے میں یکم اگست 1867 کو ایک عرض داشت گورنمنٹ میں داخل کی تھی جس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس عرض داشت کے نکات پر تقریباً بیس سال تک بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ یہ وہی عہد تھا جب کلکتہ اور مدراس یونیورسٹی اور قدرے بعد میں الٰہ آباد و پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ ان تمام اداروں کے حوالے سے ذریعہ تعلیم کے طور پر مادری زبان کو اختیار کرنے، انگریزی کی لیاقت پیدا کرنے اور جدید و قدیم علوم کا تناسب متعین کرنے جیسے مسائل سے ہندوستانی ماہرین تعلیم کے ساتھ انگریز تعلیمی سربراہ بھی دوچار رہے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ قومی سطح پر تعلیم و تدریس کے محرکات میں سے سرسید کا قائم کردہ ڈسکورس ہر جگہ اور ہر تعلیمی صورت حال میں رہنما اصول کی حیثیت سے ایک اہم محرک کا رول ادا کر رہا تھا۔ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستان میں جو بھی نیا نظام تعلیم رائج کیا جائے اس کے مقاصد میں طالب علم کی ذہنی نشو ونما اور تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کو ضرور شامل ہونا چاہیے۔ سرسید احمد خاں نے لارڈ میکالے کے تعلیمی تصورات اور مسٹر کیمپسن کی طرف سے شائع کی جانے والی ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کی سالانہ رپورٹوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا تھا اور بقول پروفیسر خان ''یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں جدید علوم کی تعلیم کو فروغ دینے اور عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تدریس اور تشہیر مقامی زبانوں (ورنا کیولر) کے ذریعہ کی جائے''۔

مغربی علوم اور نئی بصیرتوں پر مبنی علم و دانش سے ہندوستان کی آشنائی نے سرسید احمد خاں کے لیے بالکل نئے سیاق و سباق میں تعلیم کے مسئلے پر غور و خوض کے دروازے کھول دیے تھے۔ چنانچہ مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی منصوبہ بندی اس حد تک ان کے پیش نظر رہی کہ 6 سال کی عمر سے 10 سال کی عمر تک، 11 سال سے 13 سال تک، 13 سے 18 سال تک، 19 سے 21 سال تک اور 21 سال کی عمر کے بعد کے تمام مراحل میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیمی نشو ونما اور تدریجی نگہ داشت کا ایک نہایت واضح اور تجزیاتی نقشہ انھوں نے مختلف کمیٹیوں کے سامنے پیش کردیا تھا۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چوں کہ وہ خود ایک بڑی تعلیم گاہ کا خواب بہت پہلے سے دیکھ چکے تھے اس لیے لگاتار وہ مدرسۃ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طرز تعلیم، نصاب تعلیم اور طلبہ کی رہائش کے تمام مسائل کو زیر بحث لاتے رہے اور نہایت جمہوری انداز میں اپنے رفقا، ہی نہیں بلکہ سربراہوں سے بھی ان پر غیر جانب دارانہ اظہار خیال اور ان کو روبہ عمل لانے کی تدابیر کی توقع رکھا کرتے تھے۔

پروفیسر افتخار عالم خاں نے اس کتاب میں جس طرح سرسید کے تعلیمی نظریات کا پورا خاکہ اور انیسویں صدی کے ہندوستان میں ان کی تعلیمی منصوبہ بندی اور عملی اقدامات کا نقشہ پیش کیا ہے اس سے سرسید علیہ الرحمہ کی عبقری اور دانش ورانہ شخصیت کے بعض بالکل نئے گوشے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس لیے توقع کی جاسکتی ہے کہ

’سرسید کا نظریہ تعلیم‘ سے موسوم یہ کتاب نہ صرف یہ کہ سرسید کے تعلیمی تصورات کی کلید ثابت ہوگی بلکہ نوآبادیاتی عہد کی صورت حال میں تبدیل ہوتے ہوئے تعلیمی منظرنامے کو بھی مزید روشن کرے گی۔

اس پورے پس منظر میں افتخار عالم خاں کی یہ کتاب سرسیدیات میں ایک بامعنی اور قابل قدر اضافے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

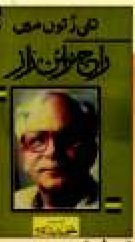

نئی رتوں میں: راج نرائن راز

مولف: خورشید اکرم

صفحات 256، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: اسرار گاندھی، C-5، گلاب باڑی کالونی، الہ آباد۔ 211003 (یوپی)

زیر تبصرہ کتاب ’نئی رتوں میں: راج نرائن راز‘ کو دیکھ کر سب سے پہلے میرے ذہن میں جو خیال آیا وہ یہ ہے کہ آج کے زمانے میں جب کہ ہر شخص اپنا قد بڑھانے اور جس قدر ممکن ہو دوسرے سے فائدہ اٹھالینے کے لیے کوشاں ہے، کیا کوئی شخص اتنا بے لوث بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کی حیات وخدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے جس کو گزرے ہوئے بیس برس ہو چکے ہوں اور جس کا اردو ادب میں کوئی والی وارث بھی نہ ہو۔ لیکن خورشید اکرم نے یہ کر دکھایا ہے۔ ان کو میں افسانہ نگار، شاعر، نہایت مخلص انسان اور ایک اچھے دوست کے طور پر ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ راج نرائن راز پر ان کی ترتیب دی ہوئی اس کتاب کو دیکھ کر مجھے اور شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ خورشید اکرم کا ظاہر اور باطن ایک ہے اور میرے دل میں ان کے لیے جگہ تھوڑی اور بڑھ گئی ہے۔

میں اور میری طرح اور بہت سے لوگ راج نرائن راز کو دو طرح سے جانتے ہیں ایک بطور شاعر اور دوئم بطور ایڈیٹر آجکل۔ وہ مشہور جدید شاعروں: بانی، کمار پاشی، بشیر بدر، زبیر رضوی، مخمور سعیدی وغیرہ کے ہم عمر اور ہم عصر تھے۔ راز 1980 کی دہائی میں تقریباً نو برس آجکل کے ایڈیٹر رہے۔ اس زمانے میں ادبی رسائل کی بہت کمی تھی اور ’آجکل‘ نہایت معیاری رسالے کے طور پر شائع ہوتا تھا۔ اس میں نئے پرانے ہر طرح کے ادیب چھپتے تھے اور چھوٹا بڑا ہر ادیب چھپنے کی خواہش رکھتا تھا۔

خورشید اکرم نے 1987 میں ’آجکل‘ میں بطور سب ایڈیٹر جوائن کیا اور تقریباً ڈھائی برس ان کی ماتحتی میں کام کیا اور ان سے ادارت کے رموز سیکھے۔ پھر یہ دفتری تعلق ان کا گہرا ذاتی تعلق بن گیا، جس کا نذرانہ انھوں نے مرحوم کو اس کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کے مطالعے سے راز نرائن کی شخصیت کے کم از کم دو حسین پہلو اور سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اردو زبان وادب کے عشق میں گلے گلے تک ڈوبے ہوئے تھے اور اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے عاشق وشیدا تھے۔ اور دوئم یہ کہ اگر ایک طرف ادبی معیار کے معاملے میں وہ نہایت سخت گیر تھے تو دوسری طرف نئے ادیبوں اور شاعروں کے تئیں نہایت مشفق وملنسار شخص تھے۔

زیر نظر کتاب میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نند کشور وکرم، شارب ردولوی، رتن سنگھ، مجتبیٰ حسین، شمیم حنفی، عتیق اللہ، مخمور سعیدی، فاروق ارگلی، افتخار امام صدیقی، مسعود منور، انیس رفیع، انجم عثمانی، مشرف عالم ذوقی، نیر قریشی گنگوہی، جمیل اختر، عمران عظیم، مراد کربانی، مدبرہ عثمانی، ویس راج مضطر کے مضامین شامل ہیں۔ خود خورشید اکرم نے ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں آجکل سے اپنی ابتدائی وابستگی اور راز صاحب کے مزاج کی تندی اور نرمی دونوں کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

شخصیت پر لکھے گئے ان مضامین کے علاوہ راز کی شاعری پر لکھے گئے بانی، حکیم منظور اور رام پرکاش راہی کے مضامین بھی کتاب میں شامل ہیں۔ بانی نے راز کے دوسرے مجموعے ’لذت لفظوں کی‘ کا دیباچہ لکھا تھا جو 1976 میں شائع ہوا تھا۔

خیال رہے کہ راز بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں کا سرمایہ نظم کے مقابلے کم ہے۔ راز کی غزلوں کے بارے میں بانی نے جو خود اردو غزل کے غیر معمولی شاعر تھے، کہتے ہیں ”نئی غزل جس میں آج کے انسان کی تنہائی، مایوسی، سمتوں کے منہدم ہونے پر گم شدگی، قربتوں کا زوال، وابستگیوں کی بے معنویت، ذات کی رائگانی وبے اثری کا نوحہ سنائی دیتا ہے، ایک ایسی ناقابل قبول زندگی کو پیش کرتی ہے کہ چیخ نکل جاتی ہے۔ مگر اسی فضا کے درمیان راز، امید کی زندہ قوتوں سے کام لیتے ہیں اور تینوں زمانوں ماضی، حال اور مستقبل کے تسلسل کو مثبت داخلی قدروں کے تناظر میں رکھ کر تہذیبی تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں..... راز کٹے ہوئے وقت کا شکار نہیں بلکہ باطن کی سلامتی اور اس کے استحکام پر اصرار کرتے ہیں..... یہی ان کے احساس کی شناخت ہے اور یہی ان کی انفرادیت کا بین ثبوت۔“

مثال کے طور پر یہ چند شعر دیکھیے:

اس آس پہ کہ خود سے ملاقات ہو کبھی　　اپنے ہی در پہ آپ ہی دستک دیا کیے

شاید ہوائے تازہ کوئی آئے اس طرف　　رکھا ہے میں نے گھر کا دریچہ کھلا ہوا

کتنا سرکش تھا ہواؤں نے سزا دی کیسی　　کاٹھ کا مرغ ہوں اب بادنما ہوں میں بھی

عابد کرہانی صاحب نے جو خود ’آجکل‘ کے ایڈیٹر رہے ہیں، راز کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے جس سے ان کے گہرے دلی جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ایک مضمون ہندی میں بھی شامل ہے جس کے مطالعے سے مصنفہ گائتری شرما سے راز صاحب کی مشفقانہ قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ گائتری شرما کا اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے ان کا مختصر تعارف بھی کتاب میں دے دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔

کتاب میں راز کی نظم ونثر دونوں کے کچھ نمونے رکھ دیے گئے ہیں۔ ان کی تقریباً ایک درجن غزلیں اور تقریباً اتنی ہی نظمیں شامل ہیں۔ اس سے ایک شاعر کے شعری محاسن کا اندازہ اچھی طرح ہوسکتا ہے۔ اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں انھوں نے جو مضمون لکھا تھا اور جو اس کتاب میں شامل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راز شاعری کے بارے میں کیا سوچتے تھے اور شاعری ان کے روحانی کرب اور خوشی کا اظہار بننے کے عمل میں کن مرحلوں سے گزرتی تھی۔ ہر سچے اور بہترین تخلیق کار کی طرح انھیں بھی اپنے عہد کے ناقدوں سے شکایت رہی۔ یہ وہ شکایت ہے جو ہر فنکار کو ہوتی ہے۔ ہم اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے لیکن ادیب کو اپنی سمجھ بھر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ راج نرائن راز جس پایہ کے شاعر، نثر نگار اور ادبی صحافی تھے، اس قدر ان کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ ہماری یونیورسٹیاں ان ادیبوں کی نسبتاً معمولی درجے کی خدمات پر بھی تحقیق کراتی ہیں جو اپنی خدمات کی تشہیر کے معاملے میں انتہائی خود کفیل ہوتے ہیں۔ میرے علم کی حد تک کسی یونیورسٹی نے راج نرائن راز کی گوناگوں ادبی خدمات پر کوئی تحقیقی کام اب تک نہیں کیا ہے۔ اس کام میں اب مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے ورنہ یہ اردو والوں کی بے اعتنائی سمجھی جائے گی جو اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھلا دینے کے جرم جیسا ہوگا۔

کتاب نہایت سلیقے سے چھپی ہے۔ تزئین وطباعت ایسی اعلیٰ درجے کی ہے کہ اسے فرینک فرٹ کے عالمی کتاب میلے میں بھیجا جانا چاہیے کہ دیکھیے ہندوستان میں اردو میں اس اعلیٰ معیار کی کتاب بھی شائع ہوتی ہے۔

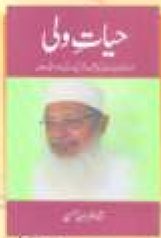

حیات ولی

مؤلف: شاہ عمران حسن
صفحات 224، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: رہبر بک سروس، اوکھلا، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر معصوم شرقی، آر ایل بی لین 743194 (شمالی کولکاتا)

بہار کے بیشتر اضلاع علما، صلحا، صوفیا اور اتقیا کا مخزن رہے ہیں۔ ان میں ضلع مونگیر کو امتیاز و افتخار حاصل ہے کہ اس کے دامن میں مدارس اور خانقاہوں کا ایک قدیم سلسلہ ہے جو آج بھی نئی نسلوں کی تربیت و اصلاح کے مراجع کے طور پر معروف ہے اور تشنگانِ علوم فیضان حاصل کر رہے ہیں۔

شاہ عمران حسن نوجوان ادیب ہیں۔ اہل علم اور علمائے دین کی معتبر شخصیات پر مضامین و مقالات لکھتے رہے ہیں۔ ان کی دو کتابیں 'حیاتِ رحمانی' (امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی حیات و خدمات) اور اوراقِ حیات (مولانا وحید الدین خاں کی حیات و خدمات) شائع ہو کر سند قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

پیش نظر کتاب 'حیاتِ ولی' رحمانی خانوادے کے معتبر عالم دین، بہترین مصلح مولانا محمد ولی رحمانی کی علمی اور تحریکی زندگی کے حالات و واقعات اور خانقاہ رحمانی کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ شاہ عمران حسن نے مولانا موصوف کی زندگی کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے اور تحقیقی مراحل سے گزرنے کے بعد موصوف کی زندگی کے مختلف جہات کا تفصیلی مطالعہ غیر جانب دارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مولانا محمد ولی رحمانی کے اندر بے پناہ دینی و علمی اور تحریکی و تنظیمی صلاحیت ہے۔ ان تمام پہلوؤں پر مؤلف نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مولانا موصوف کو اردو زبان پر کما حقہ عبور حاصل ہے، اس کا اعتراف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) نے بھی کیا ہے۔

جامعہ رحمانی دور جدید میں ہندوستان کے نمائندہ دینی مدارس میں سے ایک ہے۔ یہاں کے متعدد شعبوں کے علاوہ 'رحمانی فاؤنڈیشن' اور 'کوچنگ رحمانی تھرٹی' (IIT) مولانا محمد ولی رحمانی کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے جس سے سیکڑوں طلبہ و طالبات فیض یاب ہو رہے ہیں۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے مشمولات میں حضرت ولی رحمانی کی زندگی اور مشن پر شاہ عمران حسن نے بڑے دل نشیں انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ، سلجھا ہوا اور بالکل عام فہم ہے۔ انھوں نے مولانا موصوف کے کوائف بلا اشتباہ موثر انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

آغاز کلام کے تحت کتاب کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ سفر مسلسل میں مولانا ولی رحمانی کی زندگی کے ماہ و سال کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کا شجرہ نسب ہے۔ مولانا کی زندگی اور احوال و کوائف پہلے حصے میں دیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں درس و تدریس تربیت یافتہ افراد، ہفتہ وار نقیب کی ادارت، انداز تحریر جیسے ذیلی موضوعات کے تحت مولانا ولی رحمانی کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں خانقاہ رحمانی، جامعہ رحمانی، رحمانی فاؤنڈیشن، رحمانی تھرٹی جیسی تعلیمی و تربیتی کوششوں کا تذکرہ ہے۔ چوتھے حصے میں ملک کے مختلف مسائل و معاملات پر ولی رحمانی کے رخ اور ان کی کوششوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پانچویں حصے میں ولی رحمانی اور شاعری کے ذوق، تعمیری ذوق، نئی نسل کی تربیت، تلاوت قرآن جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا کا ایک انٹرویو بھی کتاب میں شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں اظہار عقیدت کے تحت ولی رحمانی کے لیے لکھی کچھ نظمیں بھی دی گئی ہیں۔ حرف آخر میں کتاب تحریر کرنے سے متعلق کچھ یادگار باتیں ہیں۔ یہ حرف آخر نہ ہو کر مقدمہ یا پیش لفظ بن گیا ہے۔ مولانا ولی رحمانی کی یادگار تصاویر نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

کاغذ عمدہ اور طباعت معیاری ہے۔ امید ہے کہ مولف کی دیگر تصانیف کی طرح ان کی یہ کتاب بھی ادب کے ہر حلقے میں پسند کی جائے گی!!

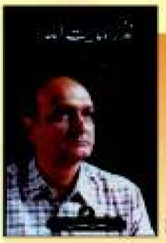

نذر حمایت اللہ

مرتبین: ڈاکٹر رشید موسوی، پروفیسر بیگ احساس
صفحات: 264، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: روزنامہ سیاست حیدرآباد
مبصر: خالد رضا خان، D 1/110 11، سیکٹر 16، روہنی، نئی دہلی 85

طنز و مزاح اردو ادب کا ایک اٹوٹ حصہ رہا ہے۔ جعفر زٹلی، انشا، رنگین سے ہوتے ہوئے غالب اور اکبر و نظیر تک اردو زبان میں طنز و مزاح کی روشن روایت رہی ہے۔ ان کے بعد منشی سجاد حسین، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین وغیرہ تک طنز و مزاح نے اردو ادب میں اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ اس طنز و مزاح کی روایت کو موجودہ عہد میں آگے بڑھانے والوں میں مجتبیٰ حسین سرفہرست ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے پرانے دوستوں میں حمایت اللہ بھی شامل ہیں جو مجتبیٰ حسین کے ساتھ ساتھ ہی جوان ہوئے اور پلے بڑھے اور ایک ہی صنف طنز و مزاح نگاری میں ہی نام کمایا۔ حمایت اللہ نہ صرف طنز و مزاح لکھتے تھے بلکہ وہ ایک اچھے شاعر، ڈرامہ نگار، ٹی وی اسکرپٹ رائٹر بھی رہے ہیں۔ انھوں نے قلی قطب شاہ، دروازے کھول دو، جھانسی کی رانی وغیرہ ڈرامے تحریر کیے ساتھ ہی ہنسی کا سفر، ہماری زینت، نغمے کا سفر جیسے ٹی وی سیریلوں کے لیے اسکرپٹ بھی تیار کیے۔ انھوں نے حیدرآباد میں فائن آرٹس اکیڈمی کا بھی قیام کیا۔ ان کا طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا مجموعہ دھنمری کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ انھوں نے فرمان، ادھیکار، ہماری زینت جیسے ٹی وی سیریلوں میں اداکاری بھی کی تھی۔

نذر حمایت اللہ روزنامہ سیاست کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اور اس کتاب کے مرتبین ڈاکٹر رشید موسوی اور پروفیسر بیگ احساس ہیں۔ رشید موسوی حمایت اللہ کی اہلیہ ہیں۔ کتاب میں پیش لفظ زاہد علی خان کا ہے۔ پہلے حصے میں ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ڈاکٹر زینت ساجدہ، مجتبیٰ حسین، پروفیسر سید مجاور حسین رضوی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر بیگ احساس، سجاد شاہد، ساجد اعظم، محبوب خاں اصغر وغیرہ کے مضامین ہیں، کتاب کے دوسرے حصے میں بشیر النسا (ہوسٹن) عطیہ حفیظ (شکاگو) اور اودھیش رانی کے تاثرات ہیں۔ تیسرا حصہ حمایت اللہ لندن میں ہے جس میں ان کے لندن کے روز و شب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ منظوم خراج تحسین کے تحت طالب خوندمیری، رؤف رحیم اقبال ہاشمی کے کلام ہیں جب کہ تبصرے کے حصے میں ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر رحمت یوسف زئی، محمد کاظم، فاضل حسین پرویز وغیرہ کے تبصرے ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ حمایت اللہ کی شعری تخلیقات پر مشتمل ہے۔

کتاب میں حمایت اللہ کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ دکنی اردو کی چاشنی اور دلکشی کا چہار دانگ اعتراف کرتا ہے۔ حمایت اللہ نے اپنی تحریروں میں دکنی اردو کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ دکنی طنز و مزاح کے میدان کی ایک ممتاز شخصیت رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے مضمون ح سے حیدرآباد، حمایت اللہ اور حس مزاح میں لکھتے ہیں:

حیدرآباد اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں ایک ایسا فنکار موجود ہے جس نے مزاح پیدا کرنے کے سارے حربوں کو اختیار کر رکھا ہے۔ وہ ایک بہترین اداکار اور

بہترین مزاح کار تو ہیں ہی ایک بہترین مزاحیہ شاعر بھی ہیں بلکہ میں تو انھیں دکنی زبان کا آخری مستند مزاحیہ شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ (ص 31)

حمایت اللہ کی حمایت میں لکھے سارے مضامین میں ان کی شخصیت اور فن کی کئی پرتیں کھلتی چلی گئی ہیں۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے انھیں حیدرآباد کی رونق، ڈاکٹر رشید موسوی نے قلندر، لیکھ ٹنڈن نے حرکیاتی شخصیت، اعجاز قریشی نے چار مینار کے شہر میں قطب مینار، منظور الامین نے ایک منفرد شخصیت، ساجد اعظم نے قد آور تہذیبی شخصیت سے تعبیر کیا ہے۔ حمایت اللہ کی شاعری بھی دکنی رنگ سے شرابور ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کریں:

یہ ارماناں تھے میرے، منتاں تھے اب ملک بھر میں
امن رہنا محبت دوستی رہنا تھا گھر گھر میں
ذرا سوچو وہ دن جب ہم کو انگریزاں لڑاتے تھے
لڑاکو ہم کو آپس میں حکومت چلاتے تھے
خود آپ کی بیوی بھی چاہتی ہے تلنگانہ
اجی آپ سے عقلمند ہے آپ کا زنانہ

ان کی شاعری میں حیدرآبادی تہذیب وثقافت کی خوشبو بکھری ہوئی ہے۔ انھوں نے اردو زبان، گھریلو معاملات، دکن کے سیاسی حالات، ملک کی صورت حال وغیرہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب دکنی اردو کو فروغ دینے والی اتنی عظیم شخصیت کو ایک اچھا خراج عقیدت ہے۔ کتاب اچھی چھپی ہے اور پروف کی غلطیوں سے پاک ہے۔ امید ہے کہ یہ اردو داں حلقے میں مقبول ہوگی۔

محبوب و نذیر فنکار بے نظیر (محبوب راہی، نذیر فتح پوری)

مصنف: ڈاکٹر عظیم راہی
صفحات: 176، قیمت: 200 روپے
ناشر: اسباق پبلی کیشنز، پونے
مبصر: اشفاق احمد عمر، ریسرچ اسکالر
سی آئی ایل، ایس ایل، جے این یو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'محبوب ونذیر فنکار بے نظیر' ڈاکٹر عظیم راہی کا الگ الگ وقت میں لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں محبوب ونذیر کے بہت سے تشنہ پہلوؤں سے قاری کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ موصوف نے دونوں حضرات کی کچھ اہم کتابوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ بھی شامل کتاب ہیں۔

ڈاکٹر عظیم راہی نے کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے کا نام 'حصہ محبوب' جس میں تقریباً 15 مضامین ہیں ہر مضمون الگ نوعیت کا ہے۔ ان میں محبوب راہی پر لکھی ہوئی کتابوں پر تبصرہ بھی ہے جسے عظیم راہی نے الگ الگ اوقات میں کیا ہے۔ ساتھ ہی محبوب راہی کی شخصیات پر جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ لائق داد ہیں جو محبوب راہی کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں شامل ڈاکٹر محبوب راہی۔ پیش رفت کے آئینے میں، بند مٹھی کے بھرم، ڈاکٹر محبوب راہی۔ ادب کی ایک کثیر الاشاعت شخصیت، ڈاکٹر محبوب راہی بحیثیت بچوں کا شاعر، ڈاکٹر محبوب راہی: مثبت رویوں کا ناقد ومحقق، مکتوبات مظفر حنفی بنام محبوب راہی، ان تمام مضامین میں عظیم راہی نے محبوب راہی کی مکمل شخصیت ان کی شاعری، ادبی زندگی، ادبی کارناموں اور کچھ خطوط پر طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور کچھ ناقد ومحقق، جیسے وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، مظفر حنفی، حقانی القاسمی جیسے چوٹی کے نقادوں کی آرا کے ساتھ محبوب راہی کی شخصیت کو قاری سے روشناس کرانے کی اچھی سعی کی ہے۔

اس حصے میں کچھ کتابیں جو الگ الگ وقت میں محبوب راہی پر لکھی گئی ہیں یا خود ان کی تصنیف ہیں ان پر مصنف نے اپنی بساط بھر اچھی گفتگو کی ہے۔ جن میں "تیری آواز کی مدینے والے، سرمائے نجات، ڈاکٹر محبوب راہی اناپ شناپ کے پس منظر میں، تجزیات و تعبیرات، ڈاکٹر محبوب راہی ایک مطالعہ، الحمدللہ و برلب کوثر، غزل کے بعد، سفر ہے شرط، اردو کا سفر۔ دیر و حرم تک" وغیرہ کتابیں شامل ہیں۔

حصہ دوئم کو موصوف نے نذیر کے نام کیا ہے۔ اس میں تقریباً گیارہ مضامین ہیں جس میں نذیر فتح پوری کی شخصیت 'لمحوں کا سفر کے آئینے میں'، سہ ماہی (پونہ) کا رشید اعجاز نمبر، نذیر فتح پوری کی مطبوعات (1998) پر ایک نظر، (اس میں عظیم راہی نے موصوف کی چار اہم کتابوں کی اہمیت وافادیت سے ہم سب کو روشناس کرایا ہے) جن میں (الف) جگن ناتھ آزاد، ایک مستقل ادارہ (ب) اردو افسانے کی مقبول ترین آواز (ج) ریگ رواں (د) نذیر فتح پوری ایک دوست ایک شاعر وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نذیر فتح پوری 'ریزہ ریزہ دل' کے آئینے میں، 'شعرائے پونہ ایک تحقیق' (منور پیر بھائی کے نام خط)، پونہ میں اردو افسانہ......ایک تحقیق، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ژرف گوئی، آزاد بنام نذیر (نذیر فتح پوری کے نام خط)، پونے سے رانچی کا سفر، ادبی مضامین 'اعتراف' کا جائزہ، نذیر فتح پوری کی مجموعی خدمات پر ایک نظر وغیرہ شامل ہیں۔

اس حصے کے کچھ مضامین میری دلچسپی کا باعث بنے جن میں 'پونہ میں اردو افسانہ......ایک تحقیق'، 'شعرائے پونہ ایک تحقیق' یہ ایسے مضامین ہیں جو قاری کو نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اصل میں یہ دو الگ الگ کتابیں ہیں اس حصے میں شامل ایک مضمون ریگ رواں ہے جو نذیر صاحب کے ماہیوں کا مجموعہ ہے۔ اردو کی یہ صنف زیادہ مقبول تو نہ ہوئی لیکن اس صنف پر خامہ فرسائی کرنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ بقول حیدر قریشی "اردو ماہیے کی تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے نذیر فتح پوری کا یہ اعزاز بھی معمولی نہیں ہے کہ ماہیا نگاری کے نام سے جب غلط وزن کی بے راہ روی پھیل رہی تھی تب انھوں نے درست وزن کو اپنا کر اس بے راہ روی کا سدّ باب کیا"

نذیر فتح پوری کوئی محتاج تعارف شخصیت نہیں۔ انھوں نے ڈراما، ناول، افسانہ اور شاعری جیسی تمام اصناف پر اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔ کتاب میں پروف ریڈنگ کے ساتھ کہیں کہیں چھوٹی موٹی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔ سرورق دیدہ زیب ہے، اور قیمت بھی مناسب ہے، ساتھ ہی کاغذ بھی بہتر قسم کا لگا ہوا ہے۔ قارئین کو اس کتاب سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوگا۔

فکشن

آواز کا سفر (افسانوی مجموعہ)

مصنف: انجم بہار شمسی
صفحات: 166، قیمت: 300 روپے
ناشر: الحسنات بک پرائیویٹ لمٹیڈ، دہلی
مبصر: ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، پروجیکٹ فیلو، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'آواز کا سفر' انجم بہار شمسی کا ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے، جسے فکشن کی دنیا میں ایک مثبت قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے میں چند افسانے ایسے بھی شامل ہیں جو پہلے بھی رسائل کی زینت بن چکے تھے، لیکن بیشتر افسانے کتاب کی اشاعت سے پہلے تک غیر شائع شدہ تھے۔ ایک اور بات جس کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے وہ یہ کہ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کیے جا چکے ہیں۔ لہٰذا اس صورت میں ان افسانوں کو 'ریڈیائی افسانہ' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ریڈیو کے ذریعے نشر کیے جا چکے ان افسانوں کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی

ضرورت کیوں محسوس کی گئی، خود مصنف کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''...دراصل ریڈیو پر کہانی لکھنا اور پڑھنا اس لیے دشوار کن عمل ہے کہ اس میں وقت کی قید ہوتی ہے۔ اپنی بات سامعین تک پہنچانے کے لیے ہمیں متعین وقت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔.....ریڈیو پر سنی کہانی کا تاثر لمحاتی ہوتا ہے۔ مگر کتاب میں لکھا ہوا پڑھ کر انسان اس سے زیادہ محظوظ ہوتا ہے۔''

بہر حال انجم بہار شمسی کا شمار اردو کے معروف فکشن نگاروں کی فہرست میں تو شامل نہیں لیکن اس کے باوجود ان کے قارئین کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لوگوں نے اپنے بچوں کے نام تک ان کے افسانوی کرداروں کے نام پر رکھے۔ اس مجموعے سے پہلے ان کے کئی ناول اور افسانے زیور طباعت سے آراستہ ہوکر شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس مجموعے میں کل چوبیں افسانے جو بالترتیب رونمائی، متاع حیات، اونچی ذات، سونی رہ گزر، نئی صبح، گمشدہ جنت، شمع حرم، کوہ نور، آگہی، ذات کا سفر، بن باس، دھوپ دھوپ سایہ، خواب اور تعبیر، کوئی ہار کر بھی جیتا، موسم رفاقتوں کا، بے خبر گرم ان کے آنے کی، کانچ کا دل، سپیدے کا پیڑ، کرچیاں، ہیرے کا سفر، ہرا سوٹ، بھابھی بیگم، سچا بندھن، نہ مکاں رہا نہ مکیں رہے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ابتدا میں خود مصنف کی زبانی مجموعے کے حوالے سے چند باتیں بیان کی گئی ہیں جس میں انھوں نے معاونین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قارئین سے یہ گزارش بھی کی ہے کہ وہ اپنے گھروں میں نئی نسل کو انگلش کے ساتھ اردو زبان و ادب سے بھی روشناس کرائیں تا کہ زبان کے ساتھ وہ اپنی تہذیب سے بھی آشنا ہوسکیں۔ اس کے بعد ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے تین مضامین 'صحت مند افسانوی ادب اور انجم بہار شمسی' از ڈاکٹر شریف احمد قریشی، 'اردو کی معروف افسانہ نگار انجم بہار شمسی' از ڈاکٹر اطہر مسعود اور 'انجم بہار شمسی ایک ممتاز افسانہ نگار' از ساحل تسلیمی بھی شامل ہیں۔ یہ مضامین ان قارئین کے لیے بے حد اہم ہیں جو مصنف یا ان کی تخلیقات سے ناواقف یا فقط نام کی حد تک واقف ہیں۔

'رونمائی' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے جس میں مصنف نے ایک ایسی ماں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے بیٹے کے لیے خوبصورت، فیشن ایبل اور مالدار بہو کی خواہاں ہیں۔ لیکن عین بارات کے موقع پر جب لڑکے کی ماں کو اس بات کی خبر ہوتی ہے کہ لڑکی اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں پکڑی گئی ہے تو وہ رشتہ منقطع کرنے کی بات کرتی ہیں لیکن بیٹا اس لیے شادی کرنے پر آمادہ رہتا ہے کہ اگر یہ خبر پھیل گئی تو اس لڑکی کی زندگی برباد ہوجائے گی۔ 'متاع حیات' میں ایسے لوگوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو اپنے نفس کی تسکین یا عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ماں کی شان میں لمبے لمبے قصیدے پڑھتے ہیں جب کہ خود اس کی ماں اپنے بیٹے کو دیکھنے اور اس سے بات کرنے کی خواہش لیے دنیا سے رخصت ہوجاتی ہے۔ 'کوہ نور' میں ایسے نوجوان کی تصویر کشی کی گئی ہے جو راتوں رات امیر بننے کی خواہش میں ہر قسم کی برائی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ مگر آخر میں سوائے حسرت و افسوس کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس مختصر سے تبصرے میں تمام افسانوں پر اظہار خیال کی گنجائش نہیں لہذا ''نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے'' کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اصلاح معاشرہ اور سماج میں پنپ رہے ان ناسوروں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے، جو ہمارے اطراف میں رونما تو ہوتے ہیں مگر اس کا خاطر خواہ اثر ہمارے دلوں پر نہیں ہوتا۔

آخر میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ انجم بہار شمسی کا یہ افسانوی مجموعہ موضوع و مواد کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ زبان نہایت صاف، سلیس اور عام فہم ہے۔ البتہ کتاب کی ضخامت کے اعتبار سے قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ مصنف کی دیگر تخلیقات کی طرح یہ تخلیق بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں پوری طرح کامیاب ہوگی۔

ببول

مصنف: تنویر اختر رومانی

صفحات: 144، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 110095

مبصر: فیروز ہارونی، C-99/3-A، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

تنویر اختر رومانی افسانہ نگار بھی ہیں، انشائیہ نگار بھی اور ترجمہ نگار بھی، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مذہبی مضامین بھی لکھے ہیں نیز بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ان کی تخلیقات برصغیر ہندو پاک کے مؤقر رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

اختر رومانی کی پیدائش بنارس میں ہوئی اور پرورش و پرداخت اور تعلیم جمشید پور، جھارکھنڈ میں۔ شاید اسی لیے ان کی تحریروں میں مشرقی یوپی، بہار اور جھارکھنڈ کے رہن سہن، عادات و اخلاق، وہاں کی سوسائٹی کے طور طریقے اور اچھائی برائی کے تمام اثرات ملتے ہیں۔

ببول اختر رومانی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس کے مرتب سعید فردوسی ہیں۔

اختر رومانی کے افسانوں کی کائنات میں ہر طرح کے کردار ملتے ہیں۔ امیر، غریب، اونچ نیچ، اعلیٰ ذات، ادنیٰ ذات، بوڑھے، جوان، چوراچکا، چڑی مار، باپ بیٹا، بھائی بہن، نوکر شاہ، کمپنی میں کام کرنے والے نوکر، مزدور، اونچے اونچے محلوں میں رہنے والے اور برتن مانجھ کر زندگی بسر کرنے والے عام لوگ، فلک نما عمارت میں آفس سجائے بزنس مین اور سڑکوں پر رکشا چلانے والے، چھوٹے چھوٹے تاجر۔ الغرض شہر اور دیہات دونوں کی اختر رومانی نے نہایت ہی عمدہ عکاسی کی ہے۔

اختر رومانی کے یہاں گاؤں میں رہنے والے اور شہروں میں جا کر بسنے والے لوگ بھی ہیں۔ ان دونوں کی بساط بھر ترجمانی انھوں نے اپنے افسانوں میں کی ہے مگر جب آپ ان کے افسانے پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ جس حسن و خوبی سے گاؤں کی ترجمانی کی ہے وہ بات شہر والے حصے میں نہیں آسکی ہے اور یہ کوئی عیب کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ ایک ادیب اپنے ذوق کے مطابق فن تخلیق کرتا ہے اس لیے کسی کا ذوق دیہاتی زندگی کو محیط ہوتا ہے اور کسی کا ذوق شہروں کو۔ اس لیے ایک ادیب سماج کے ہر طبقہ کی ترجمانی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس کا ذوق ان کا ساتھ دیتا ہے۔

رومانی کا تعلق چونکہ جمشید پور سے ہے، اس وجہ سے ان کے افسانوں میں جمشید پور کے فسادات کے ساتھ ساتھ رانچی، پارس ناتھ، کوڈرما اور ٹاٹا کمپنی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ رومانی کے افسانوں میں ٹرین میں سفر کرنے والے مسافروں کے بیگ چوری کرنے والوں، اسٹیشن میں مانگ رہے بھوکے فقیروں، اسی طرح بہار و جھارکھنڈ کے سرکاری محکموں کی بھی بہت عمدہ تصویر پیش کی گئی ہے، جہاں سرکاری عملہ اپنے محکمہ میں اور پولیس تھانوں میں کلرک سے لے کر آفیسر تک سب کرپشن کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ سب لوگ آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بجائے مجرم کو سزا دینے کے جبراً پیسہ وصول کر کے معاملے کو رفع دفع کردینا چاہتے ہیں۔ اس موضوع پر 'ڈیش بھگت' بہت ہی عمدہ افسانہ ہے جہاں ایک ایماندار مسافر جب کنڈکٹر کے ٹکٹ نہ دینے کے خلاف ایکشن لینا چاہتا ہے تو آفیسر ایکشن لینے کے بجائے مسافر کو پیسہ دے دیتا ہے اور معاملہ رفع دفع کردینا چاہتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ٹی ٹی نے میرے قریب آکر پوچھا...رجسٹر دیا ساب؟

نہیں...

میں مختصر سا جواب دے کر اس کی طرف دیکھنے لگا...

وہ بھی نہیں دے گا ساب...

سب کی ملی بھگت ہے آپس میں جتنے لوگ ہیں سب کا ہسا (حصہ) لگتا ہے۔''

اختر رومانی نے گاؤں اور دیہاتوں میں رہنے والے غریبوں، قرض تلے دبے

مظلوموں، جہیز کے بغیر شادی نہ کرپانے والی لڑکیوں کو افسانے کا کردار بنایا ہے نیز انھوں نے موجودہ دور کے ان ظالم و جابر پردھانوں اور نام نہاد سیاست دانوں کا بھی مکھوٹا اتارا ہے جو ہمدردی و غم خواری کا جھوٹا لبادہ پہن کر عام غریبوں کے منھ کا نوالا چھین کر خود کھا جاتے ہیں اور تحفظ کے نام پر غریبوں کی عفت و عصمت کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں اور ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر چند پیسوں کی خاطر غریبوں کی بیٹیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں نیز رومانی کے افسانوں میں موجودہ سماج کی بھی عکاسی ہے جس میں بیٹا باپ کو بجائے بڑھاپے کا سہارا ہونے کے مار کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر پریم چند کے 'بوڑھی کاکی'، بیدی کے 'گرم کوٹ'، منٹو کے 'کالی شلوار' اور حیات اللہ انصاری کے 'آخری کوشش' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے افسانوں میں 'مظلوم'، 'پردھان جی'، 'تیسرا طوفان'، 'جس پہ تکیہ تھا'، 'روٹی مانگتی زندگی'، 'پگلی'، 'بند مٹھی کا کرب'، 'بھروسہ'، 'ببول' وغیرہ بہت ہی عمدہ افسانے ہیں جس میں سماج کے حقیقت بیان کیا گیا ہے۔

تنویر اختر رومانی نے موجودہ دور میں بڑھ رہی بے روزگاری، کرپشن، دھاندلی اور فریب کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عہد حاضر میں تعلیم کے موجودہ نظام اور مخلوط تعلیم سے ہو رہی برائی کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس میں اخلاقی گراوٹ کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔

تنویر اختر رومانی نے اپنے افسانوں میں پلاٹ اور کردار پر سب سے زیادہ محنت کی ہے۔ انھوں نے جب کسی فقیر کا ذکر کیا ہے تو کردار کے موافق الفاظ کا استعمال کیا ہے اور جب کسی مظلوم و مقہور کا ذکر کیا ہے تو اس کی مناسبت سے ہی پلاٹ کا استعمال کیا ہے۔

تمام افسانوں کو پڑھنے کے بعد مجھے جس بات کا بار بار احساس ہوا کہ تنویر اختر رومانی نے بہت ہی بہترین منظر کشی کی ہے اور کچھ افسانے نہایت ہی عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔ افسانے پڑھتے ہوئے کئی بار آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور یادوں کے ایک لامتناہی سلسلہ میں جانے کو جی چاہتا ہے۔ جو ایک فنکار کے کمال فن کا ضامن ہیں۔ لیکن کچھ ایک افسانوں کو چھوڑ کر عموماً افسانوں کے نام اور پلاٹ میں خاصا اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ افسانے کے ہیرو کے ارد گرد ہی گھومنا چاہیے جبکہ ببول کے افسانے پڑھنے کے بعد یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ افسانے کا نام کیا تھا اور کردار کا نام کیا تھا۔ اور کبھی کبھی افسانے کے ہیرو پر افسانے کا ماحول ہی بھاری پڑ جاتا ہے اور کبھی دونوں گڈمڈ ہو کر آپس میں برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔

ایسا شاید اس وجہ سے ہے کہ یہ رومانی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جیسے جیسے پختگی آئے گی ویسے ویسے کردار میں بھی پختگی آتی جائے گی۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ افسانوی مجموعہ ببول موجودہ وقت اور حالات کے لحاظ سے نہایت عمدہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں سماج و معاشرہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بوڑھے، جوان، طالب علم اور اساتذہ کے ذوق کی مناسبت سے افسانے موجود ہیں۔

مکتوبات

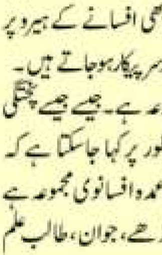

نام کتاب: **محبت نامے** (خطوط)

مرتب: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات: 303 ، قیمت 300 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ادبی دائرہ اعظم گڑھ

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف

علامہ اقبال اسٹریٹ میاں سرائے سنبھل، یوپی

خطوط و مکتوبات پر مشتمل 'محبت نامے' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی کاوش اس وقت برائے تبصرہ میرے پیش نظر ہے۔ موصوف اردو کے ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے بہت سی کتابوں پر تبصرے، مقدمے، دیباچے اور پیش لفظ لکھنے کے ساتھ ہی تقریباً تین درجن کتابیں بھی تصنیف و تالیف کی ہیں۔ ان میں ترجمے بھی ہیں اور تحقیق و تدوین کے شاہکار بھی۔ جن میں دس سے زیادہ کتابیں علامہ شبلی کے تعلق سے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کو بجا طور پر شبلی شناس کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔ زیر نظر تصنیف آپ کے نام لکھے گئے اردو اہل قلم کے خطوط کا ایسا گراں قدر مجموعہ ہے، جس میں اردو ادب کے سرخیل واعیان کے بڑے اہم خطوط شامل ہیں۔ جن کو اردو ادب کا اہم سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان خطوط سے تصنیف و تحقیق کے میدان میں آنے والے حضرات بہت کچھ رہنمائی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان خطوط کی انفرادیت، افادیت اور اہمیت کا دعویٰ خود صاحب کتاب نے بھی کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں 70 مکتوب نگاروں کے 320 خطوط شامل ہیں۔ جو 1986 سے 2015 کے درمیان الیاس اعظمی کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، پروفیسر اکبر رحمانی، ڈاکٹر سید عبدالباری، شبنم سبحانی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، سید حامد، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر خلیق انجم، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر خورشید نعمانی، ڈاکٹر ابرار اعظمی، رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر سفیر اختر، ڈاکٹر جمیل جالبی اور شبیر احمد میواتی جیسے سرخیل علم و ادب کے مکتوبات شامل ہیں۔ ان خطوط سے جہاں اعظمی صاحب کے وسیع التعلقات ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ وہیں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ موصوف تصنیف و تالیف کے نہایت مصروف ترین ذوق سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ہی مراسم و تعلقات کو برقرار و استوار رکھنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ آپ آنے والے خطوط کا نہ صرف مطالعہ ہی کرتے بلکہ پابندی کے ساتھ ان کے جوابات تحریر کرتے اور پھر ان خطوط کو سنبھال کر بھی رکھتے۔ زیر نظر مجموعہ جس کا زندہ و روشن ثبوت ہے۔

کتاب میں شامل خطوط نگار حضرات پر نظر ڈالنے پر ڈاکٹر آذر میدخت پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مولانا اسیر ادروی، پروفیسر اصغر عباس، مولانا سید جلال الدین عمری، نواب رحمت اللہ خاں شیروانی، پروفیسر شارب ردولوی، ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر عبدالستار دلوی، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا عزیز الحسن صدیقی، محمد انعام اللہ رشادی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی اور ڈاکٹر ہاشم قدوائی جیسے عظیم ناموں سے شناسائی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعظمی صاحب کے تعلقات ملت و سماج کے ہر طبقے اور ہر مکتب فکر کے اہل علم و قلم سے رہے ہیں۔ جن میں عالم دین بھی ہیں، ادباء و شعراء بھی، دانشوران بھی ہیں تو سیاست دان بھی۔ مذہبی جماعتوں سے وابستہ حضرات بھی ہیں اور اہل زہد بھی، غرض کہ یہ کتاب مختلف النوع قلم کاروں کے رشحات علمی سے سجا ہوا ایک ایسا حسین و خوبصورت گلدستہ ہے جس کو بجا طور پر خطوط کی کہکشاں کہا جا سکتا ہے۔ کتاب کی افادیت کا اضافہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کی تاریخ پیدائش اور وصال فرما جانے والے حضرات کی تاریخ وفات بھی درج کر دی گئی ہے۔

کتاب کو بہت ہی سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک ہی شخصیت کے تمام خطوط ایک ساتھ ترتیب وار دیے گئے ہیں۔ جس سے ایک طرح کا تسلسل قائم ہو گیا ہے۔ وہیں خطوط کا شمار بھی دیا گیا ہے۔ جس سے بآسانی اندازہ ہو رہا ہے کہ کس شخصیت کے کتنے خطوط اس کتاب میں زینت قرطاس ہیں۔ مکتوب نگار حضرات کو حروف ابجد کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ جس سے نام تلاش کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور ایک طرح کا ان کا حسن ترتیب بھی ہے۔ عموماً خطوط کے اس طرح کے مجموعے دوسرے حضرات کے ذریعے مرتب کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ خود مکتوب الیہ کی ترتیب دی ہوئی ہے۔ اس لیے تدوینی حیثیت سے اس کے کچھ زیادہ ہی بہتر ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

کتاب کی خوبیاں اپنی جگہ مگر اس میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جس کا اعتراف خود صاحب کتاب نے بھی کیا ہے۔ کتاب میں شامل کچھ خطوط ایسے بھی ہیں

جو سوالیہ انداز یا پھر کسی مطالبے کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ ان میں تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ نظر کے سامنے وہ خط بھی ہو جس کے جواب میں یہ مکتوب تحریر کیا گیا ہے۔ یہ انسان کے تجسس کا جذبہ ہے جس کی وہ فطری اعتبار سے تسکین چاہتا ہے۔ بہر حال کتاب میں شامل خطوط کی اہمیت اپنی جگہ۔ اور یہ اپنی اسی اہمیت کی بنا، پر اس لائق ضرور ہیں کہ اہل ذوق حضرات نہ صرف ان کا مطالعہ ہی کریں بلکہ ان سے کچھ حاصل بھی کریں۔ جو اس کتاب کے شائع کرنے کا مقصد بھی ہے۔ مبصر کو اس کا یقین ہے کہ شائقین خطوط اس کتاب کو خرید کر اس کا بغور مطالعہ کریں گے۔ اور پوری طرح اس سے لطف اندوز و مستفیض ہوں گے۔ عمدہ کاغذ پر طبع شدہ اس کتاب کی قیمت تین سو روپے مناسب ہی ہے۔ کتاب ناشر کے ساتھ ہی "دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ" سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

تعلیم

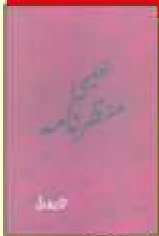

تعلیمی منظرنامہ

مصنف: محمد حسن فاروقی

صفحات: 87، قیمت: 80 روپے، جنوری 2016

ناشر: دلکش پبلی کیشن، مالیگاؤں

مبصر: نور الصباح، مکان نمبر 2282، جی ٹی بی نگر، ہڈسن لین، نئی دہلی 9

قوموں کی زندگی اور اس کے عروج و زوال کا انحصار اس ملک کے بچوں پر ہے جب ہم کسی ملک کے عروج و زوال اور ان کی ارتقائی منزلوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے پس منظر میں تعلیم ہوتی ہے۔

تعلیم ہی ایک ایسی روشنی ہے جو انسانی ذہنوں سے تاریکیاں دور کرتی ہے، صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے، اور اعتماد کو قائم رکھتی ہے۔ اوائل عمری میں بچے کائنات اور زندگی کے بارے میں انتہائی متجسس ہوتے ہیں اور یہ تجسس تعلیم کے ذریعے سے دور ہوتا ہے۔ اس ضمن میں والدین کی فہم و فراست اور ان کی نگہداشت و تربیت بھی ان کو زبان عطا کرتی ہے۔

مگر موجودہ زمانے کے فرسودہ نظام تعلیم نے بچوں کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے کیونکہ ہماری قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح نظام تعلیم بھی گوناگوں مسائل کا شکار ہے۔ انھیں مسائل تعلیم کی طرف زیر تبصرہ کتاب 'تعلیمی منظر نامہ' میں موصوف نے اشارہ کیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں دس مضامین ہیں جن میں حق تعلیم کا قانون، تنقیدی جائزہ، اردو ذریعہ تعلیم اور عصری تقاضے، تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں، طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما، اردو ذریعہ تعلیم: اساتذہ اور والدین کی ذمہ داریاں، تصویروں کے ذریعے تدریس، اسکول لائبریری اور اس سے استفادہ کی تدابیر، مجوزہ تعلیمی پالیسی اور ہماری ذمے داری، پری پرائمری تعلیم: ایک سرسری جائزہ اور نئی تعلیمی پالیسی پر ایک نظر۔

مندرجہ بالا مضامین مختلف اوقات میں مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے تعلیم سے متعلق مسائل پر انتہائی دیدہ دلیری سے کام لیا ہے۔

'حق تعلیم کا قانون: تنقیدی جائزہ' میں انھوں نے بچوں کی مخنت اور لازمی حصول تعلیم کے قانونی حق کے بارے میں منظور شدہ ایکٹ کے متعلق تبصرہ کیا ہے اور اس کی مخالفت و موافقت کرنے والوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اتر پردیش اور مہاراشٹر میں پرائمری اسکولوں کی تعداد اور ان بچوں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں جو اسکول نہیں جاتے۔

'اردو ذریعہ تعلیم اور عصری تقاضے' کے عنوان کے تحت انھوں نے اردو کے اہم مسائل اور اس کے ممکنہ حل کو بھی پیش کیا ہے کہ محض اداروں کی کثرت کافی نہیں بلکہ معیار زیادہ اہمیت کا حامل ہے، مختلف مسائل کو پیش کرتے ہوئے اہل اردو کی کشادہ دامنی کو بھی خطرہ ٹھہرایا کہ اگر اردو اس طبقے کا مزاج 'ترک' رہا تو اردو اپنی شیرینی اور شناخت کھو دے گی کیونکہ اردو میں انگریزی لفظ کے متبادل موجود ہونے کے باوجود انگریزی الفاظ کو اپنا لیا گیا ہے۔

اردو کے اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہماری مادری زبان انتشاری دور سے گزر رہی ہے اور یہ انتشار طالب علموں کو خلفشار میں مبتلا کر رہا ہے کیونکہ اردو سے فارغ التحصیل طلبہ بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے کہ تمام مدرسوں میں یکساں نظام تعلیم کے نصاب ہونے چاہئیں کیونکہ اردو اسکولوں اور مشنری اسکولوں کے بچوں میں خلیج پیدا ہو جاتی ہے اور اردو اسکولوں کے بچے احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں پھر نہ وہ اپنی موجودہ تعلیم پر توجہ دے پاتے ہیں اور نہ ہی دوسری تعلیم کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔ نتیجتاً بے روزگاری کے مسائل ان کے سامنے کسی وحشی درندے کے مانند ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نئی نسلوں کے مابین احساس کمتری اور بے روزگاری کی خلفشاری کس طرح سے در آئی تو اس کا تذکرہ انھوں نے 'تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں' کے ضمن میں کیا ہے جو اساتذہ اور والدین کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جس کا عصری نظام تعلیم میں فقدان ہے۔

غرضیکہ یہ کتاب جہاں طالب علموں کے لیے مفید ہے وہیں اساتذہ کے لیے بھی کارآمد ہے۔ یہ نہ صرف ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی بلکہ عوام کے لیے بھی درجہ خاص کا سبب بنے گی۔

شاعری

غزال شب

شاعر: ندیم احمد

صفحات: 96، قیمت: 200 روپے

ناشر: رہروان ادب، کولکاتا

مبصر: محمد عثمان احمد، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

غزال شب ندیم احمد کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ندیم احمد کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ندیم احمد تنقید میں اہم مقام رکھتے ہیں آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'بازیافت' 2005 میں شائع ہوا۔ ندیم احمد نے انشاء اللہ خاں انشاء پر بھی کام کیا ہے اور انشاء اللہ خاں انشاء کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب تحریر کی ہے۔ ندیم احمد نظری تنقید اور کلاسیکی ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ندیم احمد نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی ادب سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ہند و پاک کے معاصر شعرا میں انھوں نے اپنا ایک منفرد مقام بنایا۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 45 غزلوں اور 16 نظموں پر مشتمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محقق اور نقاد اکثر منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے تخلیق میں بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں، لیکن ندیم احمد کے شعری مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ یہ شاعری منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے نہیں کی گئی، بلکہ شاعر کا تجربہ، شعری ماہیت اور رنگا رنگ خیالات یہ بتاتے ہیں کہ وہ شاعری کے رموز سے واقف ہیں اور انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ شعر کس طرح بنتا ہے۔ ندیم احمد نے نئے استعارات اور نئی لفظیات سے بخوبی کام لیا ہے:

تمھارا غم ملا ہے لون میں تو — کروں گا قسط میں بھگتان سارا
میاں انسان کی خرمستیوں کا — کریڈٹ لے گیا شیطان سارا

لون اور کریڈٹ کا استعمال انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا فیشن اور مقلدانہ روش نہیں بلکہ ذاتی تجربہ، اظہار کی ندرت، جدت فکر اور جدید طرز اظہار کا پتہ دیتے ہیں۔ غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ہیئت کے تجربے بھلے ہی قبول نہ کیے ہوں لیکن اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ، اس میں عشق و عاشقی کے مضامین کے علاوہ، فکری مضامین، اخلاق، زبان کے اعتبار سے سادگی، صنعتوں اور محاوروں کا استعمال بھی ملتا ہے، لطف یہ ہے کہ ایک ہی غزل میں مختلف موضوعات

بھی ملتے ہیں۔ ندیم احمد غزل کی اس خوبی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعے کی پہلی غزل جس کے دو اشعار پیش کیے گئے ہیں اسی غزل میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

کسی کی یاد میں میری طرح ہی　　پڑا ہے دشت بھی ویران سارا
مزہ لینے میں وہ شامل تھا لیکن　　مجھے بھرنا پڑا تاوان سارا
وہ ہر ذرے میں ہے موجود تو پھر　　ذرا سا دیکھ اور پہچان سارا

ہر شاعر اپنے زمانے اور گزرے زمانے کے شاعروں سے اثر قبول کرتا ہے۔ ندیم احمد نے اپنے شعری مجموعے کا انتساب ظفر اقبال کے نام ان لفظوں میں کیا ہے "غالب کے بعد اردو کے سب سے بڑے تجربہ کوش شاعر ظفر اقبال کے نام"۔ اس انتساب سے ندیم احمد کے فکری سوتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور مستقبل میں ندیم احمد سے مزید نئے امکانات اور ایک اور ہی طرح کی تر و تازگی کی توقع کی جا سکتی ہے:

رفتہ رفتہ ہم نے سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا
تنہائی میں خوب مزے تھے بھیڑ لگا کر کرتے کیا
جب ایک کمرہ ہی وحشت کو ہے کافی
تو پھر صحرا پرانا کیا کروں گا

ندیم احمد کی غزلوں میں کلاسکی رنگ بھی ملتا ہے مثلاً ان اشعار کو دیکھیے:

ٹک ایک نظر دیکھ لے آشفتہ سروں کو　　کچھ سوختہ جاں در پہ ترے آئے ہوئے ہیں
ہماری آنکھ تو وحشت میں رات جاگے ہے　　ہرن فضول میں نافہ بچا کے بھاگے ہے
موت کچھ میرے لیے لائے تو لائے شاید　　زندگی کا تو ہر اک ڈھب مرا دیکھا ہوا ہے

زیر تبصرہ شعری مجموعے میں غزلوں کے علاوہ 16 نظمیں بھی ہیں، ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے موضوعات تو آس پاس سے لیے گئے ہیں لیکن ان کے پیش کرنے کا انداز شاعر کے احساسات کا پتہ دیتا ہے۔ ندیم احمد نے نظموں میں انسان کے داخلی احساسات کو بھی پیش کیا ہے، مثلاً نظم 'میں= 'بوہیمین'۔ یوں تو سبھی نظمیں اچھی ہیں لیکن 'بدن'، 'قدیم کھیل'، 'مٹی کی کاشت'، 'ہمارے درمیاں اب کچھ نہیں باقی' اور 'نارسائی' نظمیں خاص طور پر متاثر کرتی ہیں۔ نظم 'ہمارے درمیاں اب کچھ نہیں باقی' کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے:

ہمارے درمیاں اب کچھ نہیں باقی / تجھے جو چاہیے تھا/مل گیا شاید
تیری خواہش مکمل اور/مری خواہش بھی آسودہ

بہرحال کتاب کی طباعت و سرورق دیدہ زیب ہے۔ مجھے امید ہے کہ ندیم احمد کا شعری مجموعہ 'غزال شب' ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور شعری مجموعوں کے ہجوم میں اپنی الگ شناخت قائم کرے گا۔ میں ندیم احمد کو ان کے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

رسائل و جرائد

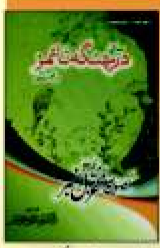

سہ ماہی، **دربھنگہ ٹائمس**، دربھنگہ
(اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر) جنوری 2017 تا ستمبر 2017
مدیر: ڈاکٹر منصور خوشتر
صفحات: 400، قیمت: 300 روپے
ناشر: شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ، بہار
مبصر: اقبال حسن آزاد، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر 811201

ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلہ 'دربھنگہ ٹائمس' کا 'اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر' پیش نظر ہے۔ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو ہمیشہ سے تنازعات کا شکار رہی ہے۔ کسی نے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا اور کسی نے اس کی گردن زنی کا حکم صادر فرمایا، کسی نے اسے چاول پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن قرار دیا اور کسی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا۔ حقیقت یہ ہے غزل روز اول سے ہی ایک محبوب صنف سخن رہی ہے اور ہر دور میں اس کے چاہنے والے ایک کثیر تعداد میں موجود رہے ہیں۔

اکیسویں صدی کا آغاز عالمی سطح پر نہایت مایوس کن رہا۔ اس عرصے میں نہ تو قابل ذکر ناول لکھے گئے نہ افسانے اور نہ ہی شاعری کے عمدہ نمونے سامنے آئے ہیں۔ ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہے۔ قابل مبارک باد ہیں ڈاکٹر منصور خوشتر جنھوں نے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے یا یوں کہیے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک کر اس میں لہریں پیدا کر رہے ہیں۔ "دربھنگہ ٹائمز" کا اکیسویں صدی میں غزل نمبر اسی کی مثال ہے۔ چار سو صفحات پر محیط یہ نمبر ادب کا ایک نیا سنگ میل ہے۔

اداریہ میں ڈاکٹر منصور خوشتر رقم طراز ہیں کہ:

'دربھنگہ ٹائمز' کی ادارتی ٹیم نے روایتی طور پر 'اکیسویں صدی میں غزل نمبر' نکالنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ غزل کے بدلتے تمام بحثیں سامنے آئیں، تاکہ علمی اور تنقیدی سطح پر بدلی ہوئی غزل سامنے آسکے۔ اس کی ہیئت و فارم کی مکمل داستان سامنے آئے اور ساتھ ہی وہ ادبی منظر نامہ بھی اپنی جھلکیاں دکھائے جو آنے والے پچاس برسوں میں معرض وجود میں آئے گا، لیکن غزل کے مکمل بدلتے منہاج و معیار کی عکاسی کے لیے یہ غزل نمبر نا کافی ہے، ہمیں اس کے اعتراف میں کوئی جھجک نہیں۔"

مدیر نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی نمبر حرف آخر نہیں ہوتا۔ مضامین کے حصول کے لیے کتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے یہ ایک ادبی رسالے کا مدیر خوب اچھی طرح جانتا ہے۔

اس نمبر میں سب سے پہلے استاد شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزی کی نظم بعنوان "اردو غزل اکیسویں صدی کی دہلیز پر" شامل ہے جو معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے کامیاب ہے۔ اس شمارے میں شارب، مناظر عاشق ہرگانوی، علی احمد فاطمی، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر رئیس انور، حقانی القاسمی، سید احمد قادری، ڈاکٹر اشرف کمال انجینئر محمد عادل، ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر احمد کفیل، محمد اکرم خاور، شارق عدیل، ڈاکٹر احسان عالم، غلام نبی کمار، محمد داؤد محسن، صدف اقبال، صالحہ صدیقی، رضیہ پروین، ایمن تنزیل، جاں نثار معین، صفدر امام قادری، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ابوبکر عباد، خورشید حیات، اقبال واجد، محمد فرقان سنبھلی، الیاس بابر، شبنم پروین، ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر منصور خوشتر، شاہد الاسلام، رشید جہاں انور اور ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں شامل ہیں۔

اس نمبر کے نکالنے سے قبل ڈاکٹر منصور خوشتر نے فیس بک پر ایک مکالمہ قائم کیا تھا جس میں چار سوالات پیش کیے گئے تھے۔

(1) کیا جدید اردو شاعری درپیش مسائل اور حالات سے مطابقت نہیں رکھتی؟ آخر کیا وجہ ہے کہ جدیدیت کی تحریک سے وابستہ شاعر سیاسی موضوعات سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا سیاست کو نظر انداز کر کے کوئی ادب زندہ رہ سکتا ہے؟

(2) دہشت گردی، عالمی سیاست کا بدلتا چہرہ، امریکہ اسرائیل جیسے ممالک کی تاناشاہی، انسانیت کا زوال۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ موضوعات ناول اور فکشن کا حصہ تو بنتے رہے لیکن ہمارے بڑے جدید شعرا کرام ایسے موضوعات کو شاعری کے لیے حرام تصور کرتے رہے؟

(3) کیا آپ برصغیر میں ان دنوں کی جانے والی شاعری سے مطمئن ہیں؟ غالب و میر کے بعد اقبال، جگر، فانی کے بعد اسعد بدایونی، زیب غوری، عرفان صدیقی کے بعد آج غزل کا جو مزاج و معیار ہے، اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟ ظفر اقبال تو عرفان صدیقی اور زیب غوری کو بھی شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ ہندوستانی شاعری ان کی نظر میں کمزور ہے۔ یہ بات آپ کی نظر میں کس حد تک صحیح ہے؟ کیا یہ ایک

شاعر کا دیوالیہ پن نہیں کہ وہ اردو غزل کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کرنے کے بعد ہندوستانی شاعری کا مذاق بنا رہا ہے؟ اس لیے اسی سے ملتا جلتا ایک سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی غزل حقیقت میں ہندوستانی غزل سے بہت آگے ہے؟

(4) پسند، ناپسند کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ غالب سب کی پسند تھے لیکن یگانہ کو پسند نہیں آئے۔ آپ اتنا کیجیے کہ زندہ شاعروں میں اپنی پسند کے کچھ شاعروں کے نام بتا دیجیے۔ آپ کو کیوں پسند ہیں؟ اس کی تفصیلات لکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو پوری آزادی ہے۔

اس مکالمے میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

مشرف عالم ذوقی، معین تابش، کامران غنی صبا، سلمان عبد الصمد، احمد سہیل، مستفیض احمد عارفی، تبسم فاطمہ، اقبال حسن آزاد، خورشید حیات، ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن، نسترن احسن فتیحی، بیسی کرن، غلام نبی کمار، نور معین علی حق، ابن عظیم فاطمی، اصغر شمیم، ارشد عبد الحمید، فیضان ضیائی، انعام اعظمی، ایم آر چشتی اور انجمن اختر۔

علاوہ ازیں اس نمبر میں غزلوں کی کہکشاں بھی سجائی گئی ہے جس میں نئے پرانے کل ملا کر ایک سو دس شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ شاعروں کی اس طویل فہرست میں مرحوم بھی ہیں اور موجود بھی، نئے بھی ہیں اور پرانے بھی کہنہ مشق بھی ہیں اور نو مشق بھی۔ لیکن ترتیب میں بزرگوں کی بزرگی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ ایک قابل گرفت بات ہے۔

ان مشمولات کے علاوہ زیر نظر شمارے میں منظوم تبصرے، تبصرے اور قارئین کے خطوط بھی شامل ہیں جو اس کی اہمیت اور وقعت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'دربھنگہ ٹائمز' کا 'اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر' ایک اہم ادبی دستاویز ہے اور ہر باذوق قاری اس کا مطالعہ کرنا چاہے گا۔ خاص طور پر ریسرچ اسکالرز کے لیے تو یہ نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ترسیل (سالانہ تحقیقی و تنقیدی مجلّہ) – تیرہواں شمارہ

مدیر اعلیٰ: پروفیسر نیلوفر خان، مدیران: عرفان عالم، الطاف انجم

صفحات: 232، قیمت: 150 روپے

ناشر: ناظمہ، نظامت فاصلاتی تعلیم، یونیورسٹی، سری نگر کشمیر

مبصر: عشرت سلطانہ، مدینہ ہاؤس، ریلوے گیٹ، احمد نگر کالونی، ظہیر آباد (تلنگانہ)

ترسیل عہد حاضر کا تحقیقی و تنقیدی اور تخلیقی ادب کا معیاری مجلّہ ہے۔ نہایت دیدہ زیب اور اپنے مشمولات کے مزاج و معیار کے اعتبار سے عالمی اہمیت کا حامل ہے۔ اداریہ بے حد فکر انگیز ہے۔ اردو زبان ہماری تہذیبی اور ثقافتی روایات اور اقدار کی امانت دار ہے۔ تہذیب و ثقافت کی مختلف توضیحات و توجیہات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر کسی ادیب، مورخ، دانشور اور فلسفی نے ان میں اجتماعی خمیر کے نہاں اور عیاں ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ اس اجتماعیت میں بہر صورت سماج کے ہر شخص کے انفرادی تفاعل کے اینٹ گارے کی بو باس شامل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اردو زبان ہماری اجتماعی تہذیب و ثقافت کا شناخت نامہ ضرور ہے۔ لیکن اس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف ادوار مختلف اشخاص نے جو انفرادی خدمات انجام دی ہیں ان سے کوئی بھی صرف نظر نہیں کر سکتا بلکہ انہی انفرادی کاوشوں اور کوششوں سے یہ زبان آج مانندِ گلستان اپنی شادابی اور نکہت سے سارے برِ صغیر کو معطر کر رہی ہے۔

اداریہ کے مطابق یہ وقت حقائق سے چشم پوشی، خوش گمانی یا الزام تراشی کا نہیں ہے۔ خود احتسابی اور مطالعے کا ہے۔ معیاری رسائل کے اجرا اور اپنے دعووں کے اثبات کا ہے۔ کیا یہ نسل ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکے گی؟ ان سوالات کی روشنی میں خیر اور لذت علم کے مفاہیم اور مضمرات کے حوالے سے یہ شمارہ محبان اردو اور تشنگان علوم کے لیے علمی سیرابی کا اہم وسیلہ ہے۔ زیر بحث شمارہ (13) تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اداریہ کے بعد موت کا زندگی سے مکالمہ: بلراج مین را کا افسانہ۔ میں ناصر عباس نیر نے علامت نگاری، جدیدیت، مابعد جدیدیت، تجریدیت، اشتراکی حقیقت اور جادوئی حقیقت نگاری، فکشن شعریات، جنسی نفسیات، فاشیت، بیگانگیت، عظیم انسانی صداقت، جدلیات، لاشعوری محرکات، آئرنی، اور سسی فس جیسے عنوانات پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ اسلم آزاد اور خالد اشرف کے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔

'ترقی پسند ادبی تحریک سے متعلق' جاں نثار اختر کی ادبی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش مضمون میں انور ظہیر انصاری نے ترقی پسند تحریک، علی گڑھ میگزین، انجمن اردوئے معلی، انقلاب، احتجاجی ادب، سرمایہ داریت، تغزل، سماجی اقدار، تہذیبی تشخص، شعریات، نظمیہ آہنگ، ماضی پرستی، مارکسیت، اور اشتراکیت روشن خیالی پر تحقیقی و تنقیدی بحث کی ہے۔

مضمون 'عصمت چغتائی کی ڈراما نگاری' میں محی الدین زور کشمیری نے ترقی نسواں، تانیثیت، ڈراما، فکشن، ناول، افسانہ، ترقی پسند تحریک، جدیدیت، ہندو مسلم فسادات، شوہریت، نسائی ادب اور جنسیت کو مرکزی خیال میں رکھا۔ 'جدید فارسی شاعری کا ارتقائی سفر: ایک تجزیاتی مطالعہ' میں عابد گلزار نے عرب حکمرانیت، قدیم پارسی، پہلوی، مشروطیت، موضوعات شعر، محکوم و مجبور، سبک خراسانی، سبک ھندی، دورہ بازگشت، تکلف و تصنع، قالب شعر، تجدد پسندی، اعتدال پسندی، شعر نو، شعر موج نو، سبک جدید، شعر نوی میانہ رو اور شعر انقلاب وغیرہ موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

'علی گڑھ تحریک... نو آبادیات کے حوالے سے' مضمون میں امتیاز عبد القادر نے نو آبادیات، مغرب پرستی، تہذیبی تصادم، نشاۃ الثانیہ، نشاۃ اولین، سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، غدر ہند، اسلامی تمدن، اور علی گڈھ کالج پر تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

'مولانا ابوالکلام آزاد کے صنفی تصورات' میں ابوالکلام آزاد کی تانیثی فکر اور تصور نسواں کو مرکزی خیال بنایا گیا ہے۔

'علامہ شبلی کی فارسی غزل گوئی' میں عبداللہ امتیاز احمد نے مبالغہ آرائی، رومانیت، تغزل، جذباتیت، پیکر تراشی، حسن و عشق، سادگی، غنائیت، لطافتِ بیان اور شیریں زبان کو مرکزی خیال رکھا ہے۔ محمد امتیاز احمد اور عرفان عالم کے مضامین بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔

'پیر رومی مریدِ ہندی' مضمون میں عرفان عالم نے مثنوی مولانائے روم، تخلیقی مکالمہ، ڈیوائن کومیڈی، عشق حقیقی، رہبانیت، روحانیت، جمالیاتی نظام، جاوید نامہ، پیر رومی، فلسفہ، ہیئت، تکنیک اور وجدانی کیفیات وغیرہ پر قارئین کو غور و خوض کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کیونکہ رومی کی شاعری میں انسان دوستی اور انسان شناسی سب سے زیادہ عیاں ہے۔ رومی بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ قرآن و حدیث کے مفسر، فقہ و منطق کے فلسفی تھے۔ انھوں نے امن کی تعلیمات دی ہیں۔ ان کے کلام میں کائنات کی وحدت اور انسانی رشتوں کی معنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ثبوت میں یہ شعر ہیں:

غلط نگر ہے تری چشم نیم باز اب تک   ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک
ترا نیاز نہیں آشنائے ناز اب تک   کہ ہے قیام سے خالی تری نماز اب تک

'حکایاتِ زاغ و بلبل' کا بیانیاتی مطالعہ مضمون میں الطاف انجم نے بیانیہ، بیان، بیان کنندہ، بیانیات، واقعہ، ساختیات، مابعد جدید تنقید، راوی، قاری، کہانی، یک زمانی، دو زمانی، نشانیات اور نفسِ مطلب وغیرہ کو حکایاتِ زاغ و بلبل کی روشنی میں تحقیقی زاویہ نظر اور اپنی تنقیدی بصیرت سے سجایا ہے۔ یہ عنوان در اصل ابوالکلام آزاد کے ایک خط بعنوان 'حکایاتِ زاغ و بلبل' سے لیا گیا ہے۔

یہ مجلّہ تحقیق کے طالب علموں کے لیے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شمارے میں شائع سبھی مضامین تحقیق کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اردو ریسرچ اسکالرز کو یہ جریدہ اپنے مطالعے میں ضرور رکھنا چاہیے۔ ■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبر نامہ

قائم رہے گی این سی پی یو ایل کی خود مختاری: مہندر ناتھ پانڈے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چوبیسویں مجلس عاملہ کی میٹنگ میں وزیر مملکت کی یقین دہانی

نئی دہلی: مرکزی حکومت اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے پہلے سے زیادہ سرگرم ہے اور قومی اردو کونسل کی خود مختاری قائم رہے گی۔ ان خیالات کا اظہار وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل (اعلیٰ تعلیم) ڈاکٹر مہندر ناتھ پانڈے نے کیا۔ وہ آج انڈیا انٹرنیشنل سینٹر منعقدہ قومی اردو کونسل کی چوبیسویں مجلس عاملہ سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت کونسل کے دائرۂ اثر اور سرگرم کارکردگی سے پوری طرح واقف ہے۔ اس لیے نہ تو اس ادارے کو ضم کیا جائے گا اور نہ ختم۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مجلس عاملہ کی سالانہ میٹنگ میں وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل (اعلیٰ تعلیم) نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ نیتی آیوگ کی طرف سے دیے گئے مشورے پر خوب بحث ہو رہی ہے لیکن ہمارے وزیر جناب پرکاش جاوڈیکر اس حقیقت سے پوری طرح سے واقف ہیں کہ قومی کونسل کیا کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے اور اس کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ عام لوگوں تک اردو کے فروغ میں کونسل نے قابل تحسین کام کیے ہیں۔ 2017 میں گذشتہ برسوں کے مقابلے زیادہ بجٹ فراہم کرایا گیا ہے اور کونسل نے موبائل ایپ، ای پب وغیرہ (ذرائع ابلاغ) کی مدد سے اردو زبان کو بین الاقوامی سطح پر مشتہر کرنے کا کام کیا ہے۔ اردو زبان کی تعلیم دینے والے اساتذہ کی تنخواہیں بھی جولائی 2017 سے بڑھائی گئی ہیں۔ حکومت کونسل کے اس کام کی ستائش کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ آئندہ وہ مزید سرگرم اور فعال رہ کر اپنی ذمے داریاں نبھائے گی۔ انھوں نے واضح لفظوں میں کہا کہ اس کارگر اور سرگرم ادارے کی خود مختاری پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔ انھوں نے کہا

کہ تمام زبانیں محبت کو فروغ دیتی ہیں اور ہماری حکومت اردو زبان سمیت تمام علاقائی زبانوں کے فروغ و ارتقا کے لیے مسلسل سرگرم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنے ملک میں محبت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے پابند عہد ہیں اور اردو زبان محبت کو عام کرنے کی علمبردار رہی ہے اس لیے اردو کا فروغ حکومت کی اہم ذمے داری میں شامل ۔ انھوں نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب پرکاش جاوڈیکر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس عظیم ترین ادارے کی سالانہ میٹنگ کی صدارت میرے لیے باعث افتخار ہے۔

واضح رہے کہ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں انعقاد پذیر چوبیسویں مجلس عاملہ کی میٹنگ میں ملک بھر سے ارکان و عہدے داران آئے ہوئے تھے۔ پروگرام کے آغاز میں ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان کو کونسل کی تازہ مطبوعات کا سیٹ پیش کیا۔

بعد ازاں میٹنگ میں کونسل کی سالانہ کارکردگی بذریعہ پاور پوائنٹ پیش کی گئی۔ اس کے بعد ایجنڈے پر گفتگو شروع ہوئی جو بے حد خوشگوار ماحول میں تقریباً ایک گھنٹے تک چلی۔ اس دوران جہاں گذشتہ میٹنگ میں قائم کیے گئے اہداف کی تکمیل پر ممبران نے ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو مبارک باد پیش کی وہیں کونسل کے جملہ کارکنان کی بھی ستائش کی گئی۔ اس موقع پر اپنی گفتگو میں ڈائرکٹر قومی کونسل نے تمام ممبران اور وزیر محترم کو یقین دلایا کہ قومی کونسل نے جس طرح گذشتہ اہداف کو حاصل کیا ہے اسی طرح ابھی متعین کیے گئے اہداف کو بھی خوش اسلوبی سے انجام تک پہنچائے گی۔ ڈائرکٹر نے یہ بھی اعلان کیا کہ دسمبر میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کونسل کی بیس سالہ کامیاب کارکردگی پر محیط رہے گی۔

انھوں نے اس موقع پر ملک کی مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں بطور خاص ایڈیشنل سکریٹری ڈاکٹر ایس ایس سندھو، جوائنٹ سکریٹری و فائنینشل ایڈوائزر محترمہ درشنا ایم ڈبرال کے ساتھ دیگر افسران بھی موجود تھے۔ میٹنگ میں ایجنڈے پر بحث میں خاص طور سے پروفیسر اختر الواسع، ممبر آف پارلیامنٹ جاوید علی، ممبر آف پارلیامنٹ انور راجا، ان کے علاوہ ڈاکٹر نصرت مہدی، منوری بیگم، شائستہ یوسف، شمع خان، احتشام حسین عابدی، رفیع بھنڈاری، حذیفہ مظفر، مولانا صہیب قاسمی، محمد کلیم انصاری، حاجی اقبال خان، حسن باقر کاظمی نے حصہ لیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 2 اگست 2017

جدید ہندوستان کی تعمیر کے عہد کو صرف ایک دن تک محدود نہیں رکھنا چاہیے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں جدید ہندوستان کی تعمیر کا عہد

نئی دہلی: ہمارا ملک ہندوستان کثرت میں وحدت کا خوبصورت نمونہ ہے اور ہمیں اس ملک کو مزید بلندیوں تک لے جانا ہے۔ آج ہم سب یہاں نئے ہندوستان کا عہد لینے کے لیے جمع ہوئے ہیں، لیکن ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم سب بطور ہندوستانی اس طرح کے عہد کو ایک دن تک ہی محدود نہ رکھیں بلکہ ہمیں جدید ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر دن، ہر لمحہ اپنے آپ سے عہد لینا چاہیے۔ ہم جہاں بھی ہوں، جو بھی کام کرتے ہوں ہم سب کا فرض ہے کہ ہم وہاں صفائی کا نظم و نسق رکھیں۔ بدعنوانی، عصبیت، ذات برادری، دہشت گردی، خواتین پر ہونے والے ظلم و زیادتی اور غریبی دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ 2022 تک ہمارا ملک ایک نیا ہندوستان بن کر دنیا کے نقشہ پر جلوہ فگن ہو سکے۔ ان خیالات کا اظہار قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے آزادی کے 70 برس اور بھارت چھوڑو آندولن کے 75 برس پورے ہونے پر کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ ایک تقریب کے دوران کیا۔ اس تقریب میں کونسل کے تمام اسٹاف نے ڈائرکٹر کے ساتھ نئے بھارت کی تعمیر کے ساتھ ہی صاف ستھرے، غریبی سے آزاد، بدعنوانی، دہشت گردی، فرقہ واریت اور ذات برادری کی عصبیت سے آزاد بھارت کا بھی عہد لیا۔

تقریب سے قبل کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر (انتظامیہ) کمل سنگھ نے بھی کو اس عہد اور اس تقریب کے حوالے سے بتایا کہ ہم کس طرح مل جل کر اپنے ملک کو مزید اونچائیوں تک لے جاسکتے ہیں۔ تقریب میں قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی سمیت تمام اسٹاف نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 اگست 2017

قومی اردو کونسل میں 71 واں جشنِ آزادی کا اہتمام

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کے صدر دفتر میں 71 واں جشن آزادی جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پرچم کشائی کی اور کونسل کے عملے نے ہندوستان کا قومی ترانہ 'جن گن من' بلند آواز میں پیش کیا۔ سبھی اسٹاف نے ترنگے کو سلامی بھی دی۔ اس موقعے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ 15 اگست ہمارے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ہمارے جانثاران وطن اور شہیدوں کی قربانیوں کو یاد کرنے کا دن ہے۔ ہم ان کے ایثار وقربانی کو کبھی

فراموش نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں اردو زبان نے بہت اہم رول ادا کیا ہے اور نئے ہندوستان کی تعمیر میں بھی یہ زبان فعال کردار ادا کرے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو اخبارات ورسائل نے انگریزی حکومت کے خلاف اپنے آغاز سے ہی آواز اٹھائی۔ مولانا محمد باقر، مولانا حسرت موہانی، ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، مولوی مجید حسن جیسے عظیم صحافیوں نے اپنے اخبارات کے ذریعہ جنگ آزادی کی لو کو تیز کیا۔ ہمارے مجاہدین آزادی بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ خاں کی قربانیوں کی بدولت ملک آزاد ہوا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم 71 ویں یوم آزادی کی معنویت کو سمجھیں گے اور نئے ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں اپنا کردار نبھائیں گے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے بھی اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 اگست 2017

کونسل کے صدر دفتر میں فارسی پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: اردو زبان میں جو لطافت و شیرینی اور خوبصورتی ہے اس میں فارسی زبان و ادب کا بہت بڑا رول ہے۔ اس زبان کے لاتعداد الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ اگر ہم فارسی سے نابلد ہو گئے یا اس سے ہم نے دوری بنا لی تو اردو اتنی میٹھی اور خوبصورت زبان نہیں رہ پائے گی۔ یہ فارسی اور عربی زبان کا ہی کمال ہے کہ اردو اتنی دلکش اور خوبصورت زبان بن کر سامنے آئی ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت کو دیکھتے ہوئے کونسل فارسی کی ترویج واشاعت کے لیے کئی جہات پر کام کر رہی ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں کونسل نے فارسی کی ایسی نایاب و نادر کتابیں شائع کی ہیں جس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ فارسی پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پچھلی میٹنگ میں ہندوستان میں فارسی

ادب کی تاریخ کے حوالے سے کتاب لانے کی بات ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں پیش رفت ہوئی ہے اور اس تعلق سے ماہرین نے خاکے بھی پیش کر دیے ہیں۔ اگر اسی فعالیت کے ساتھ یہ کام ہوتا رہا تو بہت جلد یہ مسودہ کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے گا۔ انھوں نے پینل کی اس بات کو منظوری دی کہ نول کشور پریس کے ایسے متون جو اب نایاب ہیں انھیں پھر سے شائع کیا جائے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اوریجنل متون سے تقابلی مطالعہ کر کے اسے تیار کیا جائے تاکہ قاری کے سامنے بہتر اور صحت مند صورت میں پیش کیا جاسکے۔

ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ فارسی ہندوستان میں لگ بھگ چھ سو سال تک علمی زبان رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی لکھنے پڑھنے اور بول چال کی زبان فارسی تھی۔ اس اہمیت سے مختلف زبان کے بولنے والے ان کی تحریری صورت فارسی زبان ہی تھی۔ اس اہمیت کو دیکھتے ہوئے کونسل نے جو فیصلہ لیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر چندر شیکھر نے کی انھوں نے کہا کہ فارسی زبان و ادب کے تعلق سے ہم ہندوستانیوں کی جو خدمات ہیں اس کا اندازہ بیرون ملک میں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ہماری خدمات کو توقیر وعزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس میٹنگ میں پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر وجیہ الدین، پروفیسر عمر کمال الدین، پروفیسر سید حسن عباس کے علاوہ اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، جناب امتیاز احمد، جناب شہاب الدین (ریسرچ اسسٹنٹ) اور شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 جولائی 2017

کونسل کے صدر دفتر میں لسانیات پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: آج کے گلوبلائزیشن کے اس دور میں دنیا محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسی صورت حال میں لسانیات کی

اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس بدلتے عالمی منظرنامے کو دیکھتے ہوئے قومی اردو کونسل ترجیحاً اردو لغت نویسی، اصول فرہنگ نویسی اور لسانی اصول جیسے موضوعات پر مزید کام کرنا چاہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتابیں تو ادارے اور پبلشر چھاپتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کے کونسل بذات خود مختلف موضوعات پر کتابیں اشاعت کر رہی ہے۔ لیکن جو سب سے بڑا اور مشکل کام ہے وہ اردو لغت نویسی اور اصول فرہنگ نویسی کو ترتیب دینا ہوتا ہے۔ کونسل اس کام کو اپنے قیام کے زمانے سے کرتی آرہی ہے۔ گویا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کونسل اردو لغت اور فرہنگ نویسی کی اشاعت کے لیے بہت سنجیدہ ہے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ لسانیات پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کے اس اقدام سے دوسری زبانوں سے تقابلی مطالعے کے لیے یہ لغات معاون ثابت ہوں گے۔ آج کی میٹنگ میں فرہنگ آصفیہ کی تین جلدوں پر مشتمل اشاعت کے لیے پینل کے تمام ممبران نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کی خدمات کی ستائش کی۔ اتنا دیدہ زیب اور خوبصورت پرنٹنگ کے سبب اس فرہنگ کی اہمیت اور افادیت اور بڑھ گئی ہے۔ اس موقع پر پروفیسر علی رفاد فتیحی نے کہا کہ خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ من وعن شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر کلیم الدین احمد کی جامع اردو۔ انگریزی لغت اور نوراللغات بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے مرکزی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان میں اردو کا ایک بڑا مرکزی ادارہ ہے، جہاں مختلف جہات پر اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے گزشتہ بیس سالوں سے کام ہو رہی ہے۔ اس موقع پر ماہر لسانیات پروفیسر پنچانن موہنتی نے کہا کہ اردو کے حوالے سے ہندوستان میں جو بھی کام ہو رہا ہے اس میں سب سے بڑی خدمات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ہیں۔

اس میٹنگ میں پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر علی رفاد فتیحی، پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر پنچانن موہنتی، ڈاکٹر ایم جے وارثی اور جناب ملک العزیز کے علاوہ محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، جناب امتیاز احمد، محترمہ شہناز اختر اور شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 جولائی 2017

کونسل کے تعاون سے

اردو زبان میں تلفظ کی اہمیت اور نئی نسل

نئی دہلی: رسم الخط زبان کی روح ہے اس کے بغیر زبان کی بقا ممکن نہیں، اس لیے اردو کے رسم الخط کو بدل دیا جائے تو یہ زبان مرجائے گی۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے اپنے ان خیالات کا اظہار 'الحکمہ فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار بعنوان 'اردو زبان میں تلفظ کی اہمیت اور نئی نسل' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی نے اپنے رسم الخط کی حفاظت نہیں کی اس کی وجہ سے ترکی میں علوم وفنون کا ایک بڑا قدیم ذخیرہ ناقابل استفادہ ہو چکا ہے اور نئی نسل اپنے عظیم علمی ورثے سے ناواقف ہے۔ اس کے برخلاف بہت کم تعداد میں ہوتے ہوئے یہودیوں نے عبرانی زبان کو زندہ رکھا اور آج عبرانی طاقت ور زبانوں میں شمار کی جاتی ہے اور عبرانی میں لکھنے والے ایک بڑے ادیب کو نوبل انعام بھی مل چکا ہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے اردو زبان کی شیرینی، مٹھاس اور مقبولیت کے حوالے سے بہت ہی مربوط اور مبسوط گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کا حسن اس کے تلفظ میں ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے منعقدہ سمینار میں صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے شہپر رسول نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر تلفظ کی اہمیت اور معنویت کے حوالے سے گفتگو کی اور کہا کہ تلفظ کی وجہ سے کسی بھی زبان کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے اس کے لیے تلفظ پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ سمینار کے پہلے سیشن میں ڈاکٹر نفیس صدیقی، ڈاکٹر روبینہ شبنم، مشہور شاعر و ادیب جناب فصیح اکمل نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ایس فاروق نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو زبان کی لطافت اور نزاکت، شیرینی اور مٹھاس کے حوالے کے ساتھ نہایت پر مغز گفتگو کی۔ اس سیشن میں الحکمہ فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر ضیاء الدین ندوی نے مہمان ذی وقار کا تعارف کرایا جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شکیل حبیبی نے انجام دیے۔

پروگرام کے دوسرے اجلاس میں متعدد مقالہ نگاروں نے پر مغز مقالے پیش کیے۔ سید شعیب احمد نے اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر روبینہ شبنم نے اردو میں تلفظ کی معنویت کے حوالے سے بہت پر مغز اور فکر انگیز گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شستہ اردو میں بڑی مقناطیسیت اور کشش ہے اسے سننے کے بعد لوگوں کی توجہ زیادہ ملتی ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے غلط تلفظ کے لیے الیکٹرانک میڈیا کو ذمہ دار قرار دیا۔ سمینار کے اس سیشن میں ڈاکٹر احمد خاں، ادریس شاہ جہاں پوری، صدف فاطمہ، سعود عالم، فیاض احمد وجیہ، خاں محمد آصف، شکیل اختر، سید تالیف حیدر، خوشتر زریں، تفسیر حسن، آفتاب احمد منیری وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ اس سیشن کی صدارت جناب عبیدالرحمٰن اور حقانی القاسمی نے کی اور نظامت کے فرائض خان محمد رضوان نے انجام دیے۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 جولائی 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

'سویم' اور 'سویم پربھا' سروس

نئی دھلی: سابق صدر پرنب مکھرجی نے ملک کے دیہی اور شہری علاقوں میں تعلیم میں عدم مساوات کو دور کرنے

اور تعلیم کے معیار کو بہتر کرنے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ ای ایجوکیشن اس میں بڑا اور اہم کردار ادا کرے گا۔

مسٹر مکھرجی اعلی تعلیم کے میدان میں ڈیجیٹلائزیشن کے ذریعے سیکڑوں کورس کو ڈیجیٹل چینلس، ٹیبلٹس اور موبائل فون تک پہنچانے کے لیے 'سویم' اور 'سویم پربھا' نام سے شروع کی جانے والی سروس کا آغاز کرنے کے موقعے پر بات کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے اور ہر فرد تک اس کی رسائی ہونا معاشرہ اور ملک کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ای ایجوکیشن اس میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر ٹیچرس کمیونٹی سے اپیل کی کہ وہ ای ایجوکیشن کے ذریعے فراہم کیے جانے والے تدریسی مواد کو مزید بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ان کا استعمال تدریسی عمل کو بہتر بنانے کے لیے بھی کریں۔ انھوں نے اس کے ساتھ تعلیم کے لیے مقامی زبانوں کے استعمال پر بھی زور دیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ نئی خدمات ان علاقوں تک تعلیم کے فروغ میں مددگار ہوں گی جہاں تعلیم کے لیے بنیادی سہولیات ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔

فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے اس موقعے پر کہا کہ 'سویم' اور 'سویم پربھا' تعلیم کے میدان میں ڈیجیٹل انڈیا کے خواب کو محسوس کرائے گی۔

انھوں نے تعلیم کو انسانوں کو بااختیار بنانے کا سب سے اہم ذریعے بتاتے ہوئے کہا کہ ملک اور معاشرے کو ترقی کی راہ پر لے جانے والی یہ سب سے بڑی 'سافٹ پاور' ہے۔ اس کو ڈیجیٹلائز کر کے روایتی حدود سے آزاد کر کے سب کے لیے اسے قابل رسائی بنایا جائے گا۔

حکومت کے مطابق 'سویم' اور 'سویم پربھا' سروس کا مقصد ڈیجیٹل انقلاب کے ذریعے ملک کے دور دراز علاقوں میں بھی معیار پر مشتمل تعلیم فراہم کرانا ہے۔ 'سویم' کے کورس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ہیں ویڈیو لیکچر، خصوصی طور پر تیار کیا گیا پڑھنے کے قابل مواد، سیلف اسسمنٹ ٹیسٹ اور آن لائن ڈیبیٹ۔ ان میں انجینئرنگ، مینجمنٹ، سائنس، آرٹ، زبان اور ریاضی جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان کورسز کو 'سویم پربھا' کے ذریعے نشر کیا جائے گا جو کہ 32 ڈی ٹی ایچ چینلز کا گروپ ہے۔ 'سویم' کے تحت فراہم کردہ کورس آئی آئی ٹی، جے این یو، دہلی یونیورسٹی اور انا یونیورسٹی جیسے ممتاز تعلیمی اداروں کے ایک ہزار سے زائد ماہرین تعلیم نے تیار کیا ہے۔ آئی ٹی پلیٹ فارم (مسیو اوپن آن لائن کورسیز) کے ذریعے فراہم کردہ ان کورسز کے ذریعے کلاس 10 سے گریجویٹ تک میں پڑھائے جانے والے موضوعات کی تعلیم حاصل کی جا سکے گی۔ اس پلیٹ فارم کے ذریعے طلبا کبھی بھی، کہیں بھی آن لائن مطالعہ کرسکیں گے۔ یہ تمام کورسز مفت دستیاب ہوں گے۔ اس آن لائن کورس کو کوالیفائی کرنے والے طلبا کو نیشنل اکیڈمک ڈیپوزیٹری سرٹیفکیٹ سے نوازا جائے گا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 10 جولائی 2017

اساتذہ کی تربیت

نئی دھلی: ملک کے 11 لاکھ اسکولی اساتذہ کو 2 سال کے اندر تربیت دینے سے متعلق مفت اور لازمی تعلیم اطفال حق ترمیمی بل 2017 راجیہ سبھا میں صوتی ووٹ سے منظور ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر پارلیمنٹ کی مہر لگ گئی۔ لوک سبھا اسے پہلے ہی پاس کرچکی ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے ایوان میں اس بل پر تین گھنٹے تک جاری بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی تربیت کے لیے 15 اگست سے 15 ستمبر تک بلامعاوضہ رجسٹریشن شروع ہوجائے گا اور یہ آن لائن اور آف لائن دونوں ہوگا۔ امتحان اور مطالعہ کے مواد کے لیے برائے نام فیس لگے گی۔ اب نصاب بنانے کا کام جاری ہے اور یہ کورس خودکار پورٹل کے ذریعے شروع ہوجائے گا۔ یہ کورس دور درشن کے چینل پر بھی دستیاب ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اس سال ان اساتذہ کے لیے بلاک سطح پر 12 دن کے کیمپ منعقد کیے جائیں گے جس میں وہ سوال وجواب کرسکیں گے۔ اس کے بعد ان اساتذہ کو امتحان دینا ہوگا اور انھیں سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ ہر استاد کو 31 مارچ 2015 تک تربیت حاصل کرنا یا اس سے منسلک کم از کم قابلیت حاصل کرنا تھا لیکن اب تک 11 لاکھ اساتذہ کو تربیت نہیں دی جاسکی جس کی وجہ سے بلامعاوضہ اور لازمی بچہ تعلیم ایکٹ 2009 میں ترمیم کی گئی ہے۔ اس کے تحت 31 مارچ 2015 سے 31 مارچ 2019 تک ان اساتذہ کو تربیت دی جائے گی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 اگست 2017

اسکولوں میں اساتذہ کی حاضری

نئی دھلی: بھارت میں سرکاری اسکولوں میں اور خاص

طور پر دیہی علاقوں میں تعلیم کی صورتِ حال پر ہمیشہ سے تشویش کا اظہار کیا جاتا رہا ہے، ایسے میں اس کی سب

سے اہم وجہ ٹیچروں کی غیر موجودگی پایا گیا ہے، ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ اسکولوں میں بچے نہ آئیں اور حاضری لگ جاتی ہے، لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، اسکولوں میں بچنے کے دوران کافی تعداد میں اساتذہ کے غائب رہنے کی رپورٹ کے پیش نظر وزارت فروغ انسانی وسائل ایک ایسے نظام کو آگے بڑھانے کی پہل کر رہا ہے، جس میں ایک ٹیب کے ذریعے اسکول کے اساتذہ اور طالب علموں کی حاضری تبھی لگے گی جب وہ 50 فٹ کے دائرے میں ہوں گے۔ یہ نظام منی پور میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھائی گئی ہے! انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا" یہ نظام منی پور میں کامیاب ہوا ہے، اس کی تمام ریاستوں میں توسیع کرنے کی پہل کی جائے گی۔" سال 2004 میں عالمی بینک نے بھارت سمیت چھ ممالک میں اساتذہ کی غیر موجودگی کے بارے میں ایک سروے کیا تھا، بھارت میں اس کا سروے 20 ریاستوں میں 3700 اسکولوں میں کیا گیا تھا، رپورٹ میں پایا گیا کہ سرکاری پرائمری اسکولوں میں کسی بھی کام کے دن میں 25 فیصد استاد غائب پائے گئے۔ تعلیم کی صورت حال پر اثر رپورٹ 2016 میں کہا گیا ہے کہ بنیادی سطح کے اسکولوں میں اساتذہ کی موجودگی 85.4 فیصد تھی اور اعلیٰ پرائمری اسکولوں میں 84.7 فیصد پائی گئی۔ مرکزی حکومت نے بھی سال 2006 اور 2013 میں اسکولوں میں اساتذہ کی موجودگی کے بارے میں سروے کیا، ان دونوں جائزوں میں اسکولوں میں اساتذہ کی موجودگی کی سطح میں اضافہ ریکارڈ کیا اور بنیادی سطح پر یہ سال 2006 کے 81.7 فیصد سے بہتر ہو کر 2013 میں 84.3 فیصد ہو گیا ہے، اسی طرح سے اعلیٰ بنیادی سطح پر یہ 80.55 فیصد سے بہتر ہو کر 81.3 فیصد ہو گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 جولائی 2017

مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ورکشاپ

نئی دہلی: مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور (آزادانہ چارج) مختار عباس نقوی نے کہا کہ اقلیتی امور کی وزارت پوری طرح آن لائن اور ڈیجیٹل کر دی گئی ہے۔ اس ڈیجیٹل نظام میں بچولیوں اور دلالوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرکزی حکومت شفافیت اور صلاحیت کے ذریعے تبدیلی کی جانب پیش قدمی کر رہی ہے۔ این ڈی اے حکومت کے تحت شفافیت غریبوں اور ضرورت مندوں کی ترقی کا پیمانہ ہے۔ اس بات کو یقینی بنایا جا رہا ہے کہ ترقی کے فائدے معاشرے

مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ورکشاپ

کے ہر ضرورت مند تک پہنچیں۔ وہ فلاحی اور ترقیاتی اسکیمیں ہوں یا جج کے معاملات، ہماری وزارت نے مکمل شفافیت کو یقینی دلایا ہے۔ مختلف اسکالرشپ براہ راست طلبا کے بینک کھاتوں میں دی جا رہی ہے۔ مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور مختار عباس نقوی اسکوپ ٹاور میں مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی نگراں افسروں کی ایک ورکشاپ کے افتتاح کرنے کے بعد حاضرین سے خطاب کر رہے تھے۔ اس ورکشاپ کا اہتمام اقلیتی امور کی وزارت کے مختلف اسکیموں اور مالی امداد کے طریقہ کار کے بارے میں معلومات کے ساتھ نگراں افسروں کو جدید تکنیک سے لیس کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ وزیر موصوف نے کہا کہ وہ خود اقلیتی امور کی وزارت کی تمام اسکیموں کی نگرانی کر رہے ہیں تا کہ ان اسکیموں کے فائدے مکمل شفافیت کے ساتھ ضرورت مندوں تک پہنچ سکیں۔ انھوں نے کہا کہ بنیادی سطح پر اسکیموں کے بہتر اور ایماندارانہ نفاذ نئی اسکیموں کے اعلان سے زیادہ اہم ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہم مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے تقریباً 280 نگراں افسروں کی خدمات کا استعمال کریں گے، تا کہ ایم اے ای ایف پروگراموں کے ساتھ ساتھ اقلیتی امور کی وزارت کی مختلف اسکیموں کے نفاذ پر قریبی نگاہ رکھی جا سکے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 11 جولائی 2017

دہلی:

حضرت امیر خسرو: حیات و خدمات

نئی دہلی: طوطیِ ہند حضرت خواجہ امیر خسرو کے سالانہ 713 ویں عرس کے موقعے پر خواجہ ہال میں خواجہ سید محمد نظامی کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان 'حضرت امیر خسرو: حیات و خدمات' منعقد کیا گیا جس میں خواجہ سید محمد نظامی نے خواجہ نظام الدین اولیا اور خواجہ امیر خسرو کی روحانی و دینی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ خواجہ خسرو کو اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا سے والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ انھوں نے کہا کہ خواجہ محبوب الٰہی کے وصال کو 800 سال گزر گئے مگر جو دلوں میں ان کے لیے محبت تھی وہ آج تک قائم ہے۔ عراق رضا زیدی نے کہا کہ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ بادشاہوں اور علما نے نہیں بلکہ صوفیہ کرام نے کی ہے اور انسان دوستی کا جذبہ صرف تصوف میں ہے۔ شریف حسین قاسمی نے کہا کہ خواجہ امیر خسرو نے علمی و ادبی کام انجام دیا ہے۔ ان کی مقبولیت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں تھی۔ آپ 7 بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے۔ آپ پیدائشی شاعر ہیں مگر ایرانی نہیں ہیں بلکہ ہندوستانی ہیں، آپ کی زبان ہندوی تھی۔ خواجہ امیر خسرو صرف ہندوستان کے طوطیِ ہند نہیں بلکہ طوطیِ جہان فارسی ہیں۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر سید شاہد مہدی نے خواجہ امیر خسرو کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس سیمنار کی جو روایت خواجہ حسن ثانی نظامی نے قائم کی تھی اسے خواجہ سید محمد نظامی نے جاری رکھا اور امید ہے کہ اس طرح کی محافل منعقد کی جاتی رہیں گی۔

فاروق ارگلی و دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر مولانا محمد علی سہیل فریدی سجادہ نشین خانقاہ آبادانیہ فریدیہ، افضل منگلوری، حامد احمد (ہمدرد)، شوکت مفتی سمیت کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جولائی 2017

ریختہ فاؤنڈیشن کا اردو سرٹیفکیٹ کورس

نئی دھلی: اردو لکھنے پڑھنے سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ رہی ہے اور اس میں غیر اقامتی ہندوستانی بھی پیش پیش ہیں۔ امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی سے ریاضی میں پی ایچ ڈی اور اسٹینفرڈ یونیورسٹی میں استاد رہ چکے بجے تیواری کو اردو زبان سے اتنا گہرا لگاؤ ہے کہ انھوں نے اپنے ہندوستان میں قیام کے دوران اردو کا ایک سرٹیفکیٹ کورس تک کرڈالا۔ تریسٹھ سالہ مسٹر تیواری ان 95 لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے اردو سیکھنے کے لیے ریختہ فاؤنڈیشن کے اردو سرٹیفکیٹ کورس سے استفادہ کیا۔ اس کورس کے ذریعے اردو سیکھنے والوں میں کئی وکیل، تاجر، استاد، ڈاکٹر اور خواتین خانہ شامل ہیں۔ ان میں 90 فیصد لوگ اکثریتی کمیونٹی سے ہیں جس سے یہ تاثر غلط ثابت ہو رہا ہے کہ اردو کسی ایک فرقے کی زبان ہے۔ یہ لوگ اردو اور ہندی کو الگ الگ فرقوں کی زبانیں نہیں بلکہ سگی بہنیں مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو محبت کی زبان ہے اور وہ اپنے ملک میں اس محبت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اسے سیاست سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی ویب سائٹ 'ریختہ' اپنے طور پر پہلی بار لوگوں کو اردو سکھانے کا کام کر رہی ہے۔ سیکھنے والوں میں وکیل، تاجر، خواتین خانہ کے علاوہ نیورو سرجن اور شیف بھی شامل ہیں۔ ریختہ کی منیجر ارپنا نے یو این آئی کو بتایا کہ دارالحکومت میں 'جشن ریختہ' کی کامیابی کے بعد جب ادارے نے اردو سکھانے کا کورس شروع کیا تو دو گھنٹے کے اندر ہی 95 لوگوں نے آن لائن رجسٹریشن کر کے چونکا دیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکثریتی فرقے کے لوگ بھی اردو لکھنا پڑھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس زبان کی مٹھاس انھیں بے حد پسند ہے۔ یہ زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے جو دلوں کو جوڑتی ہے۔ اردو واقعی محبت کی زبان ہے تبھی تو امریکہ کی کئی یونیورسٹیوں کے پروفیسر ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ کورٹ کے وکیل، دہلی یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور پرانی دہلی کی تاجر برادری بھی اردو سیکھ رہی ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 11 جولائی 2017

اتر پردیش:

اردو زبان اور ہماری ذمہ داری

موانہ: ''اگر اردو زبان کی طرف سے ہماری بے رخی اسی طرح قائم رہی تو ہماری نسلیں تہذیب و تمدن سے بھی دور ہو سکتی ہیں اور اردو کی پستی کے ہم خود ہی ذمے دار ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار انجمن ارتقائے ادب پھلاودہ کے زیر اہتمام منعقدہ 'اردو زبان اور ہماری ذمے داری' کے موضوع پر سیمینار میں بزرگ ادیب انوار الحق شاداں بطور خصوصی مہمان شرکت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کے دور میں کئی شعبوں میں اردو استعمال میں آ رہی ہے اور اردو سے کچھ نہ کچھ روزگار بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اردو اخبارات، اردو ٹی وی، شادی بیاہ کے کارڈ وغیرہ کے لیے کام کر کے روزگار حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس موقعے پر شرکا نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے کئی جہتوں پر کام کرنے کی ضرورت بتلائی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جون 2017

رشید حسن خاں: محقق و مدون

رامپور: رامپور رضا لائبریری کے کانفرنس ہال خیابان رضا (رنگ محل) میں 'رشید حسن خاں۔ محقق و مدون' کے موضوع پر توسیعی خطبہ 'ڈاکٹر ٹی آر رینا، جموں) نے پیش کیا۔ اس موقعے پر پروگرام کی صدارت بریلی سے تشریف لائے مشہور محقق ڈاکٹر شمس بدایونی نے کی۔ پروگرام کا آغاز کاشان خاں کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعدہ سید حسن مہدی نے نعت پاک پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ٹی آر رینا نے اپنا قیمتی مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ رشید حسن خاں نے براہ راست کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن برصغیر ہند و پاک کی یونیورسٹیوں میں انھیں لیکچر دینے کے لیے دعوت دی جاتی ہے۔ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کا ممتحن بنایا جاتا رہا۔ اس کے علاوہ خاں صاحب کو اردو املا، قواعد زبان و شاعری، اصول تحقیق و تدوین، مشرقی شعریات، کلاسیکی ادب کی تفہیم، تصوف، علوم بلاغت، متن کی قرأت اور لغت کی ترتیب و تدوین کے لیے بھی لیکچر دینے اور ورک شاپ منعقد کرنے کے لیے خاص طور سے مدعو کیا جاتا رہا۔ برصغیر میں منعقد ہونے والے قومی و بین الاقوامی ادبی سیمناروں میں انھیں عزت و احترام سے دعوت دی جاتی تھی۔ ان کو عربی و فارسی و اردو پر عبور حاصل تھا۔ وہ ہندی اور انگریزی بھی خوب جانتے تھے۔ انھوں نے جن اہم کتابوں کی ترتیب و تدوین کی ان میں انتخاب شبلی، انتخاب ناسخ، اردو املا، اردو کیسے لکھیں، ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مثنویات شوق، مثنوی سحر البیان وغیرہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ خاں صاحب کو دہلی ساہتیہ اکادمی، یوپی اردو اکادمی، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، جیسے بڑے اہم انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شمس بدایونی نے کہا کہ ان کے تبصرے پوری طرح انصاف پر مبنی ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف ماہر تدوین تھے بلکہ ماہر علم املا تھے۔ انھوں نے 33 کتابیں دہلی کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب کے لیے لکھیں جن میں بیشتر مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئیں۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 17 جولائی 2017

نواب واجد علی شاہ اختر اکادمی کی شعری نشست

لکھنؤ: نواب واجد علی شاہ اختر اکادمی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں میں اکادمی کی ماہانہ شعری نشست معروف شاعر قیصر جونپوری کی صدارت اور شکیل گیاوی کی نظامت میں منعقد ہوئی۔ بطور مہمان خصوصی استاد شاعر مرزا شارق لاہرپوری اور بحیثیت مہمان اعزازی حکمت اللہ خاں حکمت شاہ آبادی و موسی رضا نظمی شریک ہوئے۔ مہمانوں کا استقبال اکادمی کے نائب صدر ڈاکٹر منصور حسن خاں اور ڈاکٹر ثروت تقی نے کیا۔ خصوصی طور پر شریک ہونے والوں میں حافظ ابوالکلام، مصور احمد اور محمد ایوب خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اظہار تشکر صدر اکادمی عارف محمد آبادی نے کیا۔ شریک شعرا میں صدر نشست قیصر جونپوری کے علاوہ عارف محمود آبادی، ڈاکٹر منصور حسن خاں، حکمت اللہ خاں حکمت شاہد آبادی، رضوان فاروقی، مسرور شاہجہاں پوری، عمر سندیلوی، عاشق رائے بریلوی، خالد فتح پوری، وصی جونپوری، سرور مظفر پوری، عابد علی شعلہ، عتیق ارحم، صغیر الحسن عابدی صغیر لکھنوی، ڈاکٹر محسن فتح پوری، احسن اعظمی، ندیم کراروی، نیلوفر خان نیل، سید آل ہاشم، یونس رحمانی الہ آبادی، محمد فیصل خاں ساحر ملیح آبادی، موسی رضا نظمی، شاہد رضوی لکھنوی، موج لکھنوی، محمد رضا لکھنوی، سلیم تابش اور عامر مختار کے نام قابل ذکر ہیں۔ نشست کے اختتام پر صدر بزم عارف محمود آبادی نے شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 اگست 2017

پریم چند اور دور حاضر

بارہ بنکی: ناول کے شہنشاہ منشی پریم چند کے دور کی غربت، لاچاری اور بے چارگی کے باوجود معاشرے میں

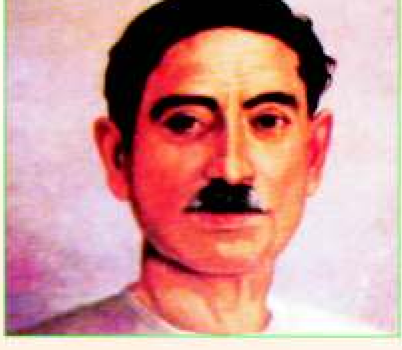

احساسات باقی تھے، مگر آج وہ ختم ہورہے ہیں۔ اس عظیم ادیب کی تخلیقات کی روشنی میں موجودہ وقت کے مسائل کا حل نکالنا اب بھی ممکن ہے۔ سماجی تنظیم رابطہ سیوا سنستھان کی جانب سے منشی پریم چند کے 137 ویں یوم ولادت پرزی پیلس میں منعقدہ سیمینار 'پریم چند اور دور حاضر' میں مقررین نے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ پریم چند ماہر ڈاکٹر بھگوان وتس نے کہا کہ پریم چند کی شخصیت اور ان کی تحریریں دونوں ہی عظیم ہیں۔ آج بھی ان کی بنیاد پر کسی مسئلہ کا حل نکالنے میں کوئی پریشانی نہیں آئے گی۔ جواہر لال نہرو پی جی کالج کے صدر شعبہ ہندی ڈاکٹر راجیش مل نے اس موقعے پر کہا کہ آج منشی پریم چند کی شناخت کو بھلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سماج کے کچھ عناصر کہہ رہے ہیں کہ فارسی، عربی اور انگریزی کے الفاظ کو ہندی سے نکال دیا جائے۔ اگر اردو اور فارسی کے الفاظ نکال دیں گے تو پریم چند کو بھی نکالنا پڑے گا۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 2 اگست 2017

بہار:

دوروزہ صحافتی ورکشاپ

پٹنہ: صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ آج کے عہد میں خاص طور سے ہمیں قلم کی قوت کو سمجھنے اور اپنے اندر خود اعتمادی لانے کی ضرورت ہے۔ ہمارا قلم ہمارے ہاتھوں میں امانت ہے اور ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم جب بھی لکھیں سماجی مفادات کے لیے ہی لکھیں۔ صلاحیتیں باہر سے نہیں ڈالی جاسکتیں یہ تو اندر سے نکلتی ہیں اور ہمارے پروگرام کا مقصد یہی ہے کہ آپ کی صلاحیتیں صیقل ہوتی رہیں۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سکریٹری بہار اردو اکادمی مشتاق احمد نوری نے کہا کہ اردو اخبارات میں سہولتوں کی کمی ضرور ہے، لیکن اعلی صلاحیتوں والے کارکنوں کی کمی نہیں۔ جناب نوری 23 جولائی کو اکادمی سیمینار ہال میں منعقدہ صحافتی ورکشاپ کے دوسرے دن کے پروگرام میں افتتاحی تقریر کررہے تھے۔ انھوں نے صحافت میں اخلاقیات کی قوت و ضرورت، عصری مقصدیت کے فوائد، شخصیت شناسی کے فلسفے، خبر سازی، فیچر نگاری، خبروں میں زبان کی صحت پر توجہ، اسلوب کے حسن، سرخیاں لگانے کے فن اور ہیڈس اور سائیکلوفیکس کے تعلق سے بعض اہم تجربات و نکات بتائے اور نظامت کی ذمہ داریاں نہایت عمدگی سے انجام دیتے ہوئے صحافت کے بارے میں کئی دیگر پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کیے۔ اس موقعے پر احمد رضا ہاشمی نے اردو صحافت کے فروغ پر مدلل تجزیاتی انداز میں صحافت کے مختلف نکات سے بحث کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس بہترین صلاحیت والے افراد ہیں اور ہم لامتیت اور لامقصدیت سے بچ کر صحافت کے کارواں کو تھوڑی سی محنت اور محبت کے ساتھ بہت آگے بڑھا سکتے ہیں۔ انفرادی قوت سے استفادہ پر زور دیتے ہوئے مسٹر اسفر فریدی نے کہا کہ اخباری دنیا میں رپورٹنگ کی بڑی اہمیت ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 جولائی 2017

اردو زبان کی تعلیم: مسائل وحل

'اردو زبان کی تعلیم: مسائل وحل' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار

دربھنگہ: اس عالمگیریت کے دور میں اکثر یہ بات کہی جارہی ہے کہ اس سے زبان کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے اور ایک خاص زبان انگریزی کا دبدبہ بڑھ رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی بین الاقوامی سطح پر رابطے کی زبان بن گئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ اس سے دوسری زبان مرجائے گی البتہ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کے فروغ کا انحصار اس کی بنیادی تعلیم پر ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر جہانگیر وارثی نے کیا۔ پروفیسر وارثی مقامی ایم ایل ایس ایم کالج دربھنگہ کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام 'اردو زبان کی تعلیم مسائل وحل' کے موضوع پر منعقد یک روزہ قومی سیمینار میں بطور مہمان خصوصی اظہار خیال کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کی تعلیم کا دائرہ محدود ہوا ہے اور اس سے اس کی ترقی کی رفتار کم ہوئی ہے لیکن یہ زندہ زبان ہے اور اگر اردو کے چاہنے والے اس کی بقا چاہتے ہیں تو اس کی بنیادی تعلیم کے ڈھانچے کو مستحکم کرنا ہوگا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو آزادی کے بعد سب سے زیادہ نقصان سیاست نے پہنچایا ہے۔ ماقبل آزادی اردو پریم چند، چکبست، بیدی، کرشن چندر، فراق، جگن ناتھ آزاد اور گوپی چند نارنگ کی مادری زبان تھی لیکن آزادی کے بعد اس کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر تعصبانہ رویہ اپنایا جانے لگا۔ نتیجہ ہے کہ بنیادی اسکولوں سے اردو کو ختم کرنے کی جو سازش شروع ہوئی تھی وہ اب اعلی تعلیمی اداروں تک پہنچ گئی ہے کہ سیکڑوں کالجوں میں اردو کے اساتذہ نہیں ہیں۔

سابق شعبہ اردو پروفیسر ظفر حبیب نے اردو زبان کی تعلیم کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ رابطے کے زبان بنانے پر زور دیا۔ اس موقعے پر پروفیسر انیس صدری سابق صدر شعبہ اردو متھلا یونیورسٹی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 21 جولائی 2017

اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے جہد مسلسل

سہرسہ: اردو گنگا جمنی تہذیب کی شاندار علامت ہے۔ ملک کی جنگ آزادی میں اس شیریں زبان نے مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے ریاست کی اس دوسری سرکاری زبان کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے ریاستی حکومت کی جانب سے جو ہدایات جاری کی گئی ہیں اس کی بنیاد پر اس تقریب کا انعقاد کیا گیا ہے۔ یہ باتیں پروگرام کے کنوینر سینئر ڈپٹی کلکٹر چرن سنگھ نے سہرسہ کے کلا بھون میں منعقد تقریب کو خطاب کرنے کے دوران کہی۔ اس سے قبل مارکٹنگ کمیٹی کے ممبران اور ضلع مجسٹریٹ ونود سنگھ گنجیال نے شمع روشن کرکے پروگرام کا شاندار افتتاح کیا۔ اس موقعے پر کمیٹی کے چاروں ممبران ڈاکٹر عبدالمنان سبحانی، پروفیسر امان اللہ خان، ڈاکٹر کوکب سلطانہ، محمد ضیاء الدین اور مہمان خصوصی ڈاکٹر عبدالکلام، ڈاکٹر معین الدین، سینئر ڈپٹی کلکٹر سنیل دتیجا اور اردو سیل کے بدرالزماں، قاری سعادت علی احمد یعقوب، محمد اشفاق کمال، محمد فاروق عالم، محمد مرتضی حسین، شمس الہدیٰ ودیگر موجود تھے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے اردو کی خستہ حالی اور بقا کے تعلق سے کئی اہم نکات پیش کیے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 جولائی 2017

تلنگانہ

ای ٹی وی کا عیدملن پروگرام

حیدرآباد: ملک کے پہلے اردو چینل ای ٹی وی اردو نے ملک میں یکجہتی اور بھائی چارے کے پیغام کو عام کرنے کے مقصد کے تحت حیدرآباد کے ہوٹل تاج دکن

میں گذشتہ ہفتے شاندار عید ملن یکجہتی کی شام تقریب کا اہتمام کیا۔ پروگرام میں تلنگانہ کے علاوہ ملک کی دیگر ریاستوں کی سیاسی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔ تقریب میں تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مرکزی وزیر بنڈارو دتاتریہ اور اسدالدین اویسی کے علاوہ تقریب میں دیگر کئی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی نے کہا کہ ای ٹی وی اردو چینل ایک مثالی اردو چینل ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے تلنگانہ کو گنگا جمنی تہذیب کا گہوارہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم سب آپسی محبت اور بھائی چارے کے ذریعے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مرکزی وزیر بنڈارو دتاتریا نے یکجہتی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اردو زبان کی چاشنی کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ ای ٹی وی اردو کے ذریعے یہ زبان دور دور تک پہنچ رہی ہے۔ اپنے خطاب میں بنڈارو دتاتریہ نے کہا کہ سبھی مذاہب کا احترام کیا جانا چاہیے۔ ای ٹی وی کے گروپ ایڈیٹر راجیش رینا نے پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ یہ کسی مخصوص طبقے کی زبان نہیں ہے۔ اس کے بعد ثقافتی اور غزل سرائی پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ ای ٹی وی اردو کے سینئر ایڈیٹر تحسین منور نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ دکن میں یکجہتی کی اس شام میں گنگا جمنی تہذیب کا ملن دیکھنے کو ملا ہے اور یہ شام مدتوں یاد رہے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 جولائی 2017

مہاراشٹر:

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی ادبی سرگرمیاں

سولاپور: نیویارک میں مقیم اردو کے معروف افسانہ نگار، صحافی و اسکالر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی سولاپور آمد پر بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سولاپور میں

اردو ادب کے عنوان سے جلسہ و عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی (وارانسی) نے جلسے اور مشاعرے کی صدارت کی۔ بطور مہمان بیجاپور کی میڈم انیس فاطمہ بخشی، پرنسپل ڈاکٹر غلام دستگیر غلام، شریک تھے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تفویض ہونے پر سہ ماہی اسباق پونے کے مدیر نذیر فتح پوری کا اعزاز کیا گیا۔ مہر فاؤنڈیشن دھولیہ کے صدر ڈاکٹر شبیر اقبال، معروف قلم کار جناب ارشد صدیقی بیڑ کی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کے ہاتھوں اعزاز دیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کے ہاتھوں نذیر بنام سلطان اختر (مضامین وتبصرے)، عشرت فدا، سہ ماہی اسباق کا گوشہ جنید شیخ، ان کتابوں کی رسم رونمائی عمل پائی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر فاروقی نے بھی اپنے خیالات سے سامعین کو روشناس کرایا۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی اردو ادب کے سفیر اور بے بدل خادم ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی پہلودار ہے وہ بیک وقت افسانہ نگار، نقاد، محقق و کالم نگار ہیں۔ جلسے کی نظامت جناب محمد فہیم حسین نے کی اس کے بعد مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی نظامت معروف ناظم کمشنر انور حسین انور نے کی، جبکہ میں افتتاحی کلمات و رسم شکریہ صدر ادارہ سلطان نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن، شولاپور، 16 جولائی 2017

مدھیہ پردیش:

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا پروگرام

بھوپال: مدھیہ پردیش اردو اکادمی محکمہ ثقافت کے ذریعے 22 اور 23 جولائی 2017 کو اسٹیٹ میوزیم، شیاملہ ہلز، بھوپال میں شاندار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب میں افسانے کا افسانہ، مشاعرہ شاعرات، شام غزل اور اکادمی کے ذریعے مالی سال 17-2016 میں شائع کتب اور اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کتب کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس دو روزہ پروگرام کے پہلے دن 'افسانے کا افسانہ' منعقد ہوا۔ شروعات میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی نے پروگرام کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ جب بھوپال کی چار خواتین تخلیق کار، ادیبہ، قوال، اور غزل گلوکارہ، شاعرات، نواب شاہجہاں بیگم، نواب سلطان جہاں بیگم، ڈاکٹر شفیقہ فرحت اور شکیلہ بانو بھوپالی کے ناموں سے منسوب افسانے کا افسانہ مشاعرہ شاعرات اور شام غزل کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ آج کا یہ پروگرام 'افسانے کا افسانہ' مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر شفیقہ فرحت کے نام سے منسوب ہے۔ اس پروگرام میں محترمہ تبسم فاطمہ، محترمہ افشاں ملک، محترمہ عشرت ناہید، محترمہ رینو بہل، محترمہ شبینہ فرشوری، محترمہ نفیسہ سلطانہ، محترمہ فیروزہ یاسمین، محترمہ مہر فاطمہ مہر کو مدعو کیا گیا ہے۔ اکادمی کے ذریعے شائع کتب کا اجرا مشہور افسانہ نگاروں اسلم فرشوری، مشرف عالم ذوقی، نعیم کوثر، شاعرہ تسنیم جوہر اور مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی کے ہاتھوں سے کیا گیا۔ پروگرام کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر صبا عظیم نے ڈاکٹر شفیقہ فرحت کے فن وشخصیت پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد خواتین افسانہ نگاروں نے افسانے پڑھے۔ صدارت تبسم فاطمہ اور نظامت رشدا جمیل نے کی۔

پروگرام کے دوسرے اجلاس میں بھی افسانہ خوانی کی گئی۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری ڈاکٹر نصرت مہدی نے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن شام کو مشاعرہ شاعرات منعقد کیا گیا جس میں ڈاکٹر پروین کیف، محترمہ تسنیم جوہر، محترمہ انجم رہبر، محترمہ عذرا نقوی، محترمہ سلمہ شاہین، محترمہ پرگیہ وکاس، محترمہ ممتاز نسیم، محترمہ نکہت امروہوی، محترمہ سوہا ایم، محترمہ پریتا واجپئی، محترمہ رشمی صبا، محترمہ شبانہ شبنم، محترمہ غوثیہ خاں سبین اور ڈاکٹر عنبر عابد نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر پروین کیف اور نظامت محترمہ عذرا نقوی نے کی۔ نواب شاہ جہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم کے فن و شخصیت پر ڈاکٹر رضیہ حامد نے روشنی ڈالی۔

دو روزہ پروگرام کے آخری دن کو شام میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعرہ، پہلی خاتون قوال شکیلہ بانو بھوپالی کے نام سے منسوب 'شام غزل' میں ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے شکیلہ بانو بھوپالی کے فن وشخصیت پر اظہار خیال فرمایا اور مشہور غزل گلوکارہ محترمہ رادھیکا چوپڑا نے غزلیں پیش کیں۔ محکمہ ثقافت کے کمشنر شری راجیش پرساد مشرا نے رادھیکا چوپڑا اور ان کی پارٹی کا پھولوں کے گلدستے سے استقبال کیا۔

پریس ریلیز: سکریٹری اردو اکادمی، بھوپال، 25 جولائی 2017

مغربی بنگال:

کولکاتا میں فارسی سمر اسکول کا انعقاد

کولکاتا: فارسی زبان وادب کی تعلیم کے مختلف النوع مسائل اور ان کے تدارک کے لیے بہتر تعلیمی و انتظامی ماحول کی فراہمی کے باوجود اصل ذمے داری تو فارسی کے اساتذہ پر ہوتی ہے۔ استاد کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنے پیشے کے ساتھ ایمانداری برتے، درس و تدریس کو ایک امانت سمجھے اور وہ جس زبان کا استاد ہے اس کی ترقی اور فروغ میں اپنا ایماندارانہ رول انجام دے۔ یہ حقیقت

ہے کہ تعلیمی درس گاہوں میں ایک بندھے ٹکے نصاب کے تحت تعلیم دی جاتی ہے اس کے فروغ پر کم دھیان دیا جاتا ہے لیکن زبان وادب کی اشاعت اور اس کے فروغ میں انجمنیں ہی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ کلکتہ میں اس قسم کی ایک انجمن ایران سوسائٹی ہے جو 1944 سے خدمات انجام دے رہی ہے۔ 27 نومبر 2013 میں قائم شدہ ایک اور انجمن انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز نے اس سلسلے میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ یہ کلکتہ کے فارسی دانشوروں، طلبہ و طالبات اور فارسی کے شیدائیوں کے لیے خوشی کی بات ہے کہ اس انسٹی ٹیوٹ نے بنگال میں پہلی بار فارسی کی درس و تدریس کے لیے پندرہ روزہ سمر اسکول کا انعقاد کیا جس کا افتتاحی جلسہ 6 جولائی کی صبح 11 بجے لیڈی برابورن کالج میں شعبہ فارسی اور انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز کے تعاون سے تاریخی ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت وائس چیئرمین مغربی بنگال اردو اکادمی جناب پروفیسر سید منال شاہ القادری نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر جے شری رائے چودھری، ڈی۔ لٹ۔ آئی اور مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر گوپا دتہ، سابق وائس چانسلر، گور بنگا یونیورسٹی اور پرنسپل لیڈی برابورن کالج شریک جلسہ ہوئیں۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر منال شاہ القادری نے ہندو ایران کے قدیم تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور اس کی مختلف زبانوں بالخصوص بنگلہ پر اس کے گہرے اثرات کا خاص طور پر تذکرہ کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر جے شری رائے چودھری نے اپنی بیش قیمت تقریر میں اس پروگرام کی تعریف کرتے ہوئے بنگال میں فارسی تعلیم و تربیت کا ذکر کیا اور کہا کہ لیڈی برابورن کالج میں فارسی کا شعبہ اسی وقت سے قائم ہے جب یہ کالج عالم وجود میں آیا۔ شعبے کی فعالیت پر انھوں نے پرنسپل کے علاوہ شعبہ کی سابق صدر پروفیسر جہاں آرا اور موجودہ صدر محترمہ یاسمین کی کھل کر ستائش کی جنھوں نے اس قسم کے تعلیمی و تربیتی پروگرام کے لیے آئندہ بھی بھرپور تعاون کا وعدہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جولائی 2017

اکیسویں صدی میں اردو افسانہ: مسائل اور امکانات

کولکاتا: کلکتہ گرلس کالج کے زیرِ اہتمام دو روزہ قومی سیمینار 'اکیسویں صدی میں اردو افسانہ: مسائل و امکانات' 29 جولائی 2017 کو مغربی بنگال اردو اکادمی کے مولانا ابوالکلام آزاد آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ مقالہ خوانی کے پہلے دور کا آغاز صبح 10.30 بجے ہوا جس کی صدارت معروف فکشن نگار ڈاکٹر ترنم ریاض اور ڈاکٹر دبیر احمد (صدر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج) نے مشترکہ طور پر کی۔ اس دور میں بالترتیب پانچ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے جن میں ڈاکٹر عمر غزالی، ڈاکٹر ترنم مشتاق، ڈاکٹر محمد شمشیر عالم، جناب اصغر شمیم، محترمہ فاطمہ خاتون کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ترنم ریاض نے اپنے صدارتی خطبہ میں مقالہ نگاروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ناقدوں کی تحریروں سے گمراہ نہ ہوں اپنی سوچ و فکر اور نظریے کو بلاخوف و خطر ترجیح دیں کیونکہ تخلیق کار کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نقادوں کو ادبی بددیانتی سے گریز کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر دبیر احمد نے سیشن میں پڑھے گئے تمام مقالوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے مقالہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے کہا کہ ذہن و دل کو کھلا رکھیں اور اپنے معاشرے میں در آنے والے تمام تر مسائل کو ایمانداری سے اپنی تحریروں میں پیش کریں تاکہ آپ کی تحریریں سماجی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔''
دوسرے تکنیکی سیشن کی صدارت ملک کے نامور افسانہ نگار جناب انیس رفیع نے کی۔ اس سیشن میں بھی پانچ مقالے پڑھے گئے جن کے نام اس طرح ہیں: جناب محمد سلیمان نجام، ریسرچ اسکالر، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، شاہد اقبال، کولکاتا، امتیاز رومی، ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، ڈاکٹر شارقہ شفتین اور محمد ریحان۔ اس کے بعد جناب انیس رفیع نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے تمام مقالوں کا بالتفصیل جائزہ لیا۔ پہلے اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر یاسمین اختر نے انجام دیے جبکہ دوسرے اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نعیم انیس نے کی۔

پریس ریلیز: نعیم انیس، کولکاتا، 29 جولائی 2017

شام افسانہ

کولکاتا: ہر عورت پیدائشی طور پر ماں ہوتی ہے۔ کم عمری میں گڑیوں سے کھیلنے کا شوق دراصل اسی جبلت کی تکمیل ہے۔

ہر چند کہ موجودہ نسل اس سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ موبائل اور لیپ ٹاپ سے مزین نسل میں وہ پرانی قدریں کم ہوتی جارہی ہیں۔ یہ بچے، یہ نسل Brain Damaged ہے۔ یہ لوگ اس طرح سے نہیں سوچتے جیسا ہم لوگ سوچا کرتے تھے۔ تاہم لڑکیوں کو لکھنا چاہیے کیوں کہ ان کے اندر تخلیقی صلاحیت قدرت نے ڈال رکھی ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن رائٹر ڈاکٹر ترنم ریاض نے سہ ماہی رسالہ 'فکر و تحریر' کولکاتا کے زیر اہتمام 'شام افسانہ' میں اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ اس تقریب کا اہتمام مورخہ 29 جولائی 2017 بروز ہفتہ مغربی بنگال اردو اکادمی کلکتہ کے ابوالکلام آزاد آڈیٹوریم میں شام 6 بجے کیا گیا جس میں ملک کے کہنہ مشق اور نامور افسانہ نگاروں سے لے کر مبتدی کہانی کاروں نے اپنی شاندار کہانیوں سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ملک کے نامور فکشن رائٹر جناب انیس رفیع اور سید محمد اشرف (آئی آر ایس) مہمان خصوصی کی حیثیت سے جلوہ افروز تھے۔

تقریب کے آغاز پر معروف افسانہ نگار پروفیسر نیر مسعود (لکھنؤ) کے سانحۂ ارتحال پر تعزیت کا اظہار کیا۔ افسانہ نگار، مترجم اور نقاد شبیر احمد (کولکاتا) کہنہ مشق فکشن رائٹر اور شاعر ڈاکٹر مشتاق انجم، نامور فکشن رائٹر سید محمد اشرف، بزرگ افسانہ نگار انیس رفیع اور صدر تقریب ڈاکٹر ترنم ریاض نے اپنے افسانے پڑھے۔

پریس ریلیز: انیس نعیم، کولکاتا، 30 جولائی 2017

اعزاز و اکرام:

پروفیسر صغیر افراہیم کو کلیم الدین احمد ایوارڈ

علی گڑھ: فیروز آباد کی موقر ادبی تنظیم گلشن رضا ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ننھے پیلس آگرہ میں اردو کے معروف نقاد ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' کے مدیر پروفیسر

صغیر افراہیم کو ان کی اردو زبان میں اعلیٰ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں کلیم الدین احمد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر صغیر افراہیم کو اس سے قبل اترپردیش اردو اکادمی نے ایک لاکھ روپے کے صغریٰ مہدی اینگلی گریشن ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اس کے علاوہ ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی نے اردو ادب ایوارڈ پاکستان میں فیڈرل یونیورسٹی کراچی نے نشان سپاس، سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی میرٹھ نے

سرسید مشن ایوارڈ 2017، ایم جی ایم کالج سنبھل میں عندلیب شادانی ایوارڈ، ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ وغیرہ میں سے زائد ایوارڈ سے انھیں نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جولائی 2017

معروف شاعر زبیرالحسن غافل کو اعزاز

ارریا: اردو اکادمی پٹنہ کے زیراہتمام ایک اعزازیہ تقریب ہوٹل نیلم کے وسیع ہال میں منعقد کی گئی جس کی صدارت معروف شاعر ڈاکٹر سالک اعظم نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر سبکدوش پرنسپل آزاد اکادمی الحاج عبدالحکیم نے شرکت کی اور نظامت کے فرائض مشتاق احمد نوری سکریٹری اردو اکادمی نے ادا کی۔ اس تقریب میں طنز و مزاح کے معروف شاعر زبیرالحسن فاضل سبکدوش جج کو اردو اکادمی کی جانب سے شال اوڑھا کر اور مومنٹو و نقد رقم دے کر اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اپنے افتتاحیہ خطاب میں مشتاق احمد نوری نے کہا کہ صوبہ کے سبھی اضلاع میں ایسی تقریب کا انعقاد کیا جارہا ہے اور اردو سے وابستہ معروف شعرا و ادبا کو اکادمی کی جانب سے ان کے بے بہا خدمات اردو کے لیے جانے پر اعزاز سے سرفراز کیا جارہا ہے۔ ارریا میں طنز و مزاح کے شاعر زبیرالحسن غافل کا انتخاب اسی سلسلے میں ہوا ہے۔ اس موقعے پر ادیب شاعر رفیع حیدر انجم نے مقالہ پڑھا اور ان کے سوانح حیات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی پیدائش 1944 میں ہوئی۔ ان کے آبا و اجداد سے وراثت میں انھیں شاعری ملی اگرچہ انھوں نے اساتذہ اور وکالت کے پیشے کو اختیار کیا اور جج بنے تمام تر خدمات کے ساتھ انھوں نے اردو سے محبت کی اور ان کا شعری مجموعہ رجنی شہر سے شائع ہونے کے بعد انھوں نے اپنی طنز و مزاح کے شاعری کا لوہا منوایا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 جولائی 2017

ماہرین لسانیات اور مدیروں کو اعزاز

نئی دہلی: سابق وزیراعظم منموہن سنگھ نے ملک میں مختلف زبانوں کے تحفظ میں قابل ذکر شراکت کرنے والے 40 لسانی ماہرین اور مدیروں کو اعزاز سے نوازا ہے۔ سنگھ نے 'بھارتیہ بھاشا جن سروینچھن' کے تحت شائع ہونے والی 50 ضخیم جلدوں کی تدوین بیش قیمتی تعاون کرنے والے ان لسانی ماہرین کو سرٹیفکیٹ سے سرفراز کیا اور ملک کی لسانی تنوع کو بچائے رکھنے میں ان کی شراکت کی ستائش کی۔ ان میں 12 خواتین لسانی ماہرین اور ایڈیٹر ہیں۔ اس منفرد منصوبے کے ایڈیٹر مشہور انگریزی اور گجراتی مصنف ڈاکٹر جی این ڈیوی ہیں جو گذشتہ 16 سال سے اس منصوبے کو عملی شکل دے رہے ہیں۔ اب تک اس منصوبے کی 37 جلد شائع ہوچکی ہیں۔ جناب سنگھ نے اپنے خطاب میں مشہور شاعر علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان لسانی نقطہ نظر سے اتنا مختلف ہے اور اس کا باہمی اتحاد ایسا ہے کہ اس کی ہستی مٹتی نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان دنیا کا واحد ایسا ملک ہیں جہاں اتنی زبانیں بولی جاتی ہیں اور سہ لسانی فارمولہ کام کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 1961 کی مردم شماری میں ملک میں کل 500 زبانیں اور بولیاں تھیں لیکن اب سروے سے پتہ چلا کہ 970 زبانیں فی الوقت باقی ہیں، 120 زبانوں میں ریڈیو پروگرام ہوتے ہیں اور 65 زبانوں میں رسائل کی اشاعت ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لسانی ماہرین کے سلسلے میں ہم نوم چامسکی جیسے غیرملکی لسانی ماہرین کی اہمیت کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن ممتاز فلسفی، صوفی، شاعر، ڈرامہ نگار اور بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ابھینو گپتا کی اہمیت کو اس طرح پیش نہیں کرتے اور یہ ہماری نوآبادیاتی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں زبانوں کے لیے روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا بہتر طور پر تحفظ کیا جاسکے۔

ڈیوی نے تقریب میں 2024 تک دنیا کی چھ ہزار زبانوں کے سلسلے میں گلوبل اسٹیٹس رپورٹ شائع کرنے کے عظیم الشان منصوبے کا بھی اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ 2022 تک اس منصوبے کی پہلی جلد ہمارے سامنے آجائے گی۔ تقریب میں سماجی علوم کے ماہر آشیش نندی نے 'بھارتیہ بھاشاؤں میں ویمرش کے دس کھنڈ' کا اجرا بھی کیا۔ تقریب سے مشہور ادیب اور راجیہ سبھا کی سابق نامزد رکن ڈاکٹر کپلا واتسیاین نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 اگست 2017

کوثر کیرانوی کے اعزاز میں شعری نشست

نجیب آباد: معروف شاعر کوثر کیرانوی کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں شعرائے کرام نے اپنا عمدہ کلام پیش کرکے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ اس موقعے پر آکاش وانی کے اسسٹنٹ، ڈائریکٹر لوکیش شکلا کو ساہو رمیش چند اگروال، ڈاکٹر آفتاب کو علامہ تاجور نجیب آبادی اور ڈاکٹر صابر شگفتین کو اردو ادب کی شمع روشن کیے رکھنے کے لیے انھیں شال اوڑھا کر اور امتیازی نشان دے کر اعزاز سے سرفراز کیا۔

محلہ رمپورہ میں موصوف واصف کی رہائش گاہ پر منعقدہ نشست کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی کوثر کیرانوی نے کہا کہ نجیب آباد ادب کا گہوارہ رہا ہے اور پوری دنیا میں اس کی خوشبو پھیل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج نئی نسل کو اردو سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ لوکیش شکلا کی صدارت میں منعقدہ شعری نشست کا آغاز سرفراز صابری کی نعت پاک سے ہوا۔ مہندر اشک، موصوف واصف، ظفر رحمانی، مختار احمد شاد، لوکیش شکلا، ظفر کاشی پوری، سرفراز صابری، ڈاکٹر آفتاب نعمانی کے علاوہ کئی دوسرے شعرائے کرام نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اگست 2017

ہاجرہ نور زریاب کو استقبالیہ

نئی دہلی: جدید اردو شاعری کی تفہیم پروین شاکر، احمد فراز اور قتیل شفائی کی شاعری کے بغیر ناممکن ہے۔ نئی نسلوں کو ان شعرا کو ضرور پڑھنا چاہیے یہ وہ فنکار ہیں جنھوں نے ایسے وقت میں اردو شاعری میں جدید موضوعات کا اضافہ کیا جب اس پر نکبت و افلاس کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مہاراشٹر سے آئیں ہاجرہ نور زریاب نے کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں طلبا و اساتذہ کے سامنے کیا۔ انھوں نے اپنے شعری و ادبی سفر کے متعلق طلبا و حاضرین کو حیرت انگیز باتیں بتائیں جنھیں سن کر تمام حاضرین ایک جوش و جذبہ سے بھر گئے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے شعبہ کے سینئر استاذ ڈاکٹر یحییٰ صبا نے کہا کہ ہاجرہ اس وقت اردو نسوانی شاعری کی ایک معتبر آواز ہیں، ان کی شاعری دلوں کی شاعری ہے اور جذبات و احساسات کا تعارف بھی اپنے سامعین میں کراتی ہیں۔ ان کے علاوہ شعبہ کی سینئر استاذ ڈاکٹر طیبہ خاتون نے بھی اردو ادب، اردو شاعری اور اردو نثر کی مختلف جہات پر اظہار خیال کیا۔ ٹیچر انچارج ڈاکٹر خالد اشرف نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ڈاکٹر ہاجرہ نور جیسی ہستیوں کا وجود اردو ادب کے لیے نیک فال ہے۔ ایسے لوگ اب بہت کم بچے ہیں یا نظر ہی نہیں آتے ہیں جن کا قلم اس قدر رواں، شستہ، شائستہ اور سنجیدہ ہوتا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 جولائی 2017

اجرا:

حریف تیرگی

امروھہ: سادات امروہہ ویلفیئر آرگنائزیشن دہلی و بزم صادقین کی جانب سے ممتاز شاعر ڈاکٹر لاڈلے رہبر کے شعری مجموعہ 'حریف تیرگی' کی رسم رونمائی شہر کی نامور علمی درسگاہ امام المدارس انٹر کالج میں عمل میں لائی گئی جس میں علم و ادب کی نامور شخصیات نے کتاب مذکورہ اور ڈاکٹر لاڈلے رہبر کی علمی ادبی سماجی خدمات اور ان کی شاعری پر تبادلہ خیال پیش کیا۔ اس اہم پروگرام کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر مظفر عباس سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمائی جبکہ مہمانِ ذی وقار کے طور پر عالمی شہرت یافتہ ناظم ڈاکٹر عظیم حیدر، پروفیسر ڈاکٹر ناشر نقوی، ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، ڈاکٹر جمشید کمال، وسیم حیدر نقوی منیجر امام المدارس انٹر کالج، کارپوریشن چیئرمین ڈاکٹر افسر پرویز رہے۔ صدر جلسہ پروفیسر مظفر عباس نے اس شعری مجموعہ کو ایک عظیم شاہکار بتایا۔ رسم اجرا کے بعد ایک خصوصی شعری محفل کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں شہر کے منتخب شعرا حضرات میں استاد شمیم امروہوی، حسن امام حسن، لیاقت امروہوی، زبیر ابن سیفی، ڈاکٹر مبارک امروہوی، سید شیبان قادری، ڈاکٹر ناصر امروہوی، پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر عظیم امروہوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 1 اگست 2017

کچے پکے رنگ

نئی دھلی: مشہور شاعرہ دکشا ڈوڈیجا کی تحریر کردہ کتاب 'کچے- پکے رنگ' رسم اجرا کی تقریب کا انعقاد انڈیا انٹرنیشنل کے انیکسی بلڈنگ کے لیکچر ہال نمبر 2 میں کیا گیا۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر مشتاق صدف نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ خواتین سماج میں جن مسائل سے جوجھ رہی ہیں اس کو اپنے کلام کے ذریعے موصوف نے اس کتاب میں اجاگر کیا ہے اور سب سے اچھی اور خاص بات یہ ہے کہ موصوفہ نے اچھے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کتاب سے متعلق کہا کہ محترمہ ڈوڈیجا نے اپنی پہلی کتاب میں اردو کے الفاظ کا بھرپور استعمال کیا ہے، اسی لیے مجھے امید ہے کہ یہ کتاب نوجوانوں کے درمیان بے حد مقبول ہوگی۔ پدم شری سریندر شرما نے اپنے خطاب میں کہا کہ شاعری کی کوئی زبان نہیں ہوتی ہے، شاعری میں محبت کی جھلک نظر آتی ہے، شاعری سمجھنے کی نہیں بلکہ محسوس کرنے کی زبان ہے۔ سریندر شرما نے یہ بھی کہا کہ آج تحریر کے ذریعے نفرت کو فروغ دیا جارہا ہے اور ایسا ماحول ہے کہ ملک کی سالمیت کے لیے بڑا خطرہ ہے، ایسے خطرناک ماحول میں شاعری ایک مثبت کام کرسکتی ہے، کیونکہ شاعری میں مٹھاس ہوتی ہے شاعری دلوں کو توڑنے کا نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ اس موقعے پر بھارتیہ گیان پیٹھ کے ڈائریکٹر لیلا دھرن منڈولئی، آدتیہ گروپ کے سی ایم ڈی ہری کھیمکا، آکھار پرکاشن کے کنوینر اظہار ندیم و دیگر نے بھی اظہار خیال کیا اور شاعرہ کو مبارکباد دی۔ اختتام پر دکشا ڈوڈیجا نے تمام آئے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جبکہ نظامت کے فرائض شاعرہ جیوتی آریہ نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 جولائی 2017

ڈاکٹر لاڈلے رہبر کے شعری مجموعہ 'حریف تیرگی' کا اجرا

ذکر رفتگاں

پٹنہ: حلقہ ادب بہار اس وقت ریاست میں سب سے پرانا ادبی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ حکومت بہار سے رجسٹرڈ ہے اور اس کا قیام 1951 میں عمل میں آیا تھا اور اسی سال ریاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس ادارے کی جانب سے کل بہار اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ پروفیسر عبدالمغنی زندگی کے آخری دنوں تک حلقہ ادب بہار کے صدر رہے۔ فی الوقت حلقہ ادب کے صدر اردو کے معروف صحافی اور روزنامہ قومی تنظیم کے چیف ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید ہیں۔ مندرجہ بالا باتیں ڈاکٹر خالدہ خاتون کی کتاب 'ذکر رفتگاں' کے اجرا کے موقعے پر حلقہ ادب بہار کے جنرل سکریٹری فخرالدین عارفی نے کہیں۔ فخرالدین عارفی نے مزید کہا کہ ڈاکٹر خالدہ خاتون ایک عرصے سے مضامین لکھ رہی ہیں اور پہلے بھی ان کی کتاب شائع ہوچکی ہے۔ 'ذکر رفتگاں' ان کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اردو ادب کی مایہ ناز شخصیتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ حلقہ ادب بہار کے صدر ایس ایم اشرف فرید نے ڈاکٹر خالدہ خاتون کی کتاب 'ذکر رفتگاں' کا حلقہ ادب بہار کے زیر اہتمام اجرا کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب موضوع کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے اور اس کتاب میں متعدد ایسی شخصیتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان کی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 19 جولائی 2017

قاضی نجم ہری پوری اور قاضی جلال ہری پوری: فکر و فن

نئی دھلی: تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہر دور میں فتوحات حاصل کی گئیں ہیں۔ ہم بغیر تعلیم کے کچھ بھی حاصل نہیں کرسکتے اور نہ ہی کسی مقام پر پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا نئی نسلوں میں علمی شوق پیدا کرنے کی سخت

ضرورت ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پیس انڈیا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر یحییٰ صبا کے دولت کدے پر منعقدہ ایک ادبی نشست میں پورنیہ (بہار) سے تشریف لائے محمد رضوان ندوی ہری پوری نے کیا۔ اس موقعے پر محمد رضوان ندوی کی کتاب 'قاضی نجم ہری پوری اور قاضی جلال ہری پوری: فکر و فن' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ کتاب مولانا ندوی کے دادا اردو فارسی کے قادرالکلام شاعر و ادیب قاضی جلال ہری پوری اور پر دادا قاضی نجم ہری پوری کے اردو- فارسی کے منتخب کلام اور ان کی فکر و فن پر مشاہیر علم و ادب اور ارباب نقد و نظر کے تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا نے مولانا ندوی کا تعارف کراتے ہوئے موصوف کی علمی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں دلی مبارکباد

پیش کی۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کے ذمے داران اور علاقے کے عمائدین کثیر تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 جولائی 2017

ندائے اختر

گیا: 'بزمِ گوشۂ ادب' کے زیرِ اہتمام استاد شاعر مجیب اختر کے شعری مجموعہ 'ندائے اختر' کی رسم اجرا پورے تزک و احتشام کے ساتھ مرزا غالب کالج کے پرنسپل جناب خورشید احمد خاں کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقع پر پروفیسر منصور عالم، سابق صدر شعبۂ اُردو مگدھ یونیورسٹی، جناب سید احمد قادری، ممبر اُردو اکادمی، بہار، مرغوب اثر فاطمی کے علاوہ شہر کی معزز شخصیات، دانشور و ادیبوں کی موجودگی میں جلسہ کو پروقار بنایا۔ جلسہ کی صدارت جناب شمس الاسلام، پرنسپل گیا کالج، گیا نے فرمائی اور اس پروگرام کی نظامت کی ذمے داری 'گوشۂ ادب' کے روحِ رواں جناب اقبال واجد نے بحسن خوبی انجام دی۔

جناب خورشید احمد خاں نے 'ندائے اختر' پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ دیر سے ہی سہی لیکن ایک استاد شاعر کے شعری مجموعے کا منظرِ عام پر آنے سے اس شاعر کی پوری شعری کائنات ہمارے سامنے آگئی۔ اگر یہ مجموعہ نہیں آتا تو ہم ایک ایسے شاعر کے کلام سے محروم رہ جاتے جو پوری زندگی شاعری کرتے تو رہے لیکن خود کو پردے میں رکھا۔ سید احمد قادری نے اپنی گفتگو میں کہا کہ مجیب اختر کی شاعری حالانکہ یک رُخی ہے لیکن وہ جس نظریے کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ مجموعہ 'ندائے اختر' کے کئی اشعار ایسے ہیں جو دل کو چھو جاتے ہیں۔ جناب شمس الاسلام نے اپنی جامع تقریر میں اُردو کے فروغ کے حوالے سے اپنی قیمتی آرا سے نوازا اور اپنے طور پر ہر طرح کی معاونت کی یقین دہانی کرائی۔ تقریب رسم اجرا کے بعد یہ اجلاس ایک شعری نشست میں تبدیل ہوگیا۔

پریس ریلیز: احمد صغیر، 25 جولائی 2017

'اُپسرا کی واپسی' اور 'کہانی راج کرتی ہے'

مالیگاؤں: بمقام اُردو میڈیا سینٹر (نزد اکسکس لائبریری)، مالیگاؤں، 15 جولائی 2017 اَدبِ اطفال پر منحصر، دو کتابوں کی تقریب رسم اجرا، کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس تقریب میں م ن انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ 'اُپسرا کی واپسی' اور محمد عمر انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ 'کہانی راج کرتی ہے' کا اجرا ہوا۔ ان دونوں کتابوں کو 'قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان' نئی دہلی، کی مالی معاونت بھی ملی ہے۔

'اُپسرا کی واپسی' کا اجرا بدست ڈاکٹر برکی صاحب عمل میں آیا اور 'کہانی راج کرتی ہے' کا اجرا ڈاکٹر مخشب مسعود کے ہاتھوں ہوا۔ ادبی دُنیا کے فن پارکھی مبصرین جناب احمد ایوبی صاحب (جمہور ہائی اسکول)، جناب مرتضیٰ انصاری صاحب (ادیب)، جناب الحق خضر صاحب (صدر اَدارۂ نثری اَدب و موظف ہیڈ ماسٹر، تہذیب ہائی اسکول) اور ڈاکٹر افتخار احمد (مدیر 'جل پری' مالیگاؤں) نے بالترتیب دونوں کتابوں پر اپنی آرا کا برملا اظہار فرمایا۔ بالآخر صدر مجلس جناب سعید پرویز صاحب کا خطبۂ صدارت پیش ہوا۔ اُنھوں نے دونوں کتابوں پر اپنے زریں خیالات کا اظہار فرمایا نیز وہ دورانِ اظہار بر محل اشعار بھی پیش کرتے رہے۔ محمد عمر انصاری (مصنف، کہانی راج) نے شکریہ کی رسم اَدا کی۔ اس کے ساتھ ہی تمام حاضرینِ محفل کی خدمت میں مذکورہ دونوں کتابیں تحفتاً تقسیم کی گئیں۔

پریس ریلی: ش۔ ن۔ اے۔ پروگرام کمیٹی، مالیگاؤں، 16 جولائی 2017

وفیات:

پروفیسر منیر عالم

نئی دہلی: معروف ماہر اقتصادیات اور انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ دہلی سے وابستہ پروفیسر منیر عالم کا 5 جولائی کو طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں انتقال

ہوگیا۔ ان کی تدفین علی گڑھ کے سرسید نگر قبرستان میں ہوئی۔ پروفیسر منیر عالم برین کینسر میں مبتلا تھے اور گذشتہ کئی مہینوں سے ایمس میں زیر علاج تھے۔ پروفیسر منیر عالم ماہر اقتصادیات تھے۔ وہ بے حد ملنسار، منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔ طلبا کے ساتھ ان کا مشفقانہ طرزِ عمل ایک مثال تھا۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا تادیر مشکل نظر آتا ہے ان کی پیدائش 15 جولائی 1949 کو ہوئی۔ انھوں نے اکنامکس میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، وہ مین پاور پلاننگ کے ماہر مانے جاتے تھے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب دنیا بھر میں مشہور ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ سعودی عرب، امریکہ اور فجی سمیت نصف درجن ممالک میں کام کیا۔ ان کا آبائی وطن یوپی کے جونپور شہر کے براؤن قصبہ تھا، لیکن ان کی زیادہ تر رہائش اپنے ننہیال غازی پور میں رہی۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ مرحوم کے پسماندگان میں اہلیہ شاہدہ منیر اور اکلوتی اولاد رباب فاطمہ ہیں۔ رباب فاطمہ کناڈا میں رہتی ہیں۔ مرحوم پروفیسر منیر عالم روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے بھی وابستہ رہے۔ اقتصادی معاملات سے متعلق ان کے مضامین روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 جولائی 2017

مریم مرزا خانی

واشنگٹن: ریاضی کے میدان میں دنیا کا سب سے بڑا اعزاز 'فیلڈز میڈل' حاصل کرنے والی پہلی خاتون ایرانی نژاد مریم مرزا خانی امریکہ میں 16 جولائی کو انتقال

کرگئیں۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسی اے ایف پی کے مطابق 40 سالہ مریم مرزا خانی گذشتہ کئی سال سے کینسر کے خلاف لڑ رہی تھیں۔ امریکہ کے اسپتال میں ان کا علاج جاری تھا جہاں وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ مریم مرزا خانی کے دوست فیروز نادری نے ان کے انتقال کا اعلان سماجی ویب سائٹ 'انسٹاگرام' پر کیا، جبکہ مریم کے اہل خانہ نے ایران کی ایجنسی 'مہر' کو اس کی تصدیق کی۔ ناسا کے 'سولر سسٹم ایکسپلوریشن' کے سابق ڈائریکٹر فیروز نادری نے لکھا کہ 'روشنی کا دیا بجھ گیا جس پر میں بہت غمگین ہوں اور مریم بہت جلد ہم سے دور چلی گئی۔ انھوں نے مزید لکھا کہ مریم ذہین تو تھیں ہی لیکن وہ بیٹی، ماں اور بیوی بھی تھیں'۔ مریم مرزا خانی کو 'انٹرنیشنل کانگریس آف میتھمیٹیشینز' کی جانب سے 2014 میں ریاضی کے شعبے میں 'نوبل انعام' کے برابر کا درجہ رکھنے والا 'فیلڈز میڈل' دیا گیا تھا۔

انھیں یہ ایوارڈ ریاضی کے 'جیومیٹری' اور 'ڈائنا میکل سسٹمز' کے شعبوں میں ان کی گراں قدر خدمات کے نتیجے میں دیا گیا تھا۔ پروفیسر مریم مرزا خانی 1977 میں ایران میں انقلاب سے پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ 20 سال سے بھی کم عمر میں ریاضی کے بین الاقوامی مقابلوں میں دو سنہری تمغے جیت چکی تھیں۔ انھوں نے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی سے 2004 میں پی ایچ ڈی حاصل کی، جس کے بعد وہ 2008 میں اسٹینفورڈ یونیورسٹی میں ریاضی کی پروفیسر مقرر ہوگئی تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جولائی 2017

پروفیسر نیر مسعود

لکھنؤ: اردو کے قلمکار، فارسی کے مشہور استاذ، درجنوں کتابوں کے مصنف اور معروف ادبی شخصیت پروفیسر نیر مسعود رضوی

کا 24 جولائی 2017 پیر کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ وہ گذشتہ کئی برسوں سے صاحب فراش تھے۔ تقریباً تیس کتابوں کے مصنف نیر مسعود نے افسانہ، تحقیق، تنقید اور تراجم وغیرہ پر کام کیا۔ ان کا افسانہ عطر کافور اور طاؤس چمن کی مینا بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ 300 سے زیادہ مضامین مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی سے وابستہ رہے۔ پروفیسر نیر مسعود کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین دیر شب حیدر گنج واقع منشی صدر عالم کی کربلا میں عمل میں آئی۔ نیر مسعود 16 نومبر 1936 کو مسعود حسن رضوی ادیب کے یہاں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1957 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور 1965 میں الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد 1965 میں ہی اسلامیہ کالج بریلی میں فارسی اور اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے 1996 میں پروفیسر کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سیمیا' کے نام سے 1984 میں شائع ہوا۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی دو کتابیں تحریر کیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود کو ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں ملک کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں برلا فاؤنڈیشن کا ادبی ایوارڈ 'سرسوتی سمان' بھی حاصل ہوا، اس کے ساتھ ساتھ انھیں ادب وتعلیم کے لیے 1979 میں پدم شری ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جولائی 2017

پروفیسر یشپال

نئی دھلی: مشہور سائنس داں اور ماہر تعلیم پروفیسر یشپال کا 25 جولائی نوئیڈا کے میکس ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 90 سال کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوی اور دو بیٹے ہیں۔ پدم بھوشن اور پدم وبھوشن سمیت کئی اعزاز سے

نوازے گئے پروفیسر یشپال کئی اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں، جن میں پلاننگ کمیشن میں مشیر اعلی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبہ میں سکریٹری اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے چیئرمین کے عہدے شامل ہیں۔ ان کی آخری رسوم لودھی شمشان گھاٹ میں ادا کی گئی۔ پروفیسر یشپال کی پیدائش 26 نومبر 1926 کو ہریانہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامنٹل ریسرچ سے کیا تھا۔ حکومت ہند نے 1973 میں انھیں خلائی ایپلی کیشن سینٹر کا پہلا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ 84-1983 میں وہ پلاننگ کمیشن کے مشیر اعلی بھی رہے تھے۔ پروفیسر یشپال کو 1976 میں پدم بھوشن اور 2013 میں پدم وبھوشن اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ وہ سال 1986 سے 1991 تک یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (یو جی سی) کے چیئرمین رہے تھے۔ پروفیسر یشپال کو سائنس اور انجینئرنگ کے میدان میں خدمات کے لیے جانا جاتا ہے۔ پروفیسر یشپال نے میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے طبعیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 جولائی 2017

پروفیسر اظہار احمد

نئی دھلی: ڈی بی کالج جے نگر مدھوبنی کے سابق پرنسپل پروفیسر اظہار احمد کا 25 جولائی پٹنہ کے اندرا گاندھی اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ پروفیسر اظہار احمد کا تعلق مدھوبنی کے ست گھرا سے تھا۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہندوستانی بحریہ سے وابستہ ہوئے، پھر آر کے کالج، مدھوبنی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ڈی بی کالج جے نگر کے پرنسپل ہوئے۔ بعدازاں دل سنگھ سرائے کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے تقرری ہوئی اور وہیں سے 1995 میں سبکدوش ہوئے۔ مرحوم کے پسماندگان میں تین بیٹے ڈاکٹر جاوید احمد، ڈاکٹر احمد امتیاز اور ڈاکٹر سجاد احمد کے علاوہ چار بیٹیاں ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز دہلی یونٹ کے سابق صدر ارشاد احمد مرحوم کے داماد ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جولائی 2017

ظفر گورکھپوری

ممبئی: معروف شاعر اور ادیب ظفر گورکھپوری کا طویل علالت کے بعد 30 جولائی 2017 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی

عمر 83 سال تھی۔ انھیں خصوصی طور پر بچوں کے ادب کے لیے بھی یاد رکھا جائے گا۔ مرحوم 1950 کے عشرہ میں ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے۔ پسماندگان میں 3 بیٹے اعجاز، امتیاز اور خالد ہیں، جبکہ ایک لڑکے جاوید کا چند سال قبل انتقال ہوگیا۔ اتوار کو بعد نماز ظہر ظفر گورکھپوری کو سپرد

خاک کر دیا گیا۔ اس موقعے پر ادبی، سماجی اور صحافتی میدان سے وابستہ شخصیات موجود رہیں۔ ظفر گورکھپوری کا نام ظفر الدین اور تخلص ظفر تھا۔ وہ 5 مئی 1935 کو ضلع گورکھپور (یو پی) کی تحصیل بانس گاؤں کے ایک دیہات بیدولی بابو میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں بمبئی تشریف لے آئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ظفر صاحب نے پہلے کچھ افسانے لکھے، پھر شعر، پہلا شعر غالباً 1949 میں کہا تھا اور پھر 1953 میں ترقی پسند تحریک میں شامل ہوگئے۔ اب تک کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کے نام: تیشہ، آر پار، زمیں کے قریب، وادی سنگ، گوکھرو کے پھول (شعری مجموعے)، ناچ ری گڑیا (بچوں کی نظمیں)، اور سچائیاں (بچوں کی کہانیاں)، ہیں۔ ظفر گورکھپوری کی تصنیف وادی سنگ، ناچ ری گڑیا اور سچائیاں پر اردو اکادمیوں سے انعامات بھی ملے۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً عقل حیران و پریشان، سمراٹ اشوک، ایک تھا کنکر، ایک تھا موتی، دو بھائی۔ نیا انصاف وغیرہ۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جولائی 2017

خورشید عالم

نئی دھلی: معروف صحافی اور کالم نویس خورشید عالم کا سال بھر کی طویل علالت کے بعد 4 اور 5 اگست کی

درمیانی شب دہلی اسٹیٹ کینسر انسٹی ٹیوٹ ہاسپٹل دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ 54 سال کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں والد محمد شہاب الدین، رکن جماعت اسلامی ہند کانپور کے علاوہ ان کی اہلیہ، دو بیٹے، ایک بیٹی اور ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ انھوں نے اپنا صحافتی سفر تقریباً 25 سال قبل شروع کیا تھا۔ ان کی صحافتی تربیت میں ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس مدیر افکار ملی کا رول قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد مختلف اخبارات و رسائل میں فکری و فنی صحافت کو اجاگر کرنے میں خاصی دلچسپی لی۔ انھیں ممتاز صحافیوں کے زیر تربیت کام کرنے کا موقع ملا۔ انھیں اردو کے ساتھ ہندی میں بھی برابر مقبولیت حاصل تھی۔ ہندی میں ان کی صحافت دینک جاگرن سے شروع ہوئی جس میں وہ اسلامی اور مسلم ایشوز پر آبجیکٹو انداز میں لکھنے کے لیے کافی مشہور ہوئے۔ جاگرن کے مالک اور چیف ایڈیٹر نریندر جی کو ان کی تحریر پسند تھی۔ جب تک نریندر جی باحیات رہے، وہ ان سے خصوصی طور پر اسلامی و مسلم مسائل پر لکھواتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دینک جاگرن جیسا اخبار اس زمانے میں مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ہندی اخبارات و جرائد سے منسلک رہے اور خصوصی کالم لکھتے رہے۔

خورشید عالم کے انتقال پر ملال پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے نائب امیر جماعت اسلامی ہند نصرت علی، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر نوید حامد، دلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، آئی او ایس کے چیئرمین اور آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر منظور عالم، عیسائی فادر سولومن اور یونائیٹڈ مسلم مورچہ کے جنرل سکریٹری اور مشاورت کے سکریٹری مولانا عبدالحمید نعمانی نے ان کے انتقال کو ملک و ملت کا خسارہ بتایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اگست 2017

پروفیسر ایم جی شاد

سری نگر: مشہور کشمیری ادیب، شاعر اور تاریخ داں پرفیسر غلام محمد شاد 80 برس کی عمر میں ایک طویل علالت کے بعد 6 اگست اتوار کو انتقال کرگئے۔ جنوبی کشمیر کے بجبہاڑہ قصبہ میں 1939 کو تولد ہوئے۔ غلام محمد نجار جو ادبی حلقوں میں 'شاد' کے نام سے مشہور ہیں، پروفیسر شاد مشہور صحافی مرتضیٰ شبلی کے والد تھے۔ پروفیسر شاد، جنھوں نے آخری سانس شیر کشمیر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز سری نگر میں لی، ادبی حلقوں میں مصنف، شاعر اور اعلیٰ پایہ کے اسکالر رہے ہیں جن کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ پروفیسر شاد انگریزی، اردو، فارسی اور کشمیری زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز میں ترجمہ نگاری کے سیکشن میں بہت عرصہ تک کام کیا۔

پروفیسر شاد نے جنوبی ایشیا کے مایہ ناز شاعر فیض احمد فیض کی شاعری کا ترجمہ کشمیری زبان میں کیا۔ انھوں نے صوفی بزرگ شیخ العالم کے کلام کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ شاد نے گورنمنٹ ڈگری کالج اننت ناگ میں تاریخ پڑھائی جہاں وہ بحیثیت سینئر پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ دریں اثنا ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ منیر الاسلام نے پروفیسر شاد کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ناظم اطلاعات نے انھیں اپنے وقت کے ایک قابل اسکالر کے طور پر یاد کیا، جنھیں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ صفات، شرافت اور سادگی سے نوازا تھا۔ اپنے ایک تعزیتی پیغام میں ناظم اطلاعات نے مرحوم شاد صاحب کی ریاست کے تئیں ادبی خدمات کو یاد کیا ہے۔ پارلیمانی امور کے وزیر عبدالرحمٰن ویری نے بھی کشمیری ادیب، شاعر اور تاریخ داں پروفیسر غلام محمد شاد کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 اگست 2017

اویس احمد دوراں

دربھنگہ: بزرگ شاعر اویس احمد دوراں کا طویل علالت کے بعد 8 اگست کو دربھنگہ کے پارس اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ اویس احمد دوراں 1 فروری 1938 کو دربھنگہ ضلع

کے کوٹھیا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ محلہ فیض اللہ خاں میں سکونت اختیار کی اور للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے، کے۔ ایس۔ کالج دربھنگہ کے شعبۂ اردو سے سبکدوش ہوئے۔

آپ کے دادا خدا بخش جاں مرحوم چاند پور مشرقی یوپی کے باشندہ تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد حسن صاحب کی فرمائش پر خودنوشت سوانح عمری لکھنا شروع کیا جو 'میری کہانی' کے نام سے بہت تاخیر سے شائع ہوئی۔ ان کی چار کتابیں 'ابابیل' (1986)، 'لمحوں کی آواز' (1974)، 'تنقید کی منزل سے' (1989)، 'میری کہانی' (1999)۔ ان کے لائق فرزند پروفیسر جمال اویسی نے 2015 میں 'اویس احمد دوراں: ایک بازدید' کے نام سے ایک کتاب شائع کیا۔ اویس احمد دوراں ایک شریف انسان تھے۔ زندگی کے شروعاتی دور میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک اہم رکن رہے۔ لیکن بعد میں مذہبیت کی طرف مائل ہوئے، صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوگئے۔ ایک ایسا بھی وقت گزرا

جب آپ نے اپنے محلّہ کی مسجد میں اذان دینے کے فرائض بھی انجام دیئے۔

پروفیسر اویس احمد دوراں ایک مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ جنوادی لیکھ سنگھ (جمہوریت پسند مصنّفین) کے صدر رہے۔ انجمن ترقی اردو ضلع شاخ، دربھنگہ کے سکریٹری بھی رہے۔ انھوں نے شاعری کی شروعات 1952 سے کی۔ جبکہ 1956 سے تنقیدی مضامین لکھنے لگے۔ ان کی مشہور نظم 'ایک بے وفا کے نام' بہت مقبول ہوئی جسے ٹی سیریز کے مالک گلشن کمار نے عطاء اللہ خاں کی آواز میں گوایا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر منصور خوشتر، مدیر دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ، 9 اگست 2017

انور ندیم

ممبئی: ملیح آباد کے ایک ممتاز تعلیم یافتہ خاندان کے آفریدی پٹھان، اردو کے منفرد شاعر و ادیب اور ڈرامسٹ (82 سالہ) انور ندیم 9 اگست 2017 کو طویل علالت

کے انتقال کر گئے۔ اسی شام ان کے جسد خاکی کو لکھنؤ کے ایک مقامی قبرستان میں سپردِ لحد کیا گیا۔ انور ندیم ملیح آباد میں 8 نومبر 1935 کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے امیر الدولہ اسلامیہ کالج پھر لکھنؤ یونی ورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ان کی کئی کتابیں اردو اور ہندی میں طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ جن میں جلتے توے کی مسکراہٹ، کرچیں اور محبت کارفرما ہے، یادگار ہیں۔ وہ اپنے حلقے میں نہایت صاحب مطالعہ شخص تھے، کتابیں خرید کر پڑھنے کے وہ قائل ہی نہیں تاعمر اس پر عامل رہے۔ انھیں جو کتابیں ہدیتاً دی جاتی تھیں تو وہ اس کی بھی قیمت ادا کرنے پر اصرار کرتے اور دام دے کر ہی دم لیتے تھے۔ ان کی تحریریں بہت ہی دل کش اور منفرد تشبیہات و استعارات کی حامل ہوتی تھیں۔ ان کی نگارش ہاتھ میں اگر لے لی تو پھر اختتام تک قاری چھوڑتا نہیں تھا۔

روزنامہ 'ممبئی اردو نیوز' ممبئی، 11 اگست 2017

خراج عقیدت:

محمد رفیع کو خراج عقیدت

نئی دھلی: ہندوستانی فلم انڈسٹری نے جہاں بہترین گیت کار، نغمہ نگار اور موسیقاروں کو پروان چڑھایا ہے وہیں ہندوستان فلم انڈسٹری نے آواز کے شہنشاہ محمد رفیع کو بھی جنم دیا اور ان کو پروان چڑھایا۔ محمد رفیع اپنے دور کے ایک عظیم گلوکار تھے جنھوں نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کو آواز کے میدان میں نئی شناخت دلائی اور بالی ووڈ کے پلیٹ فارم پر بننے والی فلموں کو دنیا بھر میں ایک مقام دلایا۔ ان خیالات کا اظہار سرجھنکار کلچر سوسائٹی کی صدر ممتا شریواستو نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ محمد رفیع وہ نام ہے جن کی آواز پر آج بھی لوگ جھومتے ہیں اور ان کے گائے ہوئے گانوں کو سن کر درد و غم اور کیف و مستی کا احساس کرتے ہیں۔ ممتا شریواستو نے کہا کہ ہماری سوسائٹی ہر سال مختلف گلوکاروں، سنگیت کاروں اور موسیقاروں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی یاد میں پروگراموں کا انعقاد کرتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ سرجھنکار کلچر سوسائٹی کی صدر ممتا شریواستو نے موجودہ فلم انڈسٹری پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آج فلم انڈسٹری کا معیار تنزل کا شکار ہے اور جس طریقے سے غزل اور گانوں کے ذریعے ہندوستان کی تہذیب کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اب اس کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 جولائی 2017

کیف بھوپالی کی حیات اور ادبی خدمات

بھوپال: ممتاز شاعر و فلم گیت کار کیف بھوپالی کی برسی کے موقعے پر بھوپال میں سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار میں

مدھیہ پردیش کے دانشوروں نے شرکت کی اور کیف بھوپالی کی حیات و ادبی خدمات کے ساتھ قرآن پاک کے ان کے منظوم ترجمہ مفہوم القرآن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خواجہ محمد ادریس کیف بھوپال کی پیدائش 20 فروری 1917 کو بھوپال میں اور انتقال بھی اسی شہرِ غزل بھوپال میں 25 جولائی 1991 کو ہوا۔ کیف بھوپالی کا سلسلہ نسب ممتاز صوفی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے پیر و مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی سے ملتا ہے۔ کیف کے خاندان کے بزرگ افغانستان کے ہرات سے پہلے کشمیر اس کے بعد لکھنؤ پھر عہد شاہجہانی میں بھوپال آئے اور یہیں کا حصہ ہو کر رہ گئے۔ کیف کو شاعری کا فن وراثت میں ملا ہے۔ کیف کی والدہ صالحہ خانم عاجز بھی ایک اچھی شاعرہ تھیں اور سراج میر خاں سحر سے شرف تلمذ رکھتی تھیں۔ کیف کی تعلیم و ذہنی تربیت بھوپال میں ہوئی۔ کیف نے جس وقت شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت بھوپال میں مقتدر شعرا کی ایک کہکشاں موجود تھی لیکن کیف نے اپنے منفرد لب و لہجہ سے اردو شاعری میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی اور شاعر فطرت کہلائے۔ کیف کی برسی کے موقعے پر بھوپال میں بزم کیف سوسائٹی کے زیر منعقدہ سمینار میں دانشوروں نے ان کی شخصیت کے منفرد پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 28 جولائی 2017

ساجد رشید کی چھٹی برسی پر خراج عقیدت

ممبئی: 13 جولائی کو ساجد رشید (مرحوم) کی چھٹی برسی کے موقعے پر ہفت روزہ 'خبر مشن' ممبئی نے بطور خراج عقیدت

معروف شاعر اور فلمی نغمہ نگار ابراہیم اشک کے زیر صدارت میرا روڈ، ممبئی میں شعری نشست منعقد کی۔ احسان سیوانی اور ہنر رسول پوری مہمانان خصوصی تھے اور نظامت کے فرائض اشتیاق سعید نے انجام دیے۔ ابتدائی کلمات ادا کرتے ہوئے اشتیاق سعید نے کہا کہ ساجد رشید سے میرے تعلقات کی نوعیت عقیدت کی حد تک تھی، اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ ساجد رشید کو کسی نہ کسی بہانے یاد کیا جاتا رہے۔ یہ نشست اسی کی ایک کڑی ہے۔ اس موقعے پر ساجد رشید کے صاحب زادے شاداب رشید بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی خراج عقیدت پیش کیے۔ اس نشست میں احسان سیوانی، ہنر رسولپوری، راشد کانپوری، عارف محمود آبادی، صدیق عمر، مستحسن عزم اور طاہر افق نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ جبکہ نسیم احمد، محمد اکمل، انور مرزا، عبداللہ شیخ نے خصوصی شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 14 جولائی 2017

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

بہارِ گلشن کشمیر (جلد اوّل و دوم)

مرتبہ و مولفہ: پنڈت برج کشن کول و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454و537
قیمت: 275و300 روپے

دیوندر ستیارتھی (مونوگراف)

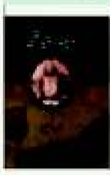

مصنف: عبدالسمیع
صفحات: 162
قیمت: 90 روپے

رشید حسن خاں (مونوگراف)

مصنف: عبدالحمید
صفحات: 122
قیمت: 74 روپے

سید امتیاز علی تاج (مونوگراف)

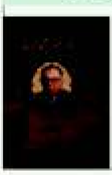

مصنف: محمد شاہد حسین
صفحات: 136
قیمت: 80 روپے

علی سردار جعفری (مونوگراف)

مصنف: عمر رضا
صفحات: 165
قیمت: 90 روپے

یاس یگانہ چنگیزی (مونوگراف)

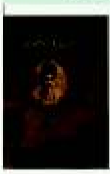

مصنف: حسن مثنیٰ
صفحات: 149
قیمت: 90 روپے

حسن نعیم (مونوگراف)

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 143
قیمت: 85 روپے

آغا حشر کاشمیری (جلد ہشتم)

مرتب: یعقوب یاور
صفحات: 460
قیمت: 215 روپے

فدائے لکھنؤ

مصنف: پروین طلحہ
مترجم: ڈاکٹر صبیحہ انور
صفحات: 182، قیمت: 100 روپے

رینگنے والے جانور

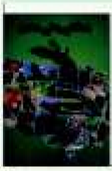

مصنف: قیصر سرمست
صفحات: 84
قیمت: 22 روپے

زمینی آلودگی پر مبنی کہانیاں

مصنف: ادریس صدیقی
صفحات: 40
قیمت: 35 روپے

تتلی تارے پھول

مصنف: عزیز انصاری
صفحات: 32
قیمت: 20 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

تاج المآثر

تالیف: تاج الدین حسن نظامی
ترجمہ: پروفیسر سید احسن الظفر
صفحات: 301
قیمت: 145 روپے

انارکلی

مقدمہ: محمد شاہد حسین
صفحات: 143
قیمت: 90 روپے

باتوں باتوں میں

مصنف: عبدالودود انصاری
صفحات: 79
قیمت: 60 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, September-2017, Vol.19, Issue:09

National Council for Promotion of Urdu Language

Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2017-19

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:**24/08/2017**

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025